جب ایسا ہو

(منتخب افسانے)

سید ظفر ہاشمی

انتخاب و پیشکش

رشید افروز

جب ایسا ہو

(منتخب افسانے)

سیّد ظفر ہاشمی

انتخاب و پیشکش

شید افروز

ناشر

العصر پبلی کیشنز A/5-6 آمین سوسائٹی، باغ نشاط، سرکھیج روڈ، احمد آباد 380055

فون: 26810927 (079)

کے احکامات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہاشمی نے اپنے اداریے میں اس پر بحث کرتے ہوئے مسلم معاشرہ کی اس پریشانی کی طرف توجہ بھی مبذول کی جہاں سرمایہ نہ ہونے کے سبب فلاح عامہ کے کام رکے پڑے ہیں۔ دوسرے یتیم خانے بھی ہیں جہاں یتیموں کی تعداد کے مقابلہ میں ٹرسٹ کی آمدنی بے حد کم ہے۔ اور انہیں ''قلت زر'' کے مسئلہ نے پریشان کیا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ہاشمی نے چند سوالات بھی قائم کئے اور اُن پر گفتگو کے لئے قارئین کو دعوت دی۔

اسی موضوع کو لے کر انہوں نے افسانہ ''رکا ہوا فیصلہ'' کی تخلیق کی۔ اس افسانے میں مسلم یتیم خانہ کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ کا احوال ہے۔ چیرمین اور اراکین کے درمیان مسئلہ کے حل پر بحث جاری ہے۔ ناظم علی وکیل کے مشوروں پر چیرمین حاجی عبدالقادر رنگ والا کی برہمی اور ان کا فیصلہ قاری کو یقیناً حیرت میں ڈال دے گا۔ افسانے کو ایک اور موڑ چپراسی کی اس خبر سے ملتا ہے کہ نالے کے کنارے آباد تمام جھونپڑیاں اچانک آگ لگنے اور تیزی سے آگ پھیلنے کے سبب جل کر راکھ ہو گئیں۔ سیکڑوں لوگ زندہ جل گئے۔ چپراسی یہ خبر بھی دیتا ہے کہ یتیم خانہ میں رہنے والے 'انور' کے ماں باپ بھائی بہن بھی اس حادثہ کا شکار ہو گئے۔ اس پر اراکین تو اپنی حیرانی اور افسوس جتانے میں مصروف ہوتے ہیں مگر چیرمین غصہ سے پوچھتے ہیں کہ جس بچے کے ماں باپ زندہ ہوں وہ یتیم کیسے ہو گیا اور اسے یتیم خانہ میں داخلہ کیسے ملا؟

سپرنٹنڈنٹ احمد علی گھگھیاتے ہوئے صفائی پیش کرتا ہے:۔

''صاحب دراصل اس کے والدین بہت غریب نادار اور بیمار تھے، فاقہ پر فاقہ کر رہے تھے میں نے ترس کھا کر.....

''خاموش!'' حاجی عبدالقادر رنگ والا نے ڈانٹ کر احمد علی سپرنٹنڈنٹ کی بات کاٹ دی اور کڑک کر کہا۔

''آپ اسی وقت ملازمت سے استعفیٰ دے دیدیں ورنہ مجھے نکالنا پڑے گا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ یتیموں کا مال کوئی اور کھائے، یتیموں کا پیسہ کہیں اور خرچ ہو۔ آخر مجھے اللہ کو منہ دکھانا ہے کہ نہیں''

چھوٹا لڑکا رک گیا مگر بڑا لڑکا دوڑتا رہا۔ جمنا داس کے گھر کے جوٹھن کا پیکٹ سب سے اوپر پڑا ہچکولے کھا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ گر پڑے گا۔ اسی پر نظریں گاڑے وہ لڑکا بے تحاشہ دوڑ رہا تھا، گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو اس نے بھی اپنی پوری قوت لگا دی اور برابر پیچھا کرتا رہا۔ گاڑی کی رفتار اور بڑھی، لڑکا اور تیز ہوا، پیکٹ اور تیزی سے ہلنے لگا اور پھر یکا یک کھل گیا اور ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا لڑھک کر سڑک پر آ گرا۔

بالکل اسی کھڑکی کے سامنے جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں۔ لڑکے نے رکنا چاہا لیکن توازن کھو بیٹھا اور منہ کے بل سڑک پر گر گیا۔ چھوٹے لڑکے نے بھی پیکٹ کو کھلتے اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے کو سڑک پر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس ٹکڑے کو اٹھا کر منہ میں ٹھونس لیا، اور جلدی جلدی چبانے لگا۔ جب اچھی طرح نگل چکا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کا ساتھی اب کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تو اس نے مسکرا کر اپنے ساتھی کو دیکھا جو سڑک پر اوندھا پڑا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے وہ آگے بڑھا اور قریب پہنچ کر اسے آواز دی۔

''سالے اُٹھ''

مگر وہ آگے نہ بول سکا، آواز حلق میں پھنس گئی۔ چند لمحے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ساتھی کو دیکھتا رہا پھر بڑی بھیانک چیخ مار کر بے تحاشہ بھاگا اور لابیلا کی پشت میں غائب ہو گیا۔

وہ رپورٹ اگر میں نہ لکھتا تو یہ سب کیوں ہوتا۔

سنا آپ نے؟

(جنوری ۱۹۷۸)

بابلا

نام تو اس کا کچھ اور رہا ہوگا لیکن لوگ اسے بابلا کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ اس بڑی بلڈنگ کے نزدیک دن بھر چکر لگاتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس بلڈنگ میں سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر، ڈاکٹروں کے مطب اور میڈیکل اسٹورس کے علاوہ پراویزن اسٹورس بھی تھے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کا وہاں تانتا بندھا رہتا تھا۔ کوئی سرکاری کام سے آتا، کوئی شاپنگ کے لئے۔ سرکاری دفاتر کے بابو لوگ اور چھوٹے بڑے افسران تو سائکل سے آتے زیادہ سے زیادہ کسی کے پاس اسکوٹر ہوتا۔ لیکن غیر سرکاری دفاتر کے مالکان اور ان کے سکریٹری اور منیجر اپنی اپنی کاروں سے آتے۔ وہاں شاپنگ کے لئے آنے والے لوگوں کے پاس بھی عموماً اپنی گاڑیاں ہوتیں۔

بابلا نے خود کو ان کاروالوں کی خدمت پر لگا رکھا تھا۔ جیسے ہی کوئی گاڑی کمپاؤنڈ میں داخل ہوتی وہ اس کے ساتھ بھاگتا ہوا پارکنگ کار زتک آتا اور کار کی گرد جھاڑنے لگتا۔ لوگ منع کرتے لیکن وہ باز نہ آتا اور اس سے پچیس پچاس پیسے ہتھیا ہی لیتا۔ یہی اس کا روز کا معمول تھا۔ دن بھر میں اسے پانچ سات روپئے مل جاتے اور رات کو جب ساری دوکانیں بند ہو جاتیں تو وہ کسی دوکان کے

چبوترے پر سور ہتا اور صبح پھر ڈیوٹی پر لگ جاتا۔ اس کے ماں باپ بھی تھے اور دوسرے بہن بھائی بھی۔ وہ لوگ قریب ہی ایک جھونپڑے میں رہتے تھے اور اپنی اپنی طرح گزر بسر کرتے تھے۔ کوئی کسی کا پُرسان حال نہ تھا۔ اسی لئے بابلا کو گھر کی فکر ہی نہ تھی اور نہ گھر والوں کو اس کی۔ کبھی کبھار چلا جاتا تو چلا جاتا ورنہ دن رات بڑی بلڈنگ کے گرد منڈلایا کرتا اور کاروں کی گرد جھاڑا کرتا

بڑی بلڈنگ کے سامنے پرانے طرز کا ایک بنگلہ تھا جو اب خستہ اور غیر آباد ہو چکا تھا۔ ایک دِن اس بنگلہ کو مزدور گرانے لگے تو بابلا نے ان سے وجہ پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں ایک ایسا ہوٹل بنے گا جو زمین سے چار سو فٹ کی بلندی پر ہوگا اور اتنا ہی نہیں وہ گھومے گا بھی۔ اس میں بیٹھ کر سارا شہر دیکھا جا سکے گا۔

''اچھا''! بابلا نے بڑی دلچسپی لی۔ ''بڑا مہنگا ہوگا''۔ ایک مزدور بولا'' وہاں صرف امیر ہی جا سکیں گے..... ہم غریبوں کی قسمت میں تو ڈھابے کا ہوٹل ہی لکھا ہے'' اتنا کہہ کر وہ مزدور زور سے ہنس پڑا اور جب وہ اچھی طرح اپنے مقدر کا مذاق اڑا چکا تو بابلا نے اس سے پوچھا۔ کتنے دن میں تیار ہوگا؟۔

''جتنے دن میں تاج محل بنا تھا''۔ ایک بڑے میاں نے مداخلت کی۔ اس پر بابلا ان سے مخاطب ہوا اور پوچھا کہ تاج محل کتنے دنوں میں بنا تھا۔

''تمہاری دو عمریں لگ گئی تھیں بیٹے''۔ بڑے میاں پہیلیوں سے نکل ہی نہیں رہے تھے ان کی بات بابلا کے پلّے نہ پڑی تو وہ بولا۔ ''میں سمجھا نہیں''

لیکن اس سے پہلے کہ بڑے میاں وضاحت کرتے یا مزید پہیلیاں بجھاتے ایک تیسرے مزدور نے، جو نسبتاً ان دونوں مزدوروں سے کم عمر تھا، بابلا کو ڈانٹ دیا۔

''ابے چل ہٹ خالی خولی مغز چاٹ رہا ہے''۔

بنگلہ توڑنے کا کام مہینوں چلتا رہا۔ پرانی وضع کا مکان تھا، محنت و لگن سے بنایا گیا تھا۔ ایمانداری اور نیک نیتی سے معماروں نے اپنا پسینہ بہایا تھا۔ اینٹوں پر ہتھوڑے پڑتے تو چنگاریاں نکلتیں اور آواز دور دور تک فضا میں چیختی پھرتی۔ جب مکان زمین دوز ہو گیا اور ماضی کی عظمت فرش

پر ڈھیر ہوگئی تو مزدوروں اور محنت کشوں نے دور جدید کی نخوت اٹھانی شروع کر دی۔ پہلے پیمائش ہوئی پھر بنیادیں کھودی گئیں اور چند مہینوں میں ایک نئے مکان کا نقشہ زمین کی کوکھ سے نمودار ہو گیا۔ بابلا اس عرصے میں روزانہ وہاں جاتا رہا اور طرح طرح کے سوالات مزدوروں سے پوچھتا رہا۔ وہ بڑے میاں سے زیادہ مانوس ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ اور اس کی تمام باتوں کا اطمینان بخش جواب دیتے تھے۔

وقت گذرتا رہا اور ہوٹل کی عمارت دن بدن بلند ہوتی رہی۔ پھر اس کے بیچوں بیچ ایک ستون ابھرا اور چند مہینوں میں وہ کسی مل کی چمنی کیطرح آسمان چھونے لگا۔ پھر اس ستون کے آخری سرے پر گنبد کی شکل کا ہال تعمیر ہوا۔ اونچے ستون پر بنا یہ ہوٹل دور سے کسی بہت بڑے واٹر ٹینک کی طرح دکھائی دینے لگا۔ اسے دیکھ کر ایسا بھی لگتا تھا جیسے دس منزلہ مکان نے اپنے سر پر کوئی جتاتی چھتری اٹھا رکھی ہو۔ بابلا کی دلچسپی اس عجیب وغریب ہوٹل میں روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور ایک دن اسے اطلاع ملی کہ کل سے ہوٹل کھلنے والا ہے۔

بابلا نے سوچا کہ کل سے یہ گنبد گھومے گا اور لوگ اس کے اندر بیٹھ کر طرح طرح کے کھانوں سے لطف اندوز ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ پورے شہر کا نظارہ بھی کریں گے۔ اسے پتہ چلا تھا کہ ایک گھنٹہ میں یہ گنبد اپنی دھری پر ایک چکر پورا کر لے گا۔ اس نے چند پڑھے لکھے لوگوں کی باتیں بھی چپکے سے سنی تھیں۔ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ ہماری زمین ۲۴ گھنٹے میں اپنی دھری پر ایک چکر مکمل کرتی ہے اور یہ ہوٹل صرف ایک گھنٹہ میں کرے گا یعنی یہ ہوٹل زمین کو ۲۳ گھنٹے پیچھے چھوڑ جائے گا۔

مالک کی شان ہے۔ بابلا نے سوچا یعنی زمین سے چار سو فٹ اوپر لٹکا ہوٹل گھومے گا۔ ہوٹل نہ ہوا لٹو ہو گیا اس میں بیٹھ کر کیسا لگے گا۔ اس نے اپنے دل سے پوچھا مگر اس کے دل کی اڑان بھی اتنی تھی جتنی اس کے چھوٹے دماغ کی۔ بس دھک دھک کہہ کر رہ گیا۔

دوسرے دن پوری بلڈنگ کو سجایا گیا۔ پھر لوگ آنے لگے، بڑے لوگ پیسے والے لوگ، نیتا لوگ، افسر لوگ، اور ان کی چمکیلی، بھڑکیلی، عورتیں۔ بابلا نے اتنی پُرشکوہ محفل اور اتنی گہما گہمی پہلے

نہ دیکھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوٹل کا پارکنگ پارک مختلف سائز، اور ماڈل کی کاروں سے بھر گیا۔ جنہیں دیکھکر بابلا کے دماغ میں سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ اگر ان کاروں کی صفائی پر وہ لگ جائے تو اس کی آمدنی دوگنی ہوسکتی ہے۔ اس تصور سے اسے بڑی مسرت ہوئی اس نے جیب سے بیڑی نکالی اسے جلایا اور مزے میں کش لیتا ہوا پارکنگ پارک کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن اسے یہاں پر پہلا دھچکا لگا۔ ایک گرجدار آواز نے اسے ڈانٹا۔

''چل بھاگ یہاں سے''

اس نے دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی سفید یونی فارم پہنے، ہاتھ میں موٹا ڈنڈا لئے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بابلا کے ہوش اڑ گئے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور ہوٹل کے کمپاؤنڈ سے باہر نکل گیا۔

باہر آکر اس نے غور کرنا شروع کیا۔ اب اس کی سوچ کے دو محور تھے۔ ایک تو یہ کہ اس گنبد میں بیٹھ کر چکر لگانے اور کھانا کھانے میں کیسا مزہ ملے گا اور دوسرا یہ کہ اُن تمام کاروں، جو روزانہ یہاں آیا کریں گی ان کی صفائی پر وہ کس طرح خود کو لگا دے۔

ہوٹل شروع ہوگیا اور لنچ اور ڈنر کے وقت عیش پرست دولت مندوں کا تانتا بندھ گیا۔ اسے بڑی بلڈنگ کے واچ مین نے جب یہ بتایا کہ اس لقو ہوٹل میں ایک وقت کے کھانے کا چارج ۷۵ روپئے ہے تو بابلا آنکھیں جھپکانا بھی بھول گیا۔ ایک وقت کے کھانے کے ۷۵ روپئے۔ اس نے سوچا۔ اتنے روپئے میں تو اس کا سارا خاندان ایک مہینے تک کھاتا ہے اور اس لقو ہوٹل میں ایک آدمی صرف ایک وقت کے کھانے کا ۷۵ روپئے دے دیتا ہے۔ یہ کیسا اندھیر ہے پھر بھلا وہ اس گنبد میں کس طرح جائے گا۔ اس کے پاس ایک ساتھ ۷۵ روپئے نہ کبھی ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے۔

وہ مایوس ہوگیا۔ لیکن اس مایوسی میں کاروں کی گرد امید بن کر اس کے شعور پر ابھری۔ اگر ان کاروں کی صفائی کا کام اسے مل جائے تو ایک دن میں وہ دس روپئے تک بنا سکتا ہے اور اس طرح پانچ روپئے خرچ کرنے کے بعد پانچ روپئے روز آنہ بچا سکتا ہے اور پندرہ دنوں میں ۵

روپئے ہو سکتے ہیں، اور وہ لقو ہوٹل دیکھ سکتا ہے کہ اس کے اندر آخر ہے کیا اور وہ کون سا کھانا ہے جس کی قیمت ۷۵ روپئے ہے۔

مگر اس موٹے تازے سفید یونیفارم والے چوکیدار سے اسے ڈر لگ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے کئی دنوں تک اپنی بلڈنگ کے چوکیدار کو بیڑی پلائی اور چار چھ بار چائے بھی پلائی۔ پھر اس سے اپنے مطلب کی بات کہی۔ جسے سن کر چوکیدار بولا۔ ٹھیک ہے۔ میں پارکنگ پارک کے چوکیدار سے بات کروں گا۔ مگر یہ بولو کہ میرا اس کا بھلا کیسے ہوگا۔ بابلا اب ۱۳ برس کا ہو چکا تھا اس کے علاوہ وہ ایسے ملک اور ماحول میں پل رہا تھا جہاں بچے رشوت کے سہارے پیدا ہوتے ہیں۔ اسپتال میں ماں کے بستر سے لے کر قبر تک جہاں دو نمبر سائڈ بزنس اور اوپری آمدنی کا سکہ بلا روک ٹوک چلتا ہو ۱۳ سال کی عمر سن رسیدہ اور تجربہ کار ہونے کے لئے کافی ہے۔

وہ بات کی تہہ تک فوراً پہنچ گیا۔ بولا

ایک کار کی صفائی کا دس پیسے تمہیں اور دس پیسے اُسے دوں گا۔ "تب سمجھو تمہارا کام بن گیا"۔ چوکیدار نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جمائی جس کی ضرب سے بابلا نے بڑی مسرّت حاصل کی۔

بات سیدھے سادے اور سمجھنے والے انداز میں رکھی گئی تھی۔ اسلئے پارکنگ پارک کے چوکیدار کو کیا مضائقہ ہوتا۔ اس نے اپنا حساب لگایا تو اوسطاً پانچ روپئے روز کے ہو رہے تھے۔ بیٹھے بٹھائے۔ اس نے بابلا کو اجازت دیدی اور اس طرح بابلا ہوٹل کی کاروں کو بھی صاف کرنے لگا۔ صبح گیارہ بجے تک وہ اپنی بلڈنگ کی کاروں کو سنبھالتا اور گیارہ سے ۲ بجے تک ہوٹل کی کاروں کو۔ پھر وہ پانچ بجے تک آفس کی کاروں کی صفائی کرتا اور اس کے بعد رات کے دس بجے تک ہوٹل کی گاڑیوں کو صاف کرتا رہتا۔ اس کی آمدنی بڑھنے لگی اور اب وہ روز کے دس بارہ روپئے کمانے لگا اور پانچ روپئے بچانے لگا۔ اسے دھن تھی کہ کس طرح وہ ۷۵ روپئے اکٹھا کرلے اور ایک بار آسمان کو چھونے والے اور دنیا کی طرح گھومنے والے اس عجیب وغریب ہوٹل کو دیکھ آئے۔

اور ایک دن جب اس نے حسب معمول رات کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر بچائی ہوئی رقم گنی تو اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ ۷۵ روپے پورے ہو گئے تھے اور اب وہ لٹو ہوٹل میں جا سکتا تھا۔ وہاں کھانا کھا سکتا تھا، اور پورے شہر کو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دیکھ سکتا تھا۔ اس رات اسے نیند نہ آئی۔ ہوٹل دیکھنے کی خوشی میں وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح ہوئی تو اپنے جھونپڑے میں گیا۔ نہایا دھویا اور صاف کپڑے پہن کر واپس آ گیا۔ اس دن اس نے اپنی بلڈنگ کے گاہکوں کو نہیں سنبھالا۔ ہوٹل کی کاروں کی بھی صفائی نہیں کی، بس اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور لٹو ہوٹل کو سر اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا جس کی آج وہ تسخیر کرنے والا تھا۔ وہ رات میں وہاں جانا چاہتا تھا تا کہ شہر کی رونق اچھی طرح دیکھ سکے۔ بڑی مشکلوں سے دن کٹا اور جب ندی کی سطح پر دھند کی ردا پھیلنے لگی اور سڑکوں پر لگے بڑے بڑے گیس کے ہنڈولے اور بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے اور شاہراہیں بیدار ہو گئیں تو لٹو ہوٹل کی کھڑکیوں سے بھی چھن چھن کر روشنیاں نکلنے لگیں۔ بابلا دھیرے دھیرے لفٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی جرم کرنے جا رہا ہو۔ بڑی مشکلوں سے اس کے قدم اٹھ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے اسے یہ خیال بھی آیا کہ لوٹ چلے۔ کیوں اپنی گاڑھی کمائی کا خون کر رہا ہے۔ لیکن شوق نے اُکسایا اور تجسس نے حوصلہ افزائی کی اور وہ آگے بڑھتا گیا لیکن جب لفٹ کے پاس پہنچا تو گراؤنڈ بیرے نے اسے روک دیا۔

''کدھر جاتا ہے''۔ اس نے بابلا کے قمیص کی کالر پکڑ لی۔

''اوپر''۔ بابلا نے گھبرا کر کہا۔

''اوپر کدھر؟'' بیرے نے تمسخر سے پوچھا۔

''ہوٹل میں''۔ بابلا نے خود کو بیرے کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

''ابے یہ کوئی ڈھابہ ہے کہ ایرے غیرے نتھو خیرے گھس گئے''۔ بیرے نے اسے آگے پیچھے ہلایا۔

''میں وہاں کھانا کھاؤں گا۔ میرے پاس ۷۵ روپے ہیں''۔

''۷۵/روپئے؟'' بیرے نے حیرت سے پوچھا۔ ''کدھر سے لایا''

''کمایا ہے''

بیرے نے ایک تماچہ بابلا کے منھ پر مارا۔

''سالا کسی کی جیب کاٹی ہے اور بولتا ہے کمایا ہے''۔

''یقین نہ آئے تو واچ مین سے پوچھ لو بابلا گھگھیایا۔ بیرے نے واچ مین کو آواز دی مگر وہ کہیں نظر نہ آیا اس نے جھنجھلا کر ایک دوسرا تماچہ بابلا کے گال پر مارا اور اسے گھسیٹتا ہوا باہر لایا اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بابلا فٹ پاتھ پر کھڑا رہا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور اپنے دکھ درد کو بہا ڈالے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس نے اب بھی امید کا دامن نہ چھوڑا تھا اس گہری مایوسی میں واچ مین روشنی بن کر ابھرا تھا۔ اگر واچ مین گراؤنڈ بیرے کو یقین دلا دے کہ اس نے روپئے کمائے ہیں کسی کی جیب نہیں کاٹی ہے تو اب بھی کام بن سکتا ہے اور وہ لٹو ہوٹل میں جا سکتا ہے آج نہیں تو کل۔

گراؤنڈ بیرا لفٹ کے پاس واپس جا چکا تھا۔

بابلا نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ اسے زمین پر کوئی چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی۔ اس نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ لوہے کی ایک نوکیلی سلاخ تھی۔ اسے انگلیوں میں گھماتا ہوا وہ چپکے سے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا اور چھپتا چھپاتا پارکنگ پارک تک آ گیا۔ وہ واچ مین کی تلاش میں وہاں تک گیا تھا۔ واچ مین وہاں موجود تھا۔ بابلا نے ساری باتیں اسے بتائیں جسے سن کر وہ گھبرا گیا۔

''نہیں یہ نہیں ہو سکتا''۔

''کیوں'' بابلا ٹوٹتا ہوا بولا

''اگر گراؤنڈ بیرے کو یہ معلوم ہو گیا کہ تم پارکنگ پارک کی گاڑیوں کی صفائی کرتے ہو تو وہ ہماری شکایت منیجر سے کر دے گا اور نتیجہ میں تم تو بھگائے ہی جاؤ گے میری نوکری بھی جائے گی۔ نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا'' یہ کہہ کر وہ چلتا بنا۔

بابلا کو دوسرا دھچکا لگا اور اس کا ٹوٹا ہوا وجود بکھرنے لگا۔ وہ اپنی بے بسی اور نامرادی پر رو پڑا اس کی نگاہوں کے سامنے پچھلے کئی مہینے گھوم گئے۔ کتنی محنت سے اس نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر ۷۵/روپئے جمع کئے تھے محض اس لئے کہ وہ ایک دن اس ہوٹل میں جائے گا اور سیٹھوں کی طرح جھروکے سے شہر کو جھانکتا ہوا کھانا کھائے گا۔ لیکن اس کے خواب منتشر ہو گئے اور اس کی محنت و ریاضت مٹی میں مل گئی۔ روپیہ ہوتے ہوئے بھی وہ زمین سے اوپر نہ اٹھ سکا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی نکیلی سلاخ اب بھی موجود تھی جسے وہ غیر شعوری طور پر انگلیوں میں گھما رہا تھا۔ دفعتاً وہ نکیلی سلاخ اس کی انگلی میں چبھ گئی۔ اس کے منھ سے سی کی آواز نکلی اور اس کے ساتھ ایک خیال بجلی کی سرعت سے اس کے ذہن میں کوندا اور اس کے ہونٹوں پر کانٹے دار مسکراہٹ رینگ گئی۔

''حرامی لوگ''

اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ اور بڑی پھرتی سے اپنے کام پر جُٹ گیا۔

لیکن اس بار وہ کاروں کی گرد نہیں صاف کر رہا تھا بلکہ ان کے ٹائروں میں لوہے کی نکیلی سلاخ اپنی پوری قوت سے گھسیڑ رہا تھا۔

(جنوری ۱۹۸۵)

نئے سورج کا نوحہ

عبدل نے گھوڑے کے منھ سے لگام نکالی۔ اس کی گردن کو بڑے پیار سے سہلایا۔ یکّہ کی پشت پر بندھی چارے کی بالٹی کھولی اور اسے گھوڑے کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

''لہر کر طوفان، گاڑی آنے میں ابھی گھنٹہ بھر کی دیر ہے۔ تب تک میں ایک چائے مارلوں''۔

گھوڑے نے خوشی سے گردن ہلائی۔ اس میں بندھی گھنٹیاں بج اٹھیں اور سر پر لگی کلغی جھومنے لگی۔ اس نے اپنی تھوتھنی بالٹی کے اندر ڈال کر جسم ڈھیلا چھوڑا تو اس میں جھرجھری پیدا ہوگئی۔

عبدل نے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپائی اور ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

گھاس پھوس کا بنا ہوٹل اس گاؤں کے اونگھتے اسٹیشن کا واحد ہوٹل تھا جہاں بورنگ نل کے ریتیلے اور مٹ میلے پانی میں خالص دودھ کی چائے بنتی تھی اور مٹی کے کلڑھوں میں بکتی تھی۔ پتہ نہیں اصلی دودھ کا اثر ہوتا یا گاڑھے پانی کا یا پھر مٹی کے کوزے کا کہ چائے بڑی سوندھی ہوتی۔ اور جب دوپہر کی گاڑی دھواں پھینکتی ہوئی مسافروں کو اتارتی تو ہوٹل کا مالک لالہ بنواری لال اپنے آسن سے

اسی وقت امام قاری جان محمد نے کلائی پر بندھی سنہری چین کی گھڑی
پھر دیکھی اور ایک جھٹکے سے یہ کہہ کر اٹھ گئے۔

''مغرب کا وقت ہو گیا۔''

اکابرین کی گفتگو کے ذریعے ہاشمی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایسے اہم مسئلہ میں بھی لوگ کیسے یک رُخے ہو کر ہٹ دھرمی سے اپنا فیصلہ دوسروں پر تھوپ دیتے ہیں۔ 'مغرب کا وقت ہو گیا' اس جملہ پر افسانے کا اختتام کس قدر معنی خیز ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

یہ افسانہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ ہاشمی حقیقت کو افسانوی روپ کتنی چابکدستی سے دے سکتے ہیں۔ صحافت اور ادب کے درمیان فاصلہ کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا بھی علم اس افسانے کو اداریہ کے ساتھ رکھ کر پڑھنے سے ہوتا ہے۔

احمد آباد میں ہاشمی نے اپنی زندگی کے تقریباً ۳۸۔ سال گزارے۔ انہوں نے ہولناک ہندو مسلم فسادات کا بھی سامنا کیا۔ فسادات کے موضوع پر بے لاگ اداریے بھی لکھے اور منفرد افسانے بھی۔ میں نے اپنے انتخاب میں ان کا ایک ایسا افسانہ شامل کیا ہے، جس کا شمار اس موضوع پر لکھے جانے والے اہم اردو افسانوں میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ افسانے کا عنوان ''غٹرغوں'' امن کے پیمبر کبوتر کی علامت ہے۔ یہ افسانہ صرف اسی سبب سے علامتی بنتا ہے مگر ہاشمی نے اس سے بڑا کام لیا ہے۔

''غٹرغوں'' صرف تین صفحات کا مختصر افسانہ ہے مگر عورت کی نفسیات کا ایسا رخ پیش کرتا ہے جس پر شاید کسی اور افسانہ نگار کی نظر تک نہیں گئی۔ فسادات پر لکھے جانے والے وہ افسانے جن میں مرکزی کردار عورت ہے۔ عوتوں پر ناروا ظلم وستم، اس کی عصمت دری یا اغوا کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ ہاشمی نے اپنے افسانے میں ایک قدم آگے بڑھ کر عورت کے انتقام کی بات بیان کی ہے۔

شکیلہ کو ۱۹ برس پہلے فساد میں رام سنگھ اٹھا لاتا ہے اور اپنے گھر میں ڈال لیتا ہے۔ اس کے نام کے چند حروف بدل جاتے ہیں۔ شکیلہ اب شکنتلا بن کر جینے کے لئے مجبور ہے۔ مگر وہ اپنے نئے نام نئی زندگی اور نئے ماحول سے مصالحت نہیں کر سکی۔ اس کے باطن میں شکیلہ زندہ ہے۔ جو انتقام کی

اچھل کر کھڑا ہو جاتا اور بھٹی کو دہکانے لگتا۔ اتنے میں مسافر آنا شروع ہو جاتے اور وہ جلد جلدی چائے بنا کر کلڑھوں میں بھر بھر کر انہیں تھمانے لگتا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ وہاں کافی چہل پہل رہتی۔ پھر لوگ اپنی اپنی منزلوں کا رخ کرتے اور گاؤں کا نیم خوابیدہ اسٹیشن خاموشی کے دبیز پردے میں محوِ خواب ہو جاتا۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے کیبن میں تالا لگا دیتا اور گھر چلا جاتا۔ اسے فکر ہی کیا تھی۔ دوسری گاڑی رات کے آٹھ بجے آتی اور تب تک وہ بے کار ہی رہتا۔ ویسے گاڑی آنے پر بھی وہ کوئی کام نہ کرتا۔ ٹکٹ تو خلاصی دیتا اور ٹکٹ چیک کرنے کی ضرورت یوں نہ تھی کہ کوئی ٹکٹ لے کر چلتا ہی نہ تھا۔ البتہ گاڑی کے وقت اگر سوپیرا اتفاقاً وہاں موجود ہوتا تو وہ مسافروں پر رعب جمانے کے لئے گیٹ پر کھڑا ہو جاتا لیکن سب جانتے تھے کہ وہ جھاڑو والا ہے۔ اس لئے لوگ اسے دھکا دے کر باہر نکل جاتے تھے۔ اسٹیشن سے تقریباً پندرہ کلومیٹر دور خدا بخش گنج کی بازار تھی جہاں ایک کچی سڑک جاتی تھی گاڑی سے اترنے والے مسافر عموماً آس پاس کے گاؤں کے ہوتے جو اس سڑک پر یا کھیتوں سے گزرتی ہوئی پگڈنڈیوں پر چل پڑتے۔ البتہ جنہیں بازار تک جانا ہوتا یا جو بیمار ہوتا یا جو پڑھا لکھا ہوتا وہ عبدل کے یکّہ کا سہارا لیتا اور اوبڑ کھابڑ سڑک کے پل صراط کو اللہ پیر مناتا اور ہزاروں جھٹکے کھاتا بڑی مشکلوں سے پار کرتا۔

بنواری اس وقت اپنے جسم میں سرسوں کے تیل کی مالش کروا رہا تھا۔ بھٹی نیم گرم تھی، ایک پرالمونیم کی کیتلی چڑھی ہوئی تھی اور دوسری پر دودھ پک رہا تھا جس کی سطح پر بالائی کی موٹی تہہ چڑھ گئی تھی کہ سڑکوں کے کنارے پکائے جانے والے دودھ کی بالائی کچھ زیادہ ہی فربہ ہوتی ہے کہ اس میں دودھ کے اجزاء مخفی سے زیادہ گرد و پیش کے اجزائے ترکیبی کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔

عبدل نے بنواری کو اوندھے منہ پڑا دیکھا تو پوچھا۔

''کیا بات ہے لالہ۔ آج گاڑی لیٹ ہے کیا؟''

آواز سن کر پہلے تو بنواری نے اپنے جسم کو کیکڑے کی طرح اچکایا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

''آؤ عبدل:۔ یہاں کوئی چیز لیٹ نہیں ہوتی۔ جو کام جس وقت ہو جائے وہی اس کا ٹائم سمجھو اور پھر گاؤں میں وقت کون دیکھتا ہے۔ بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ صبح ہوئی اور رات آئی۔ باقی حصہ

پسینہ بہانے اور سوجانے میں نکل جاتا ہے اور ایک دن یہ سپاٹ زندگی جس کا کوئی پلاٹ نہیں ہوتا، یکا یک ختم ہوجاتی ہے۔ جیسے چلتے چلتے میری سائکل کی ہوا نکل جائے یا تمہارے گھوڑے کی لگام ٹوٹ جائے۔ چائے پیوگے؟''

بنواری نے اپنا فلسفہ ایک جھٹکے سے ختم کردیا۔ عبدل نے لکڑی کی بنچ کو انگوچھے سے صاف کیا اور بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بناؤ۔ لیکن دودھ ذرا زیادہ ڈالنا۔ چائے ایسی ہو کہ پینے والا ربڑی بھول جائے نہیں تو لسوڑے کی پتی پکا کر پی لینا ہی اچھا ہے کم از کم سردی زکام تو چلا جائے گا''۔

بنواری ہنس پڑا، اس نے جلدی جلدی بھٹی دہکائی اور چائے بنا کر کُلڑھ عبدل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''سنا ہے ہماری یہ سڑک پکی ہونے والی ہے۔''

عبدل کی آنکھوں کے سامنے اپنے شہر کی سڑک گھوم گئی۔ کشادہ چمکتی ہوئی جس پر موٹریں، اسکوٹر، رکشے اور دوسری سواریاں فراٹے بھرتی چلی جاتی ہیں نہ دھچکا نہ ہچکا نہ دھول نہ دھپا۔ اس نے سوچا۔ اگر ویسی سڑک مل جائے تو پھر اپنے طوفان کا کیا کہنا۔ ایسا دوڑے کہ راہ گیر سڑک چھوڑ کر درختوں سے جا لگیں۔ وہ پھیرے پر پھیرے کرنے لگے اور دن بھر میں پچیس تیس روپے تو بچا ہی لے۔ اگر قسمت سے ایسا ہوجائے تو اس کے دلدّر دُھل جائیں۔ بیوی کا علاج ہوجائے۔ بیٹی کی شادی ہوجائے، بیٹا پڑھ لے، بنئے کا قرض ادا ہوجائے، ایک نئی رضائی بنوا ڈالے، یکّہ کی چھتری درست کروا ڈالے۔ اگر یہ سڑک پکّی ہوجائے۔

عبدل کا ہاتھ جلنے لگا تو اس نے چائے کا کلڑھ بنچ پر رکھ دیا اور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''تم نے بڑی اچھی خبر سنائی لالہ۔ کون کہتا تھا؟''

بنواری اپنے آسن پر بیٹھتا ہوا بولا

''کہنے کو سب تیں مار خاں بہت دنوں سے کہہ رہے تھے۔ ایم، پی بھی کہتا تھا۔ ایم، ایل، اے بھی کہتا تھا۔ آلتو فالتو نیتا گنٹر بھی کہتے تھے۔ سب تو سب ایک بار ایک منتری جی بھی آئے تھے

اور کبیر کی بانی بول گئے تھے۔''

بنواری نے کچھ اس طرح منھ بنایا کہ عبدل کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ وہ نیتاؤں کو گالی دینے والا ہے۔ اس لئے جلدی سے اس نے اپنا سوال دہرایا

''لیکن اس بار کس نے بتایا''

بنواری کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ بولا

''میں کل شہر گیا تھا۔ میرا بھتیجا پی، ڈبلو، ڈی میں چپراسی ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ پلان پاس ہو گیا ہے اور کام بہت جلد شروع ہونے والا ہے چونکہ وہ چپراسی ہے اس لئے اس کی بات سچ لگی۔ کلرکوں نے بتایا ہوگا اور تم تو جانتے ہو اس دیش کا مالک کلرک ہے۔ اس کے اوپر تو سب دستخط ٹھکنا رہیں۔''

عبدل کو ہنسی آ گئی۔ تھوڑی دیر وہ بنواری کی باتوں کا مزہ لیتا رہا پھر بولا۔ ''لالہ جی چاہتا ہے تجھے رس گلے کھلاؤں۔ تیری قسم اگر یہ سڑک پکی ہو جائے تو میرے تو دن ہی پھر جائیں۔ گھوڑے پر محنت بھی کم پڑے۔ ابھی تو وہ ایسا ٹوٹتا ہے کہ دو، دو گھنٹے مالش کرتا ہوں پھر بھی آپے میں نہیں آتا۔ میرا بدن خود بھی پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے۔ پکی سڑک کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ گھوڑے کو ایک چابک لگاؤ پھر بیٹھ کر مزے میں بیڑی پیو۔ وقفہ وقفہ سے ہٹو بچو کہتے جاؤ اور دیکھتے دیکھتے بازار دھر لو۔ مسافر بھی خوش گھوڑا بھی خوش اور خود بھی خوش۔

''اور خدا بھی خوش''۔

بنواری نے لقمہ دیا تو عبدل نے کہا۔ ''ٹھیک کہتے ہو لالہ۔ کیونکہ خدا تو عبادت سے خوش ہوتا ہے اور بندہ دلجمعی سے اسی وقت عبادت کرتا ہے جب اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے، تن سلیقے سے ڈھکا ہوتا ہے، بیوی بیمار نہیں ہوتی ہے، اور بیٹے بیٹیاں اپنے ٹھکانوں پر لگ جاتے ہیں۔ بھوک مرے اور دل جلے کس کی عبادت کریں اور کس بات کا شکرانہ ادا کریں''۔

وہ خاموش ہو گیا اس کی نگاہیں چھپر میں لگے مکڑی کے جالے میں الجھ گئیں۔ جس میں ایک مکھی پھنسی ہوئی تھی، اور مکڑی اپنے شکار کو تک رہی تھی۔ اس وقت گاڑی کی سیٹی سنائی دی۔ عبدل

نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور اپنے یکّہ کے پاس آیا۔ گھوڑا چارہ کھا چکا تھا اس نے بالٹی یکّہ کی پشت پر باندھ دی اور گھوڑے کے منہ میں لگام کستے ہوئے بولا۔ طوفان، تیری بھی قسمت جاگنے والی ہے۔ پیارے

تھوڑی دیر میں مسافر آنا شروع ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی عبدل آواز لگانے لگا۔

''خدا بخش گنج بازار ایک روپے''۔ کچھ مسافر اپنی پوٹلیوں، بکسوں اور تھیلوں کے ساتھ یکّہ میں بیٹھ گئے۔ اور جب یکّہ میں جگہ باقی نہ بچی۔ یعنی لوگ چاروں طرف چمگادڑ کی طرح لٹک گئے تو عبدل نے یکّہ ہانک دیا۔

اس دن شام کو گھر لوٹتے وقت عبدل نے بازار سے اپنی بیوی کے لئے گڑ کی جلیبیاں خریدی تھیں۔ اس کی بیوی گڑ کی جلیبیوں پر جان دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جب عبدل بہت خوش ہوتا ہے تو گڑ کی جلیبیاں ضرور لاتا ہے۔ اس نے مٹھائی کا دونا عبدل کے ہاتھ میں دیکھا تو کھانستے ہوئے پوچھا۔

''کیا بات ہے آمنہ کے ابا؟''

عبدل کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ کھونٹی پر لگام ٹانگتے ہوئے بولا۔

''ہماری سڑک پکّی ہونے والی ہے۔ لالہ بتا رہا تھا۔ پکّی سڑک کا مطلب تو تم جانتی ہو نہ''۔

اتنا کہہ کر اس نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں جھانکا مگر انہیں کسی تاثر سے خالی پایا تو کہنے لگا۔

''میں پھیرے پر پھیرے کرلوں گا۔ یہاں تک کہ رات کی گاڑی کے مسافر بھی لے جاسکوں گا۔ پھر ہماری آمدنی بڑھ جائے گی، تمہارا اچھے سے اچھا علاج ہوگا، بچوں کا بھی بھلا ہو جائے گا۔ کچھ سمجھیں؟''

ٹی، بی کے آخری اسٹیج پر پہونچ کر موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا مرگھلی عورت کی سوئی سوئی نیم تاریک آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے وہ چمک پیدا ہوگئی جسے عبدل تلاش کر رہا تھا۔ کرب ناک

حال کی حقیقت خوش آئند مستقبل کے تصوّر سے خلط ملط ہو کر ایک نقطہ پر جم گئی۔ عبدل نے اس ایک روشن نقطہ کو دیکھ لیا اور مٹھائی کا دونا اپنی بیوی کی گود میں ڈال کر اطمینان سے باہر نکل گیا۔

بنواری کی خبر واقعی سچ نکلی۔ چند ہی دنوں میں سرکاری حرکت شروع ہو گئی۔ پہلے پیائش والے آئے، پھر گٹیاں آئیں، کول تار کے ڈرم آئے اور آخر میں روڈ رولرس آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیشن سے بازار تک ایک لمبی چکنی سڑک رینگ گئی۔

جنوری کی پہلی تاریخ تھی، نئے سال کا آغاز تھا۔ اس دن فضا کہر آلود نہ تھی کئی دنوں بعد سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس کی ترچھی کرنیں خنک ہواؤں کے پردوں کو چیر کر دھرتی کے سینے پر بچھی شبنم کو چوس رہی تھیں۔ رات میں اوس نے سڑک کو غسل دے کر اس کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ اس وقت وہ خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ جیسے کسی کے پاؤں کی آہٹ کا انتظار کر رہی ہو۔ اس کا افتتاح ہونے والا تھا۔ آس پاس کے بہت سارے لوگ اکٹھا تھے اور اس گھڑی کے منتظر تھے جب ڈپٹی منسٹر سڑک کے آر پار بندھے سرخ ربن کو کاٹنے والے تھے۔ سب کے چہروں پر مسرّت رقصاں تھی۔ اسی بھیڑ میں عبدل بھی شامل تھا اور خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

وقت مقرّرہ پر ڈپٹی منسٹر کی جیپ دھیرے دھیرے آگے بڑھی انہوں نے کھڑے ہو کر ربن کو قینچی سے کاٹا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور جے جے کار کے نعرے فضا میں گونج اٹھے۔ جیپ سرکتی ہوئی سڑک پر آگے بڑھی مجمع کھسکتا ہوا اس کے پیچھے چلا۔ زندہ باد کی تیز آواز کھیتوں اور کھلیانوں میں دوڑنے لگی اور درختوں میں چھپے ہوئے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑنے لگے۔ جیپ پر کھڑے منسٹر صاحب ہاتھ جوڑے مسکراتے رہے۔ مجمع ناچتا رہا، عبدل اس میں پیش پیش تھا وہ تالی بجاتے ہوئے ایسا بے قابو ہو جاتا کہ اس کا پورا جسم تھرکنے لگتا

چند گز رینگ کر جیپ رک گئی۔ مجمع بھی تھم گیا منسٹر صاحب نے عوام کو مخاطب کیا۔

''یہاں کی جنتا کو نئے سال کا تحفہ دینے میں مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔''

وہ دس منٹ تک بولتے رہے اور پھر جے جے کار کے نعرے سمیٹ کر واپس چلے گئے۔

ایک گھنٹہ بعد سنّاٹا وہاں دوبارہ لوٹ آیا۔

گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ عبدل نے حسب معمول گھوڑے کو چارہ کھلایا خود چائے پی اور گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے مستقبل کا خواب بننے لگا۔ وہ اپنے خیالات کے حسین تانے بانے سے اس وقت نکلا جب سیٹی کی آواز اس کے کان میں پڑی۔ اس نے جلدی جلدی گھوڑے کی لگام کسی اس کی پیٹھ ٹھونکی اور چابک ہاتھ میں لے کر مستعدی سے کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں پھر وہاں چہل پہل ہو گئی۔ مسافر باہر آنا شروع ہو گئے تھے اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور حسب معمول آواز لگائی۔

''خدا بخش گنج ایک روپیہ''

اس بار اس کی آواز میں کچھ زیادہ ہی کھنک تھی اپنے جسم میں وہ بڑی طاقت محسوس کر رہا تھا آج اسے نئی سڑک پر اپنے یکّہ کو دوڑانا تھا اور اب تک کی تلخ یادوں کو گھوڑے کی ٹاپوں سے روند ڈالنا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ مسافر اس کے یکّے کی طرف بڑھتے ایک بس گھڑگھڑاتی ہوئی وہاں آ کر رکی۔ اس میں سے پگڑی باندھے ہٹا کٹا ایک آدمی موچھوں پر تاؤ دیتا ہوا برآمد ہوا اور مسافروں سے مخاطب ہو کر زور سے بولا۔

''چلو۔ خدا بخش گنج صرف پچاس پیسے میں''۔ آواز سن کر سارے مسافر بس کی طرف دوڑے۔ منٹوں میں بس نے سب کو اپنے اندر سمو لیا اور نئی نویلی سڑک پر فرّاٹے بھرتی ہوئی دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

عبدل کے خوابوں کا محل آن واحد میں گر کر چکنا چور ہو گیا۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ اس کا بوڑھا اور ناتواں جسم بیوی کی لاش کو پشت پر لادے گھر سے نکل پڑا ہے لیکن بیٹی چوکھٹ پار کرنے سے قاصر ہے اور بیٹا تاریک کوٹھری میں دیوار کی طرف منھ کئے اوندھا پڑا ہے۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے وجود کو دریافت کیا اور گھوڑے سے لپٹ کر رونے لگا۔

(جنوری ۱۹۸۴)

بھاتال اور پاتال

راوی یوں بیان کرتا ہے کہ

مادرِ گیتی نے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ ایک لال بندر کی طرح اور دوسرا لال چقندر کی طرح مادرِ گیتی نے پرورش و پرداخت کے لیے ایک کو کرۂ ارض کے مشرق میں ڈالا اور دوسرے کو مغرب میں۔

پھر دونوں بیٹے یہ بھول گئے کہ وہ ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ دونوں کم و بیش ایک ہی قسم کی آب و ہوا میں پروان چڑھے اور اپنی سوجھ بوجھ، عقل و فہم ہمت و دانشمندی سے بیحد طاقتور بن گئے۔ مادرِ گیتی نے ان سے پہلے بھی متعدد بیٹوں کو جنم دیا تھا اور ان کے بعد بھی کئی بیٹے عالم وجود میں آئے لیکن جڑواں بیٹوں سے طاقت میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹوں کا ایک گروہ مشرقی بندر کی پناہ میں آ گیا اور دوسرا مغربی چقندر کے سائے میں بیٹھ گیا۔ کچھ بیٹے ایسے بھی تھے جن کا کہنا تھا کہ وہ آزاد ہیں۔ خود مختار ہیں۔ اور کسی گٹ میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ سب کے سب بندر اور چقندر کے دائرۂ استحصال اور حلقہ اقبال میں کسی نہ کسی طرح شامل تھے اور ان کے قارورے سے اپنا قارورہ ملاتے رہتے تھے کہ صحت مندی کے لیے یہ عمل ضروری ہی نہ تھا بلکہ

وجود قائم رکھنے کے لیے لازمی بھی تھا۔

لیکن ایک میان میں دو تلوار نہیں رہتی اور ایک جنگل میں دو شیر بھی نہیں رہ پاتے تو ایک ہی عمل شکل اور دخل کے دو طاقت در کرۂ ارض پر کس طرح رہ پاتے اور اگر رہ جاتے تو یقیناً ان کا نطفہ حلال نہ ہوتا۔ چونکہ وہ ایک ہی ماں کے جڑواں بیٹے تھے اور دونوں کی رگوں میں بہتا سیال ایک ہی چشمے سے پھوٹا تھا۔ اس لئے وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اور دشمن بھی ایسے کہ فریق مقابل کی مکمل تباہی سے کم کے نصب العین پر وہ اکتفا نہ کرنا چاہتے تھے۔ اور چونکہ ہر دو فریق کے ساتھ دوسرے بھائیوں کا بٹوارہ تقریباً نصف نصف تھا اس لئے نصب العین محض فریق مقابل کی تباہی نہ تھا بلکہ آدھے کرۂ ارض کی بربادی تھا اور اس طرح دونوں نے سمجھ بوجھ کر، سوچ بچار کر، غور و فکر کر کے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کی فتح کرۂ ارض کے نصف حصے کو نیست و نابود کرنے ہی میں مضمر تھی۔ یعنی مجموعی طور پر وہ پوری دنیا کو مشترکہ اقدام سے بھون ڈالنا چاہتے تھے۔

لیکن ایسی صورت میں فتح یاب کون ہوگا اور اس فتح کا جشن کون منائے گا؟

یہ سوال تھا تو دونوں کے سامنے لیکن اسے اٹھاتے ہوئے وہ ڈرتے تھے کہ مبادا فریق مقابل اسے ڈرپوک نہ سمجھے یا ان کا گروہ انہیں چہ پدی چہ پدی کا شوربہ نہ سمجھ بیٹھے، ان حالات میں انہیں، بڑبھیا، کون مانے گا۔

اور یہی احساس بڑبھیا، ان دونوں کو ہر وقت تناؤ میں رکھتا تھا اور وہ اپنی جانگھوں کے درمیانی حصے سے زہریلا سفوف گرایا کرتے تھے۔ جن کی مدد سے وہ انار بنانے میں جٹے ہوتے تھے۔ چھچھوندر کی طرح چھو چھو کر کے پھس ہونے والا انار نہیں بلکہ مادر گیتی کے شکم میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھنے والا انار۔ ایسے کتنے ہی انار انہوں نے اپنی خلوت میں جمع کر ڈالے تھے۔

لیکن جب اناروں کی بہتات ہوگئی اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ یقین ہو گیا کہ اب وہ اس لائق ہو گئے ہیں کہ انار اپنی ماں کے شکم میں گھسیڑ سکتے ہیں اور اس کے پرانچے اتنی ہی آسانی سے اڑا سکتے ہیں جتنی آسانی سے وہ چھینک سکتے ہیں تو انہیں اطمینان ہو گیا کہ میان میں صرف انہیں کی تلوار رہے گی۔

مگر مشکل یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے راز سے واقف بھی تھے۔ اس لئے کوئی قدم

اٹھانے سے پہلے جوابی کاروائی کی ڈر سے ان کا معدہ فوراً خراب ہو جایا کرتا تھا۔

آگے راوی یوں بیان کرتا ہے کہ

ان کی دیکھا دیکھی بہت سے چھٹ بھیّوں نے بھی اپنی جانگھوں کے درمیان سے زہریلا سفوف گرانا شروع کر دیا۔ ان میں سے تو کچھ نے انار بھی بناڈالے اور خود مختاری کے خواب تک دیکھنے لگے۔ لیکن ابھی ان کے خواب اس طرح تھے جیسے گھوڑے کے نیچے پڑی لید۔

انہیں چھٹ بھیّوں میں بھاتال اور پاتال بھی تھے۔ یہ دونوں پیدائش کے وقت جڑے ہوئے تھے اور ایک عرصے تک ایک جسم ایک قالب تھے۔ بعد میں آپریشن کے ذریعہ دونوں کو الگ کر دیا گیا تھا۔ جب تک ایک دوسرے میں پیوست تھے ایک تھے، الگ ہوئے تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ دشمن کا دشمن دوست مقولہ پر عمل کرتے ہوئے بھاتال بندر کی گروہ میں شامل ہو گیا اور پاتال چقندر کے حلقۂ رفاقت میں آ گیا۔

اُدھر بندر اور چقندر تھوک میں انار بناتے رہے۔

اِدھر بھاتال اور پاتال خفیہ طور پر اپنی اپنی جانگھوں کے درمیان سے زہریلا سفوف گراتے رہے اور جب ان کی مقدار کافی ہو گئی یعنی وہ دونوں انار بنانے کی پوزیشن میں ہو گئے تو کھسر پھسر کے بعد ہائے ہو کیا اور آخر میں چلانے لگے۔

بھاتال نے کہا پاتال پھلجھڑی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

پاتال نے کہا غلط۔ ہم تو کبوتر کے پروں پر چھڑکنے کے لئے سفوف بنا رہے ہیں۔ تاکہ ان کی پرواز بلند ہو جائے البتہ تم نے بہت پہلے ہی اپنی آواز سے صحرا کا حمل ساقط کر دیا تھا۔ وہ آواز ہماری سماعت پر گراں گزری تھی۔

لیکن وہ تو پیغامِ امن و آشتی تھا کہیں بھی پہونچے۔ بھاتال نے صفائی پیش کی۔

''بجا فرمایا''۔ پاتال نے مسکرا کر کہا۔ وہ پیغام یہاں بھی پہنچا تھا اسی لئے تو ہم امن کے پیغامبر کبوتر کے پروں پر چھڑکنے کے لیے چمکدار سفوف بنا رہے ہیں۔ ہم اس محبت کا جواب محبت سے ہی تو دے رہے ہیں۔

بھاتال نے دل میں سوچا کہ پاتال کی جانگھیں ایک مٹھی سفوف گراتے گراتے اینٹھ

جائیں گی کمبخت کی پتلی پتلی ٹانگوں میں دم ہی کتنا ہے۔ ہماری ٹانگیں اس سے کئی گنا تگڑی ہیں اور ہم سفوف بھی تیزی سے گرا رہے ہیں۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان ہوا ہی تھا کہ پاتال ایک چال چل گیا۔ اس نے بھاتال سے کہاں کیوں نہ ہم اپنی ٹانگیں پھیلا کر ایک دوسرے کو دکھائیں کہ ان کے درمیان سے کتنا سفوف خارج ہو رہا ہے اور آیا وہ سفوف کبوتر کے پروں پر لگانے والا ہے یا انار میں استعمال ہونے والا ہے۔

یہ سن کر بھاتال بولا۔ ہَت تری کی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے روبرو ننگے ہو جائیں۔ بے ہودہ خیال۔

تو پھر؟

دونوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا لیکن جواب بھی سوال کی طرح ایک جیسا ہی تھا جو دونوں کو معلوم تھا۔ اس لئے دونوں نے خاموشی اختیار کر لی اور خلوت میں سفوف گراتے رہے۔ پھر یوں ہوا کہ لال بندر اور لال چقندر کی خلوتوں میں انار ہی انار ہو گئے۔ اور ان کی جانگھوں کے منڈوے تلے سفوف ہی سفوف تو انہوں نے سوچا کہ اب بس کرنا چاہئے۔ کیونکہ کافی ہے، یعنی کافی ہی نہیں بہت کافی ہے۔ مادر گیتی کے شکم میں گھس کر کوکھ کو پھاڑ ڈالنے کے لئے تو دو چار انار ہی کافی تھے، اس کے علاوہ انہیں یہ فکر لاحق ہو گئی کہ چھٹ بھیّے بھی سفوف گرانے لگے ہیں اور کئی ایک نے تو انار بھی بنا ڈالے ہیں۔ ان میں دو چار نے تو ایسے انار بھی بنا ڈالے ہیں کہ وہ اپنے طور پر ہی مادر گیتی کے پرانچے اڑا سکتے ہیں۔

کوئی بڑ بھیّوں کی اجارہ داری نہیں رہ گئی تھی۔ ایسی صورت میں بڑ بھیّوں کے سارے انار بے کار ہو رہے تھے۔

یہ صرف مسئلہ ہی نہیں بڑا مسئلہ تھا۔

انہوں نے سوچا کہ چھٹ بھیّوں کو کسی طرح انار بنانے سے روکنا چاہئے کہ یہ حق صرف ان دونوں کو تھا۔ دونوں نے سر سے سر کو جوڑا۔ خوب غور و خوض کیا اور طے کیا کہ وہ اب مزید سفوف گرانا اور انار بنانا بند کر دیں۔ اس طرح ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دوسرے چھٹ بھیّے بھی ایسا کریں گے اور ان کا بڑ پن قائم رہے گا۔ اس فیصلہ کو انہوں نے ایک معاہدہ کی شکل دے دی

آگ میں اب تک جھلس رہی ہے۔ ۱۹ر سال بعد پھر فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ مسلمان بلوائی رام سنگھ کی غیر موجودگی میں ہلّہ بولتے ہیں اور دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہو جاتے ہیں اور شکنتلا کی بیٹی آشا سہم کر ماں سے مدد مانگتی ہے۔ کچھ اسی طرح جیسے ۱۹ر سال پہلے شکیلہ نے اپنی ماں سے مدد چاہی تھی اور ماں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر خدا سے مدد چاہی تھی مگر اپنی بچی کو بچانے میں ناکام رہی تھی۔ شکنتلا کو اپنی بے عزتی کا وہ منظر یاد آجاتا ہے جب اسے بلوائیوں نے ماں سے چھین لیا تھا اور پھر رام سنگھ نے اسے شکنتلا بنا دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ وقت آگیا تھا۔ وہ خود آگے بڑھ کر آشا کو بلوائیوں کی طرف یہ کہتے ہوئے دھکیل دیتی ہے۔

''میں نے ۱۹ر سال تک انتظار کیا۔ اب لے جاؤ عائشہ کو''

بلوائیوں میں سے ایک جوان حنیف نے لپک کر آشا کو اپنے کندھے پر لاد لیا اور پھرتی سے باہر نکل گیا، اسی کے ساتھ دوسرے بلوائی بھی بھاگ گئے تو شکنتلا کو دفعتاً احساس ہوا کہ منڈیر پر بیٹھا ہوا کبوتر اس کے سینے میں اتر آیا ہے اور وہاں گردن پھلا پھلا کر غٹرغوں غٹرغوں کرنے لگا ہے۔

افسانے کا اختتام پھر ایک بار قاری کو ۱۹ر برس پیچھے لے جاتا ہے۔ اس وقت بھی منڈیر پر افسردہ اور خاموش کبوتر گردن جھکائے نظر آتا ہے۔ اِس بار بھی وہ خاموش رہتا ہے مگر جب ماں اپنی بیٹی کو فسادیوں کے حوالے کر دیتی ہے تو کبوتر ''غٹرغوں'' کرنے لگتا ہے۔ انتقام کے بعد خوشی کا یہ احساس دراصل شکیلہ کی خوشی کا علامتی اظہار ہے۔ شکیلہ جسے شکنتلا بنا دیا گیا تھا مگر جو شکنتلا نہ بن سکی تھی۔

ایک مظلوم عورت کے یہ دو روپ افسانے میں ایک واقعہ اور ناموں کے استعمال سے جس خوبی سے ابھرے ہیں اسے ہاشمی کی فنکاری ہی کہہ سکتے ہیں۔ ہاشمی کی یہ کہانی بیدی کی لاجونتی سے آگے نکل گئی ہے۔

احمد آباد نے ہاشمی کو اور بھی افسانے دیئے۔ 'تلافی' ایک جیب کترے اور اس کے پیشہ ورانہ بری حرکتوں کی کہانی ہے۔ ایک سانحہ اس کی زندگی کی راہ تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی بُری حرکت کے سبب ایک مفلس بوڑھا شخص اپنی جان کھو دیتا ہے۔ جیب کترا اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے

اوراس کے بعد سفوف گرانا بند کر دیا۔

شعاعِ مہر کی طرح خبر کرۂ ارض پر پھیل گئی۔

بھاتال نے سنا تو بغلیں بجاتے ہوئے بولا۔

جانتے ہو میں نے ہی بندر کو اس بات پر راضی کیا تھا کہ وہ چقندر سے ایک معاہدہ کرے اور انار بنانا بند کر دے۔

پاتال اپنے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

لیکن تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے بھی چقندر کو اس معاہدہ کے لئے راضی کیا تھا۔

پھر؟

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مسکرائے۔ بھاتال بولا۔

''ٹھیک ہی ہوا۔ شاید کرۂ ارض پر امن بحال ہو جائے''۔

''بجا فرمایا آپ نے۔ بہت ممکن ہے کہ اس عمل سے مادر گیتی کو چین نصیب ہو یا کم از کم اس کا درد ہی کم ہو''۔ پاتال نے امید ظاہر کی۔

پھر؟

دونوں نے ایک دوسرے کو دوبارہ دیکھا دوبارہ مسکرائے بھی اور اپنی اپنی جھولی سے ایک ایک انار نکال کر ایک دوسرے کو اس طرح دکھایا جیسے ٹھینگا دکھا رہے ہوں۔ اس عمل کے بعد دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

''چھوڑو بڑھیوں کو اور چھوڑو کرۂ ارض کے دوسرے حصّوں کو۔ وہاں امن قائم ہو رہا ہے تو ہونے دو۔ آؤ ہم دونوں اپنے آپ کو تباہ کرنے کا عمل جاری رکھیں۔ ہمارے پاس اتنے انار تو ہونے ہی چاہئیں کہ ایک دوسرے کو نیست و نابود کر سکیں''۔

اتنا کہہ کر دونوں مخالف سمتوں میں بیٹھ کر زہریلا سفوف گرانے لگے۔

(ستمبر ۱۹۸۸)

دھماکہ

کندھے پہ انگوچھا، جو کبھی لال رنگ کا ہوگا مگر اب گرد و غبار، پسینہ اور آنسو جذب کرتے کرتے مٹیالا ہو گیا تھا، رکھے میلی سی قمیص اور دھوتی جو کبھی سفید رہی ہوگی مگر اب بھورے رنگ کی ہوگئی تھیں، پہنے بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے جگو کھڑا تھا۔ وہ اور اس کی طرح کے درجنوں مزدور منڈولہ چوراہے پر صبح سویرے آجاتے اور خدا کے ان بندوں کا انتظار کرتے جو انہیں ٹھوک بجا کر لے جاتے اور ہر مزدور کو ان کی جسمانی طاقت، ہنر اور مجبوری سے اپنی اپنی اوقات بھر فائدہ اٹھا کر شام کو چند سکے ان کے ہاتھوں میں تھما دیتے۔ ان میں سے چند ہی خوش قسمت ہوتے جنہیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑتا۔ ورنہ زیادہ تر تو گھنٹوں بیٹھے رہتے، تب جا کر کوئی سیٹھ، کوئی دلال، کوئی ٹھیکیدار آتا اور انہیں ہانک کر لے جاتا۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ دبلا پتلا اور مریل جسم کا مزدور دن بھر بیٹھا رہتا مگر کوئی نہ پوچھتا اور جب سورج ٹاور کے پشت میں چھپ جاتا اور اس کا لمبا سایہ اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا تو وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا اپنی کھولی پر لوٹ آتا۔

اس دن جگو بڑے سویرے آ گیا تھا۔ پچھلے دن اسے کوئی مزدوری نہیں ملی تھی وہ شام تک آس لگائے بیٹھا رہا تھا لیکن کچھ نہ بنا تھا۔ اس کے جسم پر کھائے پیئے سیٹھ ساہوکاروں کی نظر پڑتی تو وہ

خوف سے کانپنے لگتا۔ پھر جب ان کی موٹی موٹی چمکتی آنکھیں دوسرے جسم کو ٹٹولنے لگتیں تو اس کا جسم ساکت ہو جاتا۔ انہی کیفیات میں کئی گھنٹہ نکل گئے۔ اور جب سورج حسب معمول آدھی سے زیادہ مسافت طے کر کے ٹاور کے پشت میں چھپا تو وہ مایوس ہو کر چلا آیا۔ اُس دن وہ بڑے سویرے جاگ اٹھا تھا۔ کھولی کے دوسرے لوگ ابھی خراٹے لے رہے تھے کہ وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ ریلوے برج کے قدموں میں جھونپڑیوں کی لمبی قطار تھی انہی میں رام دیال مستری کی ایک دس بائی دس کی کھولی تھی۔ جس کا کرایہ یوں تو دس روپیہ تھا مگر چونکہ اس نے ازراہ ہمدردی اپنے دیس کے دس لوگوں کو پناہ دے رکھی تھی، اس لئے ہر ایک سے دس روپیہ اصول کرتا تھا۔ جگو اسی کھولی میں رہتا تھا۔ ابھی اندھیرا تھا، جھونپڑیوں کے بیشتر لوگ سوئے ہوئے تھے اس لئے محض پانچ منٹ کے انتظار سے سنڈاس اور نل خالی مل گئے تھے اور وہ جلدی جلدی فارغ ہو گیا تھا، اور اپنے اڈّے پر آ کھڑا ہوا تھا۔

جس وقت وہ آیا تھا چوراہا تقریباً خالی تھا مگر آدھ گھنٹہ کے اندر وہاں مزدوروں کی بھیڑ اکٹھا ہو گئی۔ کسی کے ہاتھ میں پھاوڑا اور ٹوکری تھی، کسی کے ہاتھ میں آری اور بسلہ، کسی کے ہاتھ میں برش اور چونے کی بالٹی تھی، تو کسی کے ہاتھ میں کنّی اور تسلہ۔ غرض کہ اپنے اپنے پیشہ اور ہنر کے لحاظ سے لوگ سامان لئے ہوئے تھے مگر بہتیرے ایسے بھی تھے جو اس کی طرح خالی ہاتھ تھے۔ صرف دو ہاتھ لئے چلے آئے تھے۔ اس نے سوچا آخر خالی ہاتھوں سے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہئے، کوئی اوزار ہو، کوئی سامان ہو، کوئی سرٹیفکٹ ہو، کوئی ڈگری ہو۔ اور اگر یہ سب نہ ہو تو لاٹھی ہی ہو۔ ڈنڈا ہی ہو، بلّم تلوار یا چاقو ہی ہو، کوئی چیز تو ہو، ہاتھ خالی نہ ہوں۔ نامعقول لوگ، بھلا خالی ہاتھوں سے کچھ ملتا ہے، کبھی کچھ ملا ہے

''دھماکہ''

اخبار کے ہاکر کی تیز آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک پڑا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پاس کھڑے مزدور سے پوچھا۔

''سیٹھ بولتا ہے دو روپیہ مزدوری ہوگی۔ کام آٹھ گھنٹہ کا۔ میں بولا پھوٹو''

''میں پوچھتا ہوں یہ دھماکہ کیسا ہوا اور تو سیٹھ کی ہانک رہا ہے''

''کیا خبر'' کہہ کر وہ مزدور بیڑی سلگانے لگا۔ جگو سوچنے لگا کیسا دھماکہ ہوا، بم تو نہیں گرا، لڑائی تو نہیں چھڑ گئی، چین یا پاکستان نے حملہ تو نہیں کر دیا، بڑا غضب ہو جائے گا اگر ایسا ہو گیا ہو گا، کام ملنا اور مشکل ہو جائے گا، مہنگائی بڑھ جائے گی، اناج تیل، کپڑا سب مہنگا ہو جائے گا پھر وہ اپنا پیٹ کس طرح پالے گا، ہزار میل دور گاؤں میں اپنے بچّوں کیلئے جو روپیہ جوڑ بٹور کر ہر ماہ بھیجتا ہے وہ کس طرح بھیجے گا، بیمار بیوی کا علاج کس طرح کرائے گا، دوائیوں کی قیمت تو کئی گنا بڑھ جائے گی۔ بھگوان کرے لڑائی نہ چھڑی ہو۔

اس نے گھبرا کر دوسرے مزدور سے پوچھا۔

یہ لڑکا کس دھماکہ کی بات کر رہا تھا۔

''کون لڑکا؟'' اس مزدور نے پوچھا

''ارے ابھی ابھی اخبار بیچتا ہوا گیا ہے۔ نہ''۔

''اخبار''؟

''ہاں بھائی اخبار''

وہ مزدور زور سے ہنس پڑا ''اخبار؟ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل ابے یہاں ٹھیکیدار پر نظر رہتی ہے۔ کان مزدوری کے ریٹ پر اور تو اخبار کی چاٹتا ہے۔ اخبار کے لئے پیسہ بھی ہے گانٹھ میں''۔

جگو سٹپٹا گیا، اور سوچنے لگا پچھلی جنگ میں کئی کئی دن اسے فاقہ کرنا پڑا تھا۔ بیوی روپیہ کیلئے بیرنگ خط لکھتی رہتی تھی، کبھی اپنی بیماری کا رونا، کبھی بچّوں کے پیٹ اور تن کا، کبھی گھر کی خستگی اور بنیے کے سود کا، مگر وہ چپ سادھے رہتا، جواب بھی کیا دیتا، روپیہ نہیں تھا تو جواب کیا دیتا، الفاظ کتنے اچھے لکھو، تراش تراش کر، نوک پلک سنوار کر، رومان میں گھول کر، چاہے روشنائی سے لکھو، چاہے خون سے مگر جب تک یہ نہ لکھو کہ ''روپیہ روانہ ہے'' سب بیکار ہے، بکواس ہے بے معنی ہے، اس کے پاس روپیہ تھا ہی نہیں تو خط کیا لکھتا۔ بہت دنوں تک خاموش رہا تھا۔ اور جب دن رات کی سخت محنت اور مشقت کے بعد وہ کچھ روپیہ جمع کر سکا تھا تو اس کا منی آرڈر کرایا تھا۔ پھر خط لکھا تھا۔ اسے کتنا بھلا لگا تھا جب ڈاکخانہ کے منشی نے لکھا تھا کہ ''روپیہ روانہ کر دیا گیا ہے'' اس نے کئی بار منشی سے

خط پڑھوایا تھا اور جب اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ روپیہ روانہ کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے تو اس نے بڑی خوشی محسوس کی تھی ۔ یہ حالت تھی ان دنوں اب اگر پھر جنگ.....اس کی سوچ کا سلسلہ پھر اخبار کے ہاکر نے منقطع کر دیا۔ جو چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہا تھا۔

''ایٹمی دھماکہ۔ یکسپلوزن۔ دنیا ہل گئی، آج کی تازہ خبر'' جگّو کے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی، اس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی، سڑک کے اُس طرف ایک بابو اخبار پڑھ رہے تھے وہ ان کے پاس گیا اور ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا۔

''صاحب کیسی خبر ہے۔ کیا لڑائی شروع ہو گئی ہے''۔ بابو نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وہ پان کھائے ہوئے تھے، اس لئے بول نہ سکے ہاتھ کے اشارے سے اسے ہٹ جانے کو کہا۔ جگّو نے وہاں سے کھسک جانے ہی میں نجات جانی، واپس آ کر بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑا ہی ہوا تھا کہ اس کا پڑوسی اللہ رکھا، ہانپتا کانپتا آیا۔

''تیری عورت کا تار آیا ہے''۔

''تار؟ کیوں'' کب، کیا ہے؟

''لکھا ہے حالت اچھی نہیں ہے''

جگّو سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اللہ رکھا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا، بولا ''ہمت رکھ جگّو، اللہ بہتر کرے گا۔ تُو ایسا کر کہیں سے کرایے بھاڑے کا انتظام کر لے اور گھر چلا جا''۔

جگّو تھوڑی دیر یونہی سر پکڑے بیٹھا رہا۔ پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے بڑی مشکل سے اٹھا، انگوچھے سے آنکھیں صاف کیں اور دھیرے دھیرے چلنے لگا، اللہ رکھا بھی ساتھ ہو لیا۔ وہ ابھی کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ اخبار والا لڑکا چلاتا ہوا پھر گزرا۔

جگّو نے اللہ رکھا سے پوچھا۔ ''یہ کیسا دھماکہ ہوا ہے اللہ رکھے''

''بم کا تجربہ ہوا ہے۔'' اللہ رکھا نے بتایا۔

''یہ کیا ہوتا ہے''۔

''لوگ کہتے ہیں کہ ایٹمی طاقتوں سے ملک کی ترقی اور تیز ہو گی۔ پہاڑ توڑے جائیں گے،

زمین پھاڑی جائے گی، ندیوں کا رخ بدلا جائے گا''۔

''لیکن فائدہ کیا ہوگا؟''

''پتہ نہیں۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا ملک طاقت میں چھٹے نمبر پر آ گیا۔ اب ہم پچھڑے ہوئے نہیں کہلائیں گے۔ کچھ لوگ بہت خوش ہیں یونین والا رحمت علی کہہ رہا تھا کہ ہم ..... کہ ہم ..... کون سا پاور ہو گئے ہیں انگریزی میں کچھ اچھا ہی نام بتایا تھا، اب ہم پر کوئی ملک حملہ نہیں کرے گا سب کی نانی مرے گی''۔

جگّو کے مرجھائے ہوئے ہونٹ پر پھیکی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ''چلو اچھا ہوا، یہ روز روز کی کھٹ کھٹ۔ اِس جنگ کا خطرہ اُس جنگ کا خطرہ ختم ہوا۔ مگر اللہ رکھے تم تو کہہ رہے تھے کہ بم کا استعمال ترقی کے لئے کیا جائے گا۔ یہ حملہ وملہ کی بات کہاں سے نکل پڑی مجھے جنگ سے بہت ڈر لگتا ہے''۔

''ڈرنے کی بات ہی ہے، لڑائی کوئی اچھی چیز تو نہیں مگر وہ رحمت علی دونوں باتیں ایک ساتھ بتا رہا تھا۔ یہ لوگ سب گڈمڈ کر جاتے ہیں۔ اور نہ کریں تو لیڈری کیسے چلے۔ صاف صاف بات کریں تو جنتا سمجھ نہ جائے اور اگر لیڈر کی بات جنتا کی سمجھ میں آ گئی تو سمجھو اس کی دوکان بند۔ وہ تب لیڈر نہ ہوا، پھسڈی ہوا، مگر ایک بات ہے جگّو ملک کچھ ترقی ورقی کر گیا ہے شاید''۔

''بڑا اچھا ہوا ملک ترقی کر گیا''۔ جگّو کے منہ سے ایسی آواز نکلی جیسے غار سے آئی ہو۔ اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا دونوں خاموشی سے چلتے رہے آگے چل کر صرافہ بازار آ گیا، سڑک کے دونوں طرف سونے چاندی کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں۔ چھتوں سے لٹکے فانوس سے نکلتی رنگ برنگی روشنیاں جھاڑ سے ٹکرا کر شوکیسوں پر قوس وقزح بکھیر رہی تھیں۔ موٹے موٹے سیٹھ دانت نکالے گاہکوں کے سامنے بے شمار زیورات بکھیر رہے تھے۔ وہ دونوں نظریں چرائے چلتے رہے کہ کہیں دوکان دیکھنے کے جرم میں انہیں گرفتار نہ کر لیا جائے۔ پھر جب اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی ۱۱ منزلہ بلڈنگ آئی تو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے جگّو کو ایسی ٹھنڈک کا احساس ہوا جو فلو کے مریض کو محسوس ہوتی ہے۔ اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہو گئی، اس نے دھیرے سے اپنے ساتھی کو پکارا۔

''اللہ رکھے''

''کیا ہے''

''میں کس طرح گھر جاؤں، میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ تو ہی کچھ انتظام کر دے''۔

اللہ رکھا نے گہری سانس لی۔ بولا۔

''کاش کہ میں اس لائق ہوتا۔ دو چار روپیہ کی بات ہوتی تو اِدھر اُدھر سے کر دیا جاتا مگر بات دو سو روپیہ سے کم میں نہ بنے گی اور اگر اتنے روپے میرے پاس ہوتے تو.....''

وہ یکا یک چپ ہو گیا۔ گرلس کالج کے گیٹ میں ہنسی قہقہہ لگاتی لڑکیاں داخل ہو رہی تھیں۔ وہ کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ ایک ٹک بغیر آنکھیں جھپکائے دیوانوں کی طرح۔

اُسے اس طرح بے خود پا کر جگّو نے اس کا ہاتھ کھینچا..... ''اللہ رکھے''

''ہوں'' اللہ رکھا چونک پڑا۔ ''اگر میرے پاس اتنا روپیہ ہوتا تو سلمٰی کی سگائی ہی کیوں ٹوٹتی، میری بیٹی ابھی تک کیوں بیٹھی رہتی۔ میں نے رام دیال مستری سے پانچ سو روپے ادھار مانگا تو اس کمبخت نے کہا پانچ سو کیا ہزار دوں گا، اور واپس بھی نہ لوں گا اگر.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی، اس کا دل بھر آیا اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ جگو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بھائی اللہ رکھے، ہماری حالت کب سدھرے گی، آخر کب تک ہم اپنے بیوی بچّوں کی جان و عزّت کا خطرہ محسوس کرتے رہیں گے، آخر کب تک؟''

مگر اللہ رکھا کیا جواب دیتا، یہی سوال تو اس کے دماغ میں بھی، ٹھوکریں مار رہا تھا۔ وہ شانے سے لٹکے تولئے سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔

اِتنے میں وہی اخبار والا لڑکا اُدھر سے پھر گزرا، آج کی تازہ خبر ہندوستان میں ایٹمی دھماکہ، جگّو کے کان میں گھنٹیاں بجنے لگیں، دماغ میں گھڑ گھڑاہٹ ہوئی اور سر چکرانے لگا، اس نے لڑکے کو آواز دی۔ لڑکا اخبار لئے لپک کر اس کے پاس آیا تو جگّو نے اسکے منھ پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔

''یہ بھی کوئی تازہ خبر ہے سالے۔ ہمارے دماغ میں تو ہر دم دھماکہ ہوا کرتا ہے''۔

(اگست ۱۹۷۸)

وزیر جنگلات

شمالی ہند میں ترائی کے علاقے سے وزیر جنگلات کا قافلہ گزر رہا تھا۔ سب سے آگے پولیس کی پائلٹ کار تھی۔ جسے ڈی. ایس. پی. امجد خان خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ اس کے پیچھے وزیر موصوف کی بلٹ پُروف سیاہ مرسڈیز تھی اور آخر میں پولیس کی ویگن جس میں تقریباً دو درجن سپاہی ہاتھوں میں بندوقیں لئے مستعد بیٹھے تھے۔ وزیر صاحب ایک گاؤں کے سرپنچ کے مجسمے کی نقاب کشائی کے لئے جا رہے تھے۔ پائلٹ کار جب جنگل کی حد میں داخل ہوئی تو خان کو ڈاکو رام لکھن سنگھ یاد آ گیا۔ رام لکھن سنگھ ڈاکو تو ڈی۔ ایس۔ پی۔ خان کے اعصاب پر اسی وقت سوار ہو گیا تھا جب وہ اس علاقے میں نیا نیا آیا تھا۔ تھانے کے عملے نے اسے پہلے ہی دن بتا دیا تھا کہ یہاں رام لکھن سنگھ ڈاکو کی حکومت ہے آج تک کوئی ایس۔ پی اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کسی ڈی. ایس. پی. یا تھانے دار کی کیا مجال کہ وہ رام لکھن سے ٹکر لے سکے۔ ویسے ان لوگوں کو ٹکر لینے کی ضرورت بھی کیا تھی رام لکھن سنگھ ان لوگوں کی جھولیاں تو ایسی بھرتا تھا کہ نوٹوں کی سرسراہٹ انہیں ہر وقت گدگدایا کرتی تھی اور بندوقوں پر سے ان کی انگلیاں پھسل پھسل جایا کرتی تھیں۔ خان نے اپنے ماتحتوں کی باتیں سنیں۔ ایس. پی. نے اشارتاً کنائتاً ظاہر کیا کی فرض شناسی کا مظاہرہ اپنے سے کمتر اور کمزور لوگوں کو

کچلنے میں کرنا ہی دانشمندی ہے۔عوام روٹی، کپڑا، مکان، اور انصاف کے لئے اگر ہنگامہ کریں تو ان پر گولی چلانا فرض کی ادائیگی کے زمرے میں آتا ہے اور ڈاکولٹیرے، لوٹ مار، قتل وغارت گری کریں تو ان پر گولی چلانا بھی فرض میں شامل ہے لیکن عوام میں گولی چلانے سے فرض کی ادائیگی بے خطر ہوتی ہے اور بدمعاشوں سے ٹکرانا بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ایسی صورت میں عوام پر گولی چلاؤ اور روزی حلال کرو اور ضمیر نام کی کوئی چیز اب بھی تمہارے پاس اگر ہے تو اسے یوں مطمئن کر ڈالو۔

خان نے سب کی باتیں سنیں۔لیکن فرض کی ادائیگی میں کمزور اور طاقت ور میں تمیز کرنا اس کے ایمان میں شامل نہ تھا۔اس کے خیال میں ٹکر تو اسی کو کہتے ہیں جو اپنے سے زیادہ طاقتور سے لی جائے۔کمزور ناتواں، اور نہتے پر گولی چلانا منصبی فرائض میں شامل تو ہوسکتا ہے لیکن اسے مردانگی نہیں کہہ سکتے۔چارج لینے کے دوسرے ہی دن وہ سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر نکل پڑا۔

ہلڈانی کچھار میں زبردست معرکہ ہوا اور پہلی بار رام لکھن کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔وہ اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ گھنے جنگلوں کی طرف فرار ہوگیا۔خان نے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا اور تھانے واپس لوٹ آیا۔

رام لکھن سنگھ شکست کی خفت سے تلملا اٹھا۔اس نے مظالم کا بازار گرم کردیا۔آئے دن ڈاکے ڈالنے لگا اور معصوم نہتے گاؤں والوں کو گولی مارنے لگا۔ان کی عورتوں اور بچوں کو اغوا کرنے لگا پورے علاقے میں اس نے دہشت اس قدر پھیلا دی کہ اس کا نام سنتے ہی لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں بند ہونے لگتیں۔

ادھر ڈی۔ایس۔پی۔خان بھی اپنی زندگی کی سب سے بڑی جنگ لڑ رہا تھا۔فرض منصبی کو سینے میں دبائے، ایمان کو ہتھیلی پہ رکھے رام لکھن سنگھ کا پیچھا کرتا رہا۔کسی حادثہ کی خبر سنتے ہی جائے واردات پر وہ بلا تاخیر پہنچتا تھا اور دور تک ڈاکوؤں کی تلاش میں بھاگتا رہتا تھا۔ان کے بڑے بڑے ٹھکانوں کو اس نے نیست ونابود کردیا تھا، بڑے بڑے اڈوں کو جلا کر راکھ کردیا تھا اپنی رائفل کی زد پر لے کر ان کے بڑے بڑے سورماؤں کے پرخچے اڑا دئے تھے، اور اس طرح دن بدن رام لکھن سنگھ کا دائرہ تنگ کرتا جارہا تھا۔لیکن رام لکھن سنگھ اور بھی خونخوار ہوتا جارہا تھا۔آخر کار پولیس فورس کی

مزید ہمت افزائی کے لئے سرکار نے اس کے سر کی قیمت پانچ لاکھ روپے مقرر کر دی۔ اس اعلان پر پولیس کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ جوش میں آ کر کچھ لوگوں نے احتیاط کا دامن چھوڑا تو انہیں موت کا سامنا کرنا پڑا۔ رام لکھن سنگھ درندے کی طرح پولیس پر جھپٹتا رہا اور انہیں موت کے گھاٹ اتارتا رہا اس نے کئی پولیس چوکیوں کو دن دہاڑے اجاڑ ڈالا۔ کتنے سپاہیوں کو مار ڈالا اور بہتوں کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے گیا لیکن ڈی. ایس. پی. خان کا جال بھی پھیلتا رہا اور عوام میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اب کسی وقت بھی رام لکھن ختم ہو سکتا ہے۔ اسی اثناء میں الیکشن کا اعلان ہو گیا جلسے ہونے لگے جلوس نکلنے لگے۔ نعرہ بازی کا بازار گرم ہوا۔ گھیراؤ کی وبا پھیلی پکٹنگ ہونے لگی فساد پھوٹنے لگے گولیاں چلنے لگیں. اور کھلے عام قتل ہونے لگا. خان کو مجبوراً ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور اس طرح رام لکھن اس کے شکنجے میں آتے آتے رہ گیا۔

صبح کا وقت تھا، خان ڈریسنگ کر چکا تھا اور تھانہ جانے کے لئے گھر سے نکلنے والا تھا کہ اخبار آ گیا۔ باہر جانے سے پہلے وہ الٹ پلٹ کر اخبار دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اخبار دیکھتے دیکھتے اس کی نظر ایک خبر پر پڑی۔ صوبے کے مشرقی حصے کے ایک حلقے سے رام لکھن سنگھ کو ملک کی ایک بڑی سیاسی جماعت نے ٹکٹ دیا تھا۔ وہ الیکشن لڑ رہا تھا۔ یہ خبر پڑھتے ہی خان کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کا جسم موم کی طرح پگھل رہا ہو۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ چند منٹوں کے بعد اپنے کمرے میں جا کر اس نے اپنی وردی اتار دی اور تھانے خبر بھجوا دی کہ آج وہ ڈیوٹی پر نہ آ سکے گا۔ اس نے الماری کھولی، رام لکھن ڈاکو کی فائل نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کی ظالمانہ حرکتوں کی داستان اس میں درج تھی۔ کہاں کہاں اس نے ڈاکے ڈالے، کتنے قتل کئے، کتنی عورتوں کا اغوا کیا۔ کتنے بچوں کو چیر پھاڑ ڈالا، کتنی بستیاں اجاڑیں، کتنے کھلیان جلائے، کتنے پولیس کے آدمیوں کو اذیت دے دے کر مار ڈالا۔ اس کے نام سے پورا علاقہ تھرتھراتا تھا اور اس کے سر کی قیمت سرکار نے پانچ لاکھ روپے رکھی تھی۔

رام لکھن سنگھ کی خونی داستان پر سرسری نظر ڈال کر خان سوچنے لگا۔ ایسا خطرناک مجرم الیکشن لڑ رہا ہے اور وہ بھی ملک کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کے پرچم تلے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اس

اوراس بوڑھے کی یتیم لڑکی کواپنے گھرلے آتا ہے ۔راوی سمجھتا ہے کہ نہایت خوبصورت بے سہارالڑکی کوبدمعاش نے اپنی رکھیل یابیوی بنا کرگھر میں ڈال لیا۔مگراس بدمعاش نے تواسے اپنی بہن بنایا تھا۔راوی شرمندہ ہوجاتا ہے ۔یہ شرمندگی اس بات کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ ہم کسی بُرے شخص کے متعلق کوئی اچھی بات سوچنے کا تصور بھی نہیں کرتے ۔جوہماری شرافتی کمزوری ہے ۔ جیب کترا راوی کواپنی منہ بولی بہن سے بھی ملاتا ہےاورایک خوبروٹرکے سے بھی اس طرح متعارف کرواتا ہے۔۔۔۔۔۔

''آؤ۔ان سے ملو۔عظیم صاحب ۔سرکاری افسر ہیں

لڑکا مسکراکرمیری طرف بڑھا۔میں کرسی سے اٹھ گیا

اوریہ سُریندر ہے ۔میرادوست ۔اے ۔جی آفس میں آڈیٹر ہے۔

رشیدنے مجھے بتایا۔ہم گرمجوشی سے ہاتھ ملانے لگے۔تورشید بولا۔

سر۔آپ کویہ جان کرخوشی ہوگی کہ میں نے اپنی منہ بولی بہن کی شادی

اس سے کردی ہے

ارے یہ کیاہوا۔میرامتعصب ذہن چیخا۔اتنی پیاری لڑکی کورشید نے

کیوں آخرکیوں؟ کیااسے اپنوں میں کوئی نہ مل سکا تھا۔اس سے بہتر ہوتا کہ خودہی

یا پھرمیں۔مگرمیں کہاں تھا پھربھی کمبخت آخرکار جیب کترے کا جیب کترا ہی نکلا

میں نے سُریندر کا ہاتھ نفرت سے جھٹک دیا۔

رشیدمیری بوکھلاہٹ بھانپ گیا۔اس کے لبوں پروہی مخصوص تیز چبھتی

ہوئی مسکراہٹ رینگ گئی۔بولا

سر۔اس لڑکی کا نام شیلا ہے

مجھے ایسالگاجیسے رشیدنے میرے منہ پرتھوک دیاہو۔

''میں گھٹ کرمزید چھوٹا ہوگیا۔''

یہ کہانی تعلیم یافتہ شریف ترقی پسندروشن خیال نظرآنے والے ، خودکودوسروں سے برترسمجھنے والےمگرباطن گھٹیاافراد کی متعصب ذہنیت کاپردہ فاش کرتی ہے۔

کے ان تمام جرائم کی سزا کون دے گا؟ میرا فرض کہاں گیا؟ میں کیا کروں؟ میرا ضمیر مجھے کس طرح زندہ رہنے دے گا۔ میں اب ملازمت نہیں کر سکتا۔

اس نے فائل سے کاغذ نکالا اور اپنا استعفیٰ لکھنے لگا۔ چند سطور لکھنے کے بعد اس نے اپنا قلم روک لیا۔ تھوڑی دیر سوچا پھر دھیرے دھیرے اس نے کاغذ کے چار ٹکڑے کر ڈالے اور اسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

''نہیں۔ ابھی نہیں''۔ اس کے منہ سے نکلا۔

ہلڈانی چوراہے پر وہ ماضی سے حال میں واپس آ گیا اور جیپ بائیں طرف موڑ دی، پاس بیٹھے انسپکٹر گردیال سنگھ نے گھبرا کر کہا۔ ''حضور یہ تو جنگل کا راستہ ہے آپ آبادی کی طرف سے کیوں نہیں چلتے؟''

''مجھے وزیر صاحب کو وہ جگہ دکھانی ہے جہاں مشہور ڈاکو رام لکھن سنگھ سے میری کئی بار مڈبھیڑ ہوئی تھی اور وہ ہر بار میرے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا''۔

''لیکن حضور! منسٹر صاحب اس راستہ کو پسند نہ کریں گے''۔

''وہ منسٹر ہیں تمام راستوں کو پسند کرنا ہی ان کی سیاسی بقا کا ضامن ہے۔ یہ ان کا صوبہ ہے انہیں ہر جگہ دیکھنی چاہئے'' خان نے جواب دیا۔

انسپکٹر گردیال سنگھ اس کے بعد کچھ نہ بولا منسٹر کی کار پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور اس کے پیچھے پولیس کی ویگن تھی۔ ویگن میں بیٹھے ہیڈ کانسٹبل نے پریشان ہو کر وائرلیس پر انسپکٹر گردیال سنگھ سے کہا۔

''سر! داہنے مڑنا تھا۔ یہ راستہ تو خطرناک ہے''۔

''صاحب نے یہی راستہ پسند کیا ہے''۔ انسپکٹر گردیال نے دھیرے سے کہا۔

چند کلومیٹر چلنے کے بعد خان نے گاڑی روک دی۔ انسپکٹر گردیال کے منہ سے پریشانی میں نکلا حضور! لیکن خان کی پیشانی پر بل دیکھ کر وہ سٹک گیا۔ آگے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ منسٹر کی کار بھی رک گئی اور اس کے پیچھے آتی ہوئی پولیس کی ویگن بھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی۔ خان جیپ سے نیچے اترا۔

وہ منسٹر کی گاڑی کے پاس گیا۔ ادھر سے شیشہ گرایا گیا۔ خان نے کہا۔ ''جناب یہی وہ جگہ ہے جہاں مشہور ڈاکو رام لکھن سنگھ کی گینگ سے میرا کئی بار مقابلہ ہوا تھا لیکن وہ خود ہر بار بچ نکلا تھا۔ آپ یہ جگہ دیکھیں کتنی خوبصورت ہے۔ دور دور تک پھیلی پہاڑیاں، ان کی گود میں مہکتے جنگلات اور قدموں میں سوتی جاگتی وادیاں، کتنا دلکش منظر ہے اور اس ہوش ربا منظر کو ڈاکو رام لکھن سنگھ نے اپنی بندوقوں کی گولیوں سے انسانوں کے خون اور معصوم عورتوں کی بے آبروہی سے مکدر کر ڈالا تھا۔ ایک نظر اس پر ڈالیں آپ اپنی دھرتی تو دیکھیں''۔

منسٹر صاحب ہچکچائے لیکن ان کے پی۔ اے۔ نے دلچسپی لی ''سر! کیا حرج ہے کچھ قدرتی مناظر بھی دیکھتے چلیں۔ آخر کو آپ وزیر جنگلات ہیں''۔ بادلِ نخواستہ منسٹر صاحب کار سے باہر آئے وہ چند قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ ڈی۔ ایس۔ پی۔ خان نے اپنے سروس ریوالور سے ان کے سینے پر دھڑا دھڑ چار فائر کر دئے۔ منسٹر صاحب وہیں ڈھیر ہو گئے۔

پولیس ویگن سے کچھ لوگ ہاتھوں میں بندوق لئے خان کی طرف دوڑے لیکن انسپکٹر گردیال سنگھ بجلی کی سی سرعت سے خان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بندوق تان کر چیخا۔ خبردار کوئی آگے نہ بڑھے گولی مار دوں گا۔

حادثہ کافی سنسنی خیز تھا۔ ملک اور بیرون ملک کے اخباروں نے بڑی بڑی سرخیاں لگائیں۔ کورٹ میں مقدمہ مہینوں چلتا رہا۔ سرکاری وکیل نے خان کو سزا دلوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا فیصلے کے دن عدالت کا کمرہ وکیلوں، رپورٹروں، فوٹو گرافروں، ٹی وی، کیمروں اور عام انسانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا، باہر ہزاروں لوگوں کا اژدہام تھا اور سبھوں کے چہرے پر ایک ہی سوال تھا ''کیا ہوگا''؟

عدالت کا وقت ہوا جسٹس رام لوچن پاسی اپنی کرسی پر آ کر بیٹھے۔ انہوں نے طائرانہ نظر ہجوم پر ڈالی اور پھر پولیس کی حراست میں بیٹھے خان کو دیکھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ ملزم خان کو حاضر کیا جائے۔

خان کو کٹہرے میں لایا گیا۔ جسٹس رام لوچن پاسی نے ان پر گہری نظر ڈالی پھر کہا۔

''مسٹر خان یہ سوال میں بار بار کر چکا ہوں۔ بتائیے آپ نے منتری جی کو کیوں قتل کیا؟

خان نے نہایت اطمینان سے کہنا شروع کیا

''یورآنر ! میں نے اس سوال کا جواب بار بار دیا ہے۔ میں نے منسٹر رام لکھن سنگھ کا خون نہیں کیا ہے۔ بلکہ ڈاکو رام لکھن سنگھ کو مارا ہے۔ اور اگر آپ یہ سوال کریں کہ میں نے ڈاکو رام لکھن سنگھ کو کیوں مارا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے اسے مار کر اپنے منصبی فرض کی ادائیگی کی ہے۔ ڈاکو رام لکھن سنگھ نے سیکڑوں بے گناہوں کو جان سے مارا ہے، ہزاروں گھروں کو برباد کیا ہے، گاؤں کا گاؤں فصل کی فصل اجاڑ ڈالی ہے۔ درجنوں عورتیں اور نوجوان لڑکیاں آج بھی لاپتہ ہیں میں نے ایک خطرناک مجرم کو مارا ہے۔ اس کے جرائم کی ایک لمبی فہرست پولیس کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ اس کے بیشتر جرائم کی سزا موت ہے۔ اسے زندہ یا مردہ پکڑنے کے انعامات جاری ہوئے تھے اس کی موت کے لئے سرکار نے پانچ لاکھ روپئے کا انعام بھی رکھا تھا۔ یہ تمام سرکاری آرڈر واردات کے دن باضابطہ تھے۔ اس کے قتل کا حکم اس دن پوری طرح زیر عمل تھا۔ انہیں احکامات کے تحت میں نے ڈاکو رام لکھن سنگھ کو مارا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ڈاکو سے وزیر بن گیا تھا۔ اگر سرکار اپنے احکامات واپس بھی لے لیتی تو بھی میں یہی کرتا۔ میں حکومت سے زیادہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوں اور عوام رام لکھن سنگھ کے مظالم کو کبھی بھول نہیں سکتی تھی اور اس کے جرائم کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ میرے خیال سے ایسے مجرم کو معاف کر دینا بذات خود ایک سنگین جرم ہے''۔

جسٹس رام لوچن پاسی نے مڑ کر دیوار پر لگے اندھے قانون کو دیکھا جس کے ہاتھ میں انصاف کی ترازو تھی۔ پھر انہوں نے مسکرا کر خان کو دیکھا۔ اثبات میں گردن ہلائی اور یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے..... ''فیصلہ کل ہوگا''۔

(نومبر ۱۹۹۱)

——

یرغمال

دلّی انٹرنیشنل ایرپورٹ پر سیکورٹی معمول سے زیادہ تھی۔ ہوم اور ڈفنس منسٹری کے اعلیٰ حکّام بھی موجود تھے۔ ایرپورٹ کا خصوصی طیارہ لینڈ کر چکا تھا اور وہ جرمنی سے اسی طیارہ میں آیا تھا۔ ایرپورٹ کا خصوصی انتظام اور ہنگامہ اس کی حفاظت کے لئے کھڑا کیا گیا تھا۔ ایرفورس کے طیارہ کے کچھ فاصلہ پر ایرانڈیا کا خصوصی طیارہ مستعد کھڑا تھا اور سری نگر کی فلائٹ کے لئے پرتول رہا تھا۔ خصوصی مہمان اسی طیارہ سے سری نگر پرواز کرنے والا تھا۔ ایرفورس کے طیّارہ پر سیڑھی لگائی جا چکی تھی۔ دروازہ کھلا تو سب سے پہلے جرمن سیکرٹ سروس کا ڈپٹی ڈائرکٹر نمودار ہوا۔ اس کے سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی اس کی پشت سے انڈین ایرفورس کا ایک اعلیٰ افسر نکل کر سامنے آ گیا اور اس کے بعد مہمان جسے جرمن حفاظتی دستے کے دو افراد اپنی حفاظت میں لئے ہوئے تھے۔ ایرپورٹ کی ہلچل میں تیزی آ گئی۔ دونوں طیاروں کے درمیان ایرپورٹ کا عملہ اور سیکورٹی دستوں کے افراد دوڑ بھاگ کرنے لگے۔ خصوصی مہمان کو پرتو لتے ایرانڈیا کے خصوصی طیارہ پر چڑھایا گیا اور چند منٹوں کے بعد وہ طیارہ اسے اور اس کے عملے کو لے کر سری نگر کی طرف پرواز کر گیا۔

سری نگر میں حسبِ معمول ہڑتال تھی۔ گذشتہ چھ سالوں سے اس شہر کے چہرے پر بھرپور

مسکراہٹ نہیں آپائی تھی ۔اس کی شوخی، طرّ ای، حسن اور دل کشی مفقود ہو چکی تھی۔ اور یہاں کی عوام کو صحیح معنوں میں آزادی، خودمختاری، اور خوشحال زندگی سے کوئی نسبت نہیں تھی ۔ یہاں کی اکثریت راجاؤں اور زمین داروں کی غلام تھی ۔ انہیں جاہل رکھا گیا تھا۔ انہیں مفلوک الحال بنایا گیا تھا کہ کشمیر کا قدرتی حسن بیرون کشمیر رہنے والے امیر لوگوں کی عیاشی اور دلجوئی کا سامان فراہم کرتا رہے، سیّاح آئیں اور کشمیر کے حسن وشباب سے سرشار ہوتے رہیں ۔ کشمیری عوام اگر خودمختار اور خوشحال ہو جاتی تو ان کا استحصال کرنا ممکن نہ ہوتا اور اگر استحصال نہ ہوتا تو وہ تفریح کا ذریعہ کیسے بنتی ؟اس لئے پہلے مقامی راجے ، مہاراجے زمیندار مہاجن اور ساہوکاران کا استحصال کرتے تھے ، بعد میں اِدھر اور اُدھر کی حکومتیں کرنے لگیں۔ جو کچھ بچا تھا دہشت گردوں نے چھین جھپٹ لیا۔ ایسی صورت میں سری نگر میں رونق کہاں سے ہوتی۔ اگر ہڑتال نہ بھی ہوتی تو بھی یہ شہر خاموش ہی رہتا۔ ڈراڈراسا۔ سہما سہما منہ چھپائے ، سر نیوڑھائے ، اپنے راستے سے تیزی سے گذر جانا یہاں کے ہر شہری کا عبرتناک معمول بن گیا تھا۔

خصوصی مہمان کو جرمنی سے ایک اہم مہم پر لایا گیا تھا۔ ایک سال قبل دہشت گردوں کے گروہ نے پانچ غیر ملکیوں کو یرغمال بنالیا تھا۔ ان میں سے ایک کی لاش بعد میں مل گئی تھی اور باقی چار ہنوز لاپتہ تھے ۔ دنیا کے کئی ملکوں نے، ہیومن رائٹس کے اداروں نے ، نان گورنمنٹ آرگنائیزیشن نے ، اہم شخصیتوں نے ، یہاں تک کہ دہشت گردوں کے دوسرے گروہوں نے بھی یرغمالیوں کو آزاد کرنے کی درخواست کی ۔ اس بات کی بھی اپیل کی گئی کہ اگر انہیں مارڈالا گیا ہو تو ان کی قبروں کا پتہ ہی بتادیں۔ یرغمالیوں کی مظلوم بیویوں نے بھی ذمہ دار دہشت گرد گروپ سے اپیل کی ۔ ان کی دل سوز اپیل پر کشمیر کے پتھروں نے بھی آنسو بہائے ہوں گے اور ان کے آنسو چناب کے پانی میں مل کر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی زمینوں کو غم آلود کیا ہوگا۔ لیکن زمینوں کے غم کی فکر کون کرتا ہے۔ ہمارے برّ صغیر کی دھرتی نے کتنے دُکھ اُٹھائے ہیں ۔ سرحدوں کو ہی لیجئے ۔ ان کے مقدّر میں خون اور آنسو کے علاوہ کچھ لکھا بھی نہیں ہوتا۔ آج کی تہذیب کا تو یہی خاصا ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کے لئے سر کٹتے ہیں لیکن ان سرحدوں کی زمینوں سے تو پوچھئے کہ ان کے سینے پر جب کوئی انسان دم توڑتا ہے تو ان پر کیا گذرتی ہے۔ جب ان کی آغوش میں کوئی مرتا ہے تو ان

کا کلیجہ کس طرح شق ہوتا ہے۔ان سرحدوں نے کتنی ماؤں کے جوان بیٹے لئے کتنی سہاگنوں کا سہاگ لوٹا، کتنے بچوں کو یتیم بنایا، کتنے خاندانوں کو تباہ و برباد کیا اور ان کے مرنے والوں کو شہید کہہ کر ساری انسانیت کو ذلیل و رسوا کیا۔خود غرض، اڑیل، بے رحم سیاست دانوں کی انا کی تسکین کی خاطر قومیت اور وطنیت کی غلط اور گمراہ کن توجیہہ اور تشریح نے نفرت کا بازار پوری دنیا میں گرم کر رکھا ہے۔ جب تک وطن پرستی اور قومیت کے مفہوم کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جائے گا عالمی انتشاریوں ہی قائم رہے گا۔

کشمیر کے ماحول پر قدرت حسب معمول رعنائی اور دل کشی نچھاور کر رہی تھی، پہاڑیوں پر برف گر رہی تھی، جھرنے فضا میں نغمے بکھیر رہے تھے، وادیاں اسی طرح روح پرور تھیں، پگڈنڈیاں پہلے کی طرح ہی بل کھا رہی تھیں، چنار کے درخت اسی طرح آراستہ تھے، اور خوبانیوں کا رنگ بھی وہی تھا البتہ گھروں میں چھپی بیٹھی دوشیزاؤں کے منہ اترے ہوئے تھے بوڑھوں کے چہروں پر جھرّیاں زیادہ آگئی تھیں اور نوجوان لڑکوں کی آنکھوں میں تیرتے ڈوروں کا رنگ سرخ گہرا ہو گیا تھا۔

ایر انڈیا کا طیارہ سری نگر ایر پورٹ پر لینڈ ہوا۔ یہاں پر محافظوں کی گہما گہمی تھی لیکن اتنی نہیں جتنی دلّی ایر پورٹ پر تھی۔ سیکورٹی کے لوگ تھے کچھ سول افسران بھی موجود تھے گورنر کا خاص نمائندہ بھی آیا ہوا تھا اور باہر بلٹ پروف متعدد گاڑیاں قطار میں کھڑی تھیں خصوصی مہمان کو لے جا کر ایک بلٹ پروف گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

قافلہ روانہ ہوا

یہ لوگ ماگام جنگل کی طرف جا رہے تھے اور خصوصی مہمان سے کام یہ لینا تھا کہ وہ ماگام کے جنگلوں میں پتہ لگائے کہ اگر غیر ملکی سیاحوں کو دہشت گردوں نے مار ڈالا ہے تو ان کی قبریں کہاں ہیں یہ خصوصی مہمان ان قبروں کو سونگھ کر بتانے والا تھا۔

جی ہاں! یہ خصوصی مہمان اسنفر ڈاگ (Sniffer Dog) تھا یعنی سونگھ کر جرائم کا پتہ لگانے والا کتا جسے جرمنی کی حکومت نے بطور خاص کشمیر بھیجا تھا کہ وہ کام جسے ہندوستانی سیکورٹی پچھلے ایک سال میں نہ کر سکی وہ منٹوں میں کر لے گا اور وہ بھی سونگھ کر۔

کتا بلٹ پروف بلیک مرسڈیز کی پچھلی نشست پر آرام سے بیٹھا بلٹ پروف شیشوں سے کشمیر کا نظارہ کر رہا تھا اس کے دونوں ٹریز اُس کے پاس بیٹھے تھے ۔ اگلی نشست پر جرمن سراغرسانی محکمہ کا ڈپٹی ڈائرکٹر تھا۔ سکیورٹی فورس کی گاڑیاں کچھ آگے اور کچھ پیچھے لگی تھیں ۔ تمام گاڑیاں سری نگر کی ٹھنڈی چکنی اور خاموش سڑک پر فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھیں ۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ماگام جنگل آ گیا۔ گاڑیاں رکیں ،لفٹننٹ کرنل، جو سری نگر ہوائی اڈّے سے ساتھ ہولیا تھا، سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے کشمیر کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل آف پولس تھا۔ اس کے بعد کتا اور پیچھے دوسری گاڑیاں ۔ ان میں سے ایک میں حزب الصالحین کا نمائندہ نجم الثاقب بھی تھا۔ جس نے چند روز قبل اپنے آپ کو سیکورٹی کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ دلّی سے کارواں کے ساتھ آیا تھا کیونکہ سرینڈر ہونے کے بعد وہ دلّی میں رہنے لگا تھا کہ وہاں دنیا بھر کے میڈیا رپورٹر ہوتے ہیں اور کوئی چھینکے بھی تو آواز پورے کرۂ ارض پر لمحوں میں پھیل جاتی تھی اور اگر چھینک زکام کی وجہ سے آئی ہو تو امریکہ کے تالاب میں گھسی مینڈکی کو بھی انفلوئنزا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔

لفٹننٹ کرنل نے بڑھ کر کتے کی کار کا دروازہ کھولا۔ کتا پھدک کر باہر آ گیا۔ اس کے گلے میں بندھی رسّی چیف ٹریز کے ہاتھوں کی گرفت میں تھی۔

ہیلی پیڈ پر ایک ہیلی کوپٹر ایستادہ تھا۔ لفٹننٹ کرنل ، جرمن سراغرسانی کا ڈپٹی ڈائرکٹر اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل آف پولس ، کتا، اس کے دونوں ٹریز اور حزب الصالحین کا نمائندہ نجم الثاقب اس ہیلی کوپٹر میں سوار ہوئے اور ہیلی کوپٹر ماگام جنگل پر ہولے ہولے پرواز کرنے لگا۔ اڑان اتنی نیچی تھی کہ اونچے درختوں کی اوپری شاخوں سے ہیلی کوپٹر کا پیٹ کہیں کہیں مَس کر جاتا تھا۔ ہیلی کوپٹر اتنی کم بلندی پر پرواز اس لئے کر رہا تھا کہ کتے کو وہ جگہ تلاش کرنی تھی جہاں بے قصور، مجبور و مظلوم، یرغمالیوں کی قبریں ہو سکتی تھیں ۔ کتے نے اپنی نگاہیں اور لفٹننٹ کرنل نے اپنی رائفل کا نشانہ نیچے لگا رکھا تھا۔ دونوں کے نتھنے پھولے ہوئے تھے ۔ کتے کے نتھنے اس لئے پھولے تھے کہ پچاس فٹ نیچے زمین دیکھ سکے اور سونگھ سکے کہ کہیں مظلوم یرغمال دفن تو نہیں ہیں اور لفٹننٹ کرنل کے نتھنے اس لئے پھولے تھے کہ اسے ڈر تھا کہ دہشت گرد کہیں چھپے تاک میں بیٹھے نہ ہوں اور وہ ہیلی کوپٹر کو دھائیں سے اڑا دیں ..... بڑی سخت مہم تھی

ہیلی کوپٹر نے پورے جنگل پر تین بار پرواز کیا لیکن کتا ایک بار بھی نہ بھونکا بس اس کے نتھنے مسلسل پھولے رہے۔ اس نے اس عرصے میں ایک بار بھی اپنی گردن اوپر نہ کی ، اس کی تیز نگاہیں درختوں کے درمیان سے زمین پر وہ جگہ تلاش کرتی رہیں جہاں دہشت گردوں نے بے قصور اور مظلوم یرغمالیوں کے مُردہ جسموں کو چھپا رکھا تھا لیکن وہ ایک بار بھی نہ چونکا نہ بھونکا نہ بے چین ہوا بس آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا اور نتھنے پھلائے سونگھتا رہا۔

آخر کار تنگ آ کر لفٹننٹ کرنل نے اپنے نتھنے پھلانا بند کر دیا

''Over واپس چلو، جب ہم اندر گھس کر پتہ نہ لگا سکے تو یہ بے چارہ کتا پچاس فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے کیا لگائے گا۔ ڈیم اِٹ''

جرمن محکمۂ سراغرسانی کے ڈپٹی ڈائرکٹر، جس کا چہرہ سرخ تو پہلے ہی سے تھا اور اس میں مزید سرخ ہونے کی گنجائش نہ تھی اس لئے سیاہی مائل ہو گیا، بڑی ناگواری سے بولا۔

''ہمارا کتا انڈیا کے حلوائیوں یا قصائیوں کی دوکانوں کے آگے بیٹھنے والا خارش زدہ کتا نہیں ہے۔ یہ ہمارے انٹلی جنس کا سب سے فہیم اور چالاک کتا ہے۔ اس نے دوسری جنگ عظیم میں مرنے والے جرمنوں کی قبروں کا پتہ پچاس سال بعد لگایا ہے اور جرائم کے ایسے ایسے راز افشا کئے ہیں کہ انسانی عقل حیران حیران ہو گئی ہے۔ اس کی آنکھوں اور نتھنوں نے بڑے بڑے قاتلوں کے چہرے اتار دئے ہیں۔ جسے دیکھ لیا سمجھو اس کا آخری دن آ گیا اور جس جگہ کو سونگھ لیا وہیں جرم کا ہونا آخر کار ثابت ہوا۔ اس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوتا ہے۔ ہماری کورٹ بھی اس کتے کی ہاں کو ''نا'' نہیں کر سکی''۔

ڈپٹی ڈائرکٹر کی پھٹکار سن کر للفٹننٹ کرنل کے نتھنے پھر پھول گئے

''لیکن یہاں یہ ناکام کیوں ہوا؟ دھائی، دھائی؟''

''وہ اس لئے کہ یہاں کوئی جرم ہوا ہی نہیں، اور نہ ہی کسی کو دفن کیا گیا ہے''

''اسٹوپڈ''

لفٹننٹ کرنل کے نتھنے پچک گئے اور اس نے ہیلی کوپٹر کو واپس لانے کا حکم دے دیا۔ ہیلی پیڈ پر باقی لوگ منتظر تھے لفٹننٹ کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ان کے چہرے بھی اتر گئے۔ کارواں خاموشی کے ساتھ واپسی کے سفر پر روانہ ہوا لیکن اس بار سکیورٹی کے خیال سے راستہ بدل

دیا گیا۔ کتا اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ چونکہ کار کا شیشہ آدھا اٹھا ہوا تھا اس لئے وہ باہر کا منظر بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ سیب کے باغات گزرنے، زعفران کے کھیت گزرنے، ندی نالے گزرے، وہ اطمینان سے بیٹھا رہا لیکن ابدی آرام گاہ کے آتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے کار کے شیشے کو کھرونچنا شروع کر دیا اور منہ سے پک پک کی آواز نکالنے لگا۔ چیف ٹریز نے تعجب سے اسے دیکھا اور اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ڈپٹی ڈائرکٹر آف سراغرسانی سے گاڑی فوراً رکوانے کی درخواست کی۔

کار رُک گئی اور اس کے ساتھ آگے پیچھے چلنے والی باقی گاڑیاں بھی رُک گئیں، لفٹننٹ کرنل رائفل لئے گھبرایا ہوا آیا..... ''بات کیا ہے؟''

''کتے نے کچھ دیکھا ہے'' ڈپٹی ڈائرکٹر نے بتایا۔

لفٹننٹ کرنل نے منہ بنایا۔ ''اب یہاں کیا دیکھے گا؟ انسانوں کی آبادی شروع ہو چکی ہے''

''لیکن اس نے کچھ محسوس ضرور کیا ہے'' چیف ٹریز نے اپنا خیال بھی پیش کیا اسپر لفٹننٹ کرنل نے مزید ناگواری کا اظہار کیا۔

''اب یہاں کیا محسوس کرے گا۔ دور دور تک کھیتوں، باغوں، اور قبرستانوں کا سلسلہ ہے''

دفعتاً چیف ٹریز چونک پڑا۔ ''قبرستان؟''

''ہاں! کشمیری مسلمانوں کی قبرستان۔ اس میں چونکنے والی کون سی بات ہے؟''

''ہمیں باہر نکلنا چاہیئے'' چیف ٹریز نے ڈپٹی ڈائرکٹر کو مشورہ دیا جس پر وہ فوراً راضی ہو گیا۔ کتے کو جیسے ہی باہر نکالا گیا وہ بڑی تیزی سے اس طرف جانے لگا جدھر قبرستان تھا۔ اس کی رسّی چیف ٹریز پکڑے ہوئے تھا۔ وہ بھی ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ دوسرے لوگ بھی تقریباً دوڑتے ہوئے اس کا ساتھ دینے میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر کی دوڑ بھاگ کے بعد کتا قبرستان میں داخل ہو گیا اور بڑی بے چینی سے بھونکتے ہوئے ایک ایک کر کے تمام قبروں کو سونگھنے اور ان پر اپنی تھوتھنی رگڑنے لگا۔ لفٹننٹ کرنل یہ منظر دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا۔

''وہاٹ از دِس ڈیول ڈوئنگ'' (یہ مردود کیا کر رہا ہے؟)

ڈپٹی ڈائرکٹر نے غصّے سے کرنل کو دیکھا۔

یہ جرمن ٹرینڈ کتا ہے۔ ہندوستانی یا پاکستانی نہیں۔ اسے گالیاں مت دو۔ جو کچھ بھی یہ کر رہا ہے اپنی جبلّت کے مطابق کر رہا تھا۔

''یعنی''

''وہ ان قبروں کو تلاش کر رہا ہے جن میں بے قصور مجبور اور مظلوم لوگ دفن ہیں''۔

''لیکن یہ، یہ تو عام انسانوں کی قبریں ہیں''۔

اسی وقت ایک بوڑھا شخص جو کسی قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا تھا وہاں آ گیا۔ اِسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل آف پولیس نے پوچھا۔ ''بابا یہ کن لوگوں کی قبریں ہیں؟''

بوڑھے نے ''حزب الصالحین'' کے نمائندہ نجم الثاقب کو نفرت سے دیکھا، پھر لفٹیننٹ کرنل پرنگا ہیں گاڑ دیں۔ چند لمحوں تک وہ اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''یہ قبرستان صرف چھ سال پرانا ہے۔ چھ سال قبل یہاں زعفران کا کھیت تھا۔ اس قبرستان میں تین طرح کے لوگ دفن ہیں۔ اِدھر وہ لوگ ہیں جنہیں سکیورٹی فورس نے بے دردی سے قتل کیا اور الزام دہشت گردوں پر لگایا۔ اُدھر وہ لوگ ہیں جنہیں دہشت گردوں نے بے رحمی سے مارا اور الزام سکیورٹی فورس پر لگایا، اور درمیان میں وہ دفن ہیں جو راہ چلتے سکیورٹی فورس اور دہشت گردوں کی کراس فائرنگ میں شہید ہوئے''۔

کتا انتہائی بے چینی کے ساتھ تمام قبروں پر اپنی تھوتھنی رگڑتے ہوئے پورے قبرستان میں دوڑ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر انٹلکٹ کرنل آپے سے باہر ہو گیا۔

''یہ کتا پاگل ہو گیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے جرمن فوجیوں کی سی حرکتیں کر رہا ہے''

لفٹیننٹ کرنل کی بات سن کر ڈپٹی ڈائرکٹر آف جرمن انٹلی جنس مسکرا اٹھا۔

''مائی فرینڈ! یہ جرمن ٹرینڈ اسنفر ڈاگ ہے، اسے معصوم، مظلوم، اور بے قصور یرغمالیوں کا پتہ لگانے کے لئے کہا گیا تھا سو وہ کر رہا ہے۔ جاؤ ان قبروں کو کھود کر لاشیں نکال لو۔ ہمارا کام ختم ہوا''۔

(ستمبر ۱۹۹۶)

اس افسانے کا موضوع فساد نہیں۔ مگر فساد زدہ شہریوں کی متعصب ذہنیت ضرور بیان کرتا ہے۔

احمد آباد کے Revolving Patang Hotel کی تعمیر کے بعد ہاشمی نے ''بابلا'' کہانی لکھی۔ بابلا۔ ایک غریب کار کی صفائی کرنے والے لڑکے کی کہانی ہے جو اس ہوٹل سے احمد آباد کا نظارہ کرنا چاہتا ہے۔ اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے کئی ماہ کی محنت و مشقت کے بعد جب گراؤنڈ بیرے کے ہاتھوں ذلیل ہوتا ہے تو کس طرح اپنی ذلت کا بدلہ لیتا ہے اسے قاری کہانی کے اختتام پر جان سکتا ہے۔

جن لوگوں نے Patang Hotel کو بنتے اور کاروبار کرتے دیکھا ہے ان کی آنکھوں کے سامنے ہوٹل کی تصویر مکمل ابھر آئے گی۔ ہاشمی کے دوسرے افسانوں کی طرح یہ افسانہ بھی انہیں اپنا ہی افسانہ معلوم دے گا۔ ہاشمی کی نگارشات کا یہ بھی ایک وصف ہے کہ افسانوں کی دنیا۔ شہر اور سڑکیں گاؤں اور پگڈنڈیاں سارا ماحول اور کردار سبھی حقیقی ہیں۔ یہ افسانے ہاشمی کے، میرے، آپ کے ہم سب کے افسانے ہیں۔ کچھ بھی مستعار نہیں۔ آپ بہ آسانی ان میں بیان ناموں کو اپنے شناسا نام دے سکتے ہیں اور اس کے لئے آپ کو ذہن پر زور بھی دینا نہیں پڑے گا۔

شاہ زمانی کی درگاہ شریف حضرت شاہِ عالم کی درگاہ ہے۔

ہنڈولہ تالاب چنڈولہ تالاب ہے یہ بتانے کی ضرورت کم از کم ان کے لئے نہیں جن کا تعلق احمد آباد سے ہے۔ اور جنہوں نے احمد آباد نہیں دیکھا ان کے لئے بھی جگہ اور اشخاص کے نام نہ سہی موضوع اور کردار تو یقیناً جانے پہچانے ملیں گے کہ ان سے دیگر شہر اور کرداروں کی بھی مناسبت ہمیشہ رہی ہے۔

ہاشمی فیض آباد (یوپی) بہروز پور گاؤں (تحصیل ٹانڈہ) کے جاگیردار خاندان میں یکم جولائی ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مدرسہ جان العلوم، رسول پور میں حاصل کی۔ جہاں ماہر دینیات والد ماجد سید امیر حسن ہاشمی صدر مدرس تھے۔ ان کی زبان دانی تمام علاقے میں مشہور تھی۔ اپنی زبان، شائستگی نجابت اور نفاست کے لئے عوام و خواص میں احترام و عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سید ظفر ہاشمی کی نثری تحریروں میں سادگی۔ محاوروں کا برجستہ استعمال، طنز کی کاٹ

فیصلہ

اپنے فلیٹ کی بالکونی پر چہل قدمی کرتے ہوئے میری نگاہیں اس عورت پر پڑیں تو وہیں جم کر رہ گئیں۔

گلی کے نکڑ پر بگڑا ہوا ایک آٹو رکشہ کھڑا تھا جس پر وہ ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھے بڑے ٹھسّے سے بیٹھی تھی۔ اس نے خوب گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ کھلے ہوئے بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ لٹھے کی سفید شلوار اور گلابی رنگ کی جمپر پہنے ہوئے تھی۔ فیروزی رنگ کا دوپٹہ گلوبند کی طرح گلے میں حمائل تھا۔ اس کے ایک سرے کو وہ انگلیوں میں پھنسا کر گھما رہی تھی اور ہولے ہولے منہ چلاتی ہوئی پان کھا رہی تھی۔ مجھے اس عورت کا سراپا اور انداز محلّہ کی دوسری عورتوں سے مختلف لگا۔ میں اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ نجمہ کی آواز سے چونک اٹھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں آپ'' اس نے میرا شانہ ہلاتے ہوئے پوچھا

''ک۔ کچھ نہیں'' میں بوکھلا گیا۔

''پھر خود فراموشی کا عالم کیوں تھا۔ میں نے اندر سے کئی بار آواز دی مگر آپ نے سنا ہی نہیں''۔

''میں اس عورت کو دیکھ رہا تھا''۔ میں نے باہر اشارہ کیا۔ ''کون ہے وہ''۔

نجمہ نے گردن اٹھا کر سڑک پر دیکھا تو اس کا پارہ چڑھ گیا۔ ''بالکنی میں کھڑے ہو کر گلی محلہ کی عورتوں کو گھورنا نہایت بیہودہ حرکت ہے۔ آپ کو شرم آنی چاہئے۔ اپنی پوزیشن کا تو خیال کرئے''

''بھئی تم خواہ مخواہ الجھ گئیں۔ وہ عورت بڑی زنانے دار لگی تو دیکھنے لگا۔ بس یوں ہی''۔ میں نے صفائی پیش کی تو وہ اور خفا ہو گئی۔

''طوائف بھلا کیسی لگے گی۔ زنانے دار نہیں تو کیا حیادار''

''ہائیں۔ مجھے کیا معلوم کہ ہمارے پڑوس میں ایک طوائف بھی رہتی ہے''

''اور اگر معلوم ہوتا تو آپ کیا کرتے اس کے گھر کا طواف؟''

میں مسکرا اٹھا۔ بولا۔

''نہیں نجو۔ میرا مطلب یہ تھا کہ شریفوں کے اس محلہ میں بھلا طوائف کا کیا کام''۔

''ایک آدمی بمبئی سے بھگا کر لایا ہے۔ نکاح بھی پڑھا لیا ہے''

''گڈ۔ کون ہے وہ مرد مجاہد''۔ میں نے پوچھا

نجمہ نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اسکی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ بڑی تلخی سے بولی۔

''توبہ توبہ کریئے۔ اللہ محفوظ رکھے اور خدا کیلئے بالکنی میں کھڑے ہو کر اپنی شرافت کا مظاہرہ نہ کیجئے اندر چلے چائے تیار ہے''۔

ہم چائے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سلمٰی آپا آ گئیں۔ سلمٰی آپا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ اُن کے میاں ریلوے میں گڈس کلرک تھے۔ نجمہ سے ان کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ سلمٰی آپا کے پاس محلہ بھر کی خبریں ریکارڈ رہتی تھیں۔ آج کس کے گھر میاں بیوی میں جھگڑا ہوا۔ کس کے یہاں پیدائش ہوئی اور کہاں موت، کون شراب کے نشہ میں پولیس کے ہاتھوں دھر لیا گیا اور کس کے ہاتھوں پولیس خود پٹ گئی، کس کا عشق کسی سے چل رہا ہے اور کون بڑی ایسی ہے اور کون بڑی ویسی وغیرہ وغیرہ خبروں سے وہ ہمیشہ لیس رہا کرتی تھیں اور آتے ہی فائر کرنا شروع کر دیتی تھیں۔ غرض کہ سلمٰی آپا کیا تھیں مقامی اخبار جو محلہ کی خبریں چھاپتا بھی تھا اور سناتا بھی۔ وہ آئیں تو نجمہ کے قریب

فرش پر بیٹھ گئیں۔

''کچھ سنا تم نے دلہن'' انہوں نے پوچھا

''نہیں تو''۔ نجمہ بولی۔

''ہائے محلہ میں آفت مچی ہے اور تمہیں خبر ہی نہیں''

''کیا ہوا بتایئے تو۔ آپ اتنے دنوں بعد آئیں ہیں، بھلا مجھے کیسے معلوم ہوتا''۔ نجمہ نے حسب معمول ان کی باتوں میں دلچسپی لی

''ارے آتی تو کیسے آتی۔ مواحفوا بیمار پڑ گیا تھا۔ چار دن تک بخار میں تپتا رہا۔ آج ہلکا ہوا تو جان میں جان آئی

''اچھا''۔ نجمہ بولی۔ ''تبھی تو میں نے کہا کہ آپا کہاں کھو گئیں۔ ہاں تو کیسی''.....۔

نجمہ کی بات پوری ہونے سے پہلے سلمٰی آپا نے اچک لیا ''طبیعت تو اب ٹھیک ہو رہی ہے۔ حکیم جی کا علاج کرایا صبح دوپہر، شام وہ موئی کٹورے بھر بھر دوائیاں پینے کو دیں کہ چھوکرے کا پلیتھن ہو گیا۔ یہ حکیم لوگ.....''۔

''آپا وہ بات آفت والی''

نجمہ نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ وہ جانتی تھی کہ سلمٰی آپا حکیم کا دکھڑا لے کر بیٹھ گئیں تو گھنٹوں دم نہ لیں گی اور محلہ میں آفت مچانے والی بات رہ جائے گی۔ اس لئے اس نے جلدی سے یاد دلایا، مگر آپا تھیں کہ اپنی رو میں بہتی رہیں۔

''آفت تو ہوتے ہی ہیں یہ حکیم لوگ، ایسی کڑوی کڑوی دوائیاں.....''۔

''نہیں آپا۔ میں پوچھ رہی تھی کہ وہ کون سی بات ہے جس نے محلہ میں آفت مچا رکھی ہے'' نجمہ نے گھبرا کر پھر یاد دلایا۔

''ارے ہاں''۔ آپا کو یاد آ گیا۔ ''وہ محمود خاں ہے نہ؟''

''کون محمود خاں؟'' نجمہ نے پوچھا

''ارے وہی جس نے اپنے گھر میں دوسری عورت ڈال رکھی ہے''

''اچھا اچھا کیا ہوا اُسے؟''

''اسے تو کچھ نہیں ہوا، البتہ اس کا باپ اسپتال میں پڑا اب تب ہو رہا ہے''۔

''چہ چہ بیچارہ پھر؟''

''موا کہتا ہے محمود خان سے کہ جمیلہ کو۔ جمیلہ نام ہے اس کلموھی کا۔ دھکے مار کر گھر سے نکال دے۔ ایک مرتبہ ہاں کہہ کر لایا ہے، تین مرتبہ نا کہہ کر باہر کرے تب مروں گا ورنہ میری جان اٹکی رہے گی''۔

میں ان دونوں کی باتیں اب تک غیر متعلق بنا سنتا رہا تھا اور اخبار پڑھتا رہا تھا۔ سلمٰی آپا کی اس اطلاع پر چونکا، اخبار سے نظریں ہٹائیں اور شامت کا مارا بولا۔

''بڑا کمینہ ہے بڈھا۔ آخر مرتا کیوں نہیں''

نجمہ نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ خود مجھے تین بار ''نا'' کہہ دے گی۔ اس کا منہ سرخ ہو گیا کانوں کی ملائم ملائم لو خون کا قطرہ بنکر ہلنے لگی۔

''پیدا ہوا ہے تو مرے گا ہی مگر آپ کون ہوتے ہیں بد دعا دینے والے''

اس نے اس طرح ٹھہر ٹھہر کر، الفاظ کو جما جما کر اور میرے چہرے پر اپنی بڑی بڑی آنکھیں گاڑ کر کہا کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ جھینپ مٹانے کے لئے بولا۔

''میرا مطلب تھا کہ وہ محمود خان کو مجبور کیوں کر رہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے''

''بیوی ہو گی آپ کی۔ توبہ اللہ یعنی کہ محمود خان کی بیوی تو اپنے تین بچوں کو لئے میکہ میں پڑی ہے اور یہ چڑیل اس کے گھر اور شوہر پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ بڈھا ٹھیک کہتا ہے ایسی فاحشہ کو تو واقعی دھکے مار کر گھر اور محلہ سے باہر نکال دینا چاہئے''۔ نجمہ نہایت خفگی سے جلدی جلدی بولی، سلمٰی آپا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اور کیا دلہن، مولوی صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ محلہ کی برکت اسی عورت کی وجہ سے اڑ گئی ہے، جب تک یہ رہے گی فلاح ناممکن''

میں نے زیادہ الجھنا مناسب نہ سمجھا۔ اخبار پھر دیکھنے لگا۔ سلمٰی آپا نے کچھ مزید اطلاعات

بہم پہنچائیں، پان کھایا اور چلی گئیں۔ جاتے جاتے کہتی گئیں کہ دلہن کسی سے کہئے گا نہیں، یہ سب اندر کی باتیں ہیں، میں نے اپنا سمجھ کر تم کو بتا دیا۔ ورنہ میری عادت اِدھر کی اُدھر کرنے کی نہیں ہے''

اس واقعہ کے تقریباً ایک ہفتہ بعد آفس سے جیسے ہی میں گھر لوٹا نجمہ نے خبر دی۔

''مولوی جمن نے فتویٰ دے دیا''

''کیسا فتویٰ''؟۔ میں نے شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے کہا ہے کہ مرنے والے کی آخری خواہش پوری کرنا فرض اولین ہے۔ اور اگر محمود خان کے بزرگوار والد محترم ومکرّم کی خواہش ہے کہ محمود خان اس طوائف کو طلاق دیکر اپنی منکوحہ اوّل سے ازدواجی رابطہ وسلسلہ دوبارہ قائم کرلے تو یہ کارِ خیر ہوگا۔ جس کا اجر مرحوم کو۔ یعنی محمود خان کے والد کو جو وہ مرنے کے بعد ہونگے، حشر کے دن ہزار گنا ملے گا اور محمود خان کو اسی دار فانی میں بشکل.....''۔

''شٹ اپ''

میں اتنی زور سے چیخا کہ نجمہ لڑھک کر کرسی پر بیٹھ گئی میری مٹھی جکڑی ہوئی تھی، اور اس میں شیروانی کے تین بٹن تھے۔

نجمہ غصّے سے کانپنے لگی۔ ''آپ چیخے کیوں؟''

''مولوی جمن اگر اس قسم کا فتوی دیتے ہیں تو مولوی نہیں برگد کی شاخ پر لٹکے ہوئے چمگاڈر ہیں''۔ میں بھی آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

نجمہ مولوی صاحب کی بڑی عزت کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس مدرسے سے پڑھے ہوئے ہیں جس سے اس کا خاندانی تعلق ہے اور اس کے خیال سے وہاں سے جو بقول شخصے فارغ ہوتا ہے وہ ولی اللہ ہو جاتا ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ دوسرے فرقے سے متعلق بتاتی تھی۔ حالانکہ مجھے خود معلوم نہ تھا کہ میں کون ہوں اور ہوں تو کیوں ہوں۔ پھر بھی وہ بات بات پر فرقہ وارانہ بحث گھر میں کرتی رہتی تھی۔ اکثر فساد بھی ہو جایا کرتا تھا۔ مولوی جمن کی شان میں میرے منھ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ وہ کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ بولی

''مجھے بھی مرنا ہے اور آپ کو بھی اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ ہے نہ؟''

میں نے کہا موت برحق ہے اور اللہ سے میں بہر حال ڈرتا ہوں

''پھر ایک بزرگ کو گالی دینے سے آپ کی عاقبت سدھرے گی تو نہیں۔ ایک ذلیل عورت کی طرف داری میں مولوی صاحب کو چمگادڑ کہتے ہوئے آپ کو ڈر نہیں لگا۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ اس رسوائے عالم سے آپ کو کیا ہمدردی ہے، میرا بس چلے تو ابھی اس کی چٹیا پکڑ کر گھر سے باہر کھینچ لاؤں اور منہ کالا کر کے پورے محلہ میں گھماؤں کہ دیکھ اپنی اصلیت۔ آپ نہ بالکنی میں بیٹھتے اٹھتے اور نہ مجھے یہ دن دیکھنا پڑتا، بھاگ گئی ہوگی سور۔ اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔

میں نے شیروانی اتار کر وارڈ روب میں ٹانگ دیا اور مسہری پر بیٹھ کر جوتے کا تسمہ کھولتے ہوئے بولا

''عورت کا احترام اگر عورت ہی نے نہ کیا تو پھر مردوں سے کیا توقع کی جائے۔ دراصل عورت کی سب سے بڑی دشمن خود عورت ہے۔ یہ الزام کسی حد تک صحیح ہے کہ عورت کو فحاشی کی طرف لیجانے میں مرد کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر کوئی بہکی ہوئی عورت پاکباز زندگی کی طرف قدم بڑھانا چاہے تو اس کی ہم جنس ہی سنگِ راہ بن جاتی ہے''۔

نجمہ نے رونا بند کر دیا۔ اور بغیر کچھ بولے باورچی خانہ کی طرف چلی گئی۔ میں نے کپڑے اتارے اور غسل خانے کا رخ کیا۔

نہا کر باہر آیا تو سلمٰی آپا کو باورچی خانہ میں نجمہ کے پاس پیڑھی پر بیٹھے مزے میں چھالیہ کترتے ہوئے پایا۔ اخلاقاً حال پوچھا تو وہ شروع ہوگئیں۔

''بھیا حال کیا پوچھتے ہو اب تو اس محلہ میں رہنے کا جی نہیں چاہتا''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا

''شرافت اٹھ گئی''

''آخر کیا ہوا''

''اب ہونا کیا رہ گیا ہے۔ اس گنجیڑی نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اپنی رکھیل کو الگ نہ

کرے گا چاہے باپ مرے یا جیئے۔ چاہے محلّہ کی برکت اٹھے یا رہے۔ موا کہتا ہے کہ نکاح کیا ہے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ اب بھلا اس کو کون بتائے کہ گناہ کے بارے میں وہ زیادہ جانتا ہے یا مولبی صاحب"۔

میں نے کہا۔ "گناہ کے بارے میں تو خیر سے مولوی صاحب ہی زیادہ جانتے ہونگے، محمود خان تو بے چارہ ثواب کے چکر میں پھنس گیا ہے"۔

سلمٰی آپا نے مجھے کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ انہوں نے اپنے گال پر تماچے مار کر توبہ توبہ کیا پاندان کھٹ سے بند کیا اُٹھیں اور بغیر کچھ بولے باہر چلی گئیں۔

نجمہ سے آنکھیں ملانے کی ہمت مجھ میں نہ تھی، وہاں سے کھسکنے لگا تو اس نے آواز دی

"سُنئے"

"کیا ہے"۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا

"مجھے کچھ دنوں کیلئے امّی کے یہاں بھیج دیجئے میری طبیعت بہت گھبرا گئی ہے، آپ مجھے جینے نہ دیں گے"۔

"بھئی تمہیں جانا ہو تو شوق سے جاؤ، مگر میں نے کون سا قصور کیا ہے"

"قصور میری قسمت کا ہے کہ آپکے پلّے باندھ دی گئی"

اتنا کہہ کر اس نے سسکنا شروع کر دیا

مجھے اس پر پیار آ گیا۔ کچن میں داخل ہو کر اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پوچھے اور وعدہ کیا کہ اب آئندہ محمود خان یا اس کی بیوی جمیلہ پر کوئی رائے زنی نہ کروں گا اور نہ ہی مولوی جمن پر تنقید۔ بڑی دیر تک چکارا، پھسلایا، گدگدایا۔ تب جا کر اس کے یاقوتی لبوں پر ہلکی نشیلی مسکراہٹ رینگی اور اس نے اپنی نازک نازک انگلیوں سے اٹھا کر ایک گلاب جامن میرے منہ میں ٹھونس دیا،

دوسرے دن اتوار تھا۔ میں ڈھیر سارے رسالے اور اخبارات آگے پیچھے ڈالے آرام کرسی پر بیٹھا اطمینان سے مطالعہ میں غرق تھا کہ باہر سے شور وغل سنائی پڑا۔ میں یہ دیکھنے کیلئے کہ معاملہ کیا ہے بالکنی میں گیا۔ نجمہ بھی وہیں آ گئی۔ گلی میں کافی بھیڑ تھی، لوگ زور زور سے باتیں

کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے ہم نے اندازہ لگایا کہ معاملہ محمود خان اور جمیلہ سے متعلق ہے۔ نیچے رمضانی پان والا کھڑا تھا، میرے پوچھنے پر اسنے بتایا کہ محمود خان نے جمیلہ کو طلاق دیدی۔ لوگ جمیلہ کو گھر سے نکال رہے ہیں، مولوی صاحب نے حکم دیا ہے۔

میں نے زور سے دانت پیس لیا، جی چاہا کہ جا کر محمود خان کو اتنے جوتے ماروں کی شکل بگڑ جائے اور ساتھ ہی ساتھ مولوی جمن کو بھی، مگر نجمہ پاس کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ مجھے اپنا وعدہ یاد آ گیا تلملا کر رہ گیا۔ اتنے میں کئی لوگ جمیلہ کو گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر لائے۔ بھیڑ اور بڑھ گئی۔ دیکھتے دیکھتے سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ جمیلہ دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ گھسیٹنے والے ہنس رہے تھے فقرے کس رہے تھے۔ انہوں نے لا کر اسے سڑک پر ڈال دیا۔

میں نجمہ کے تأثرات جاننے کے لئے اس کی طرف مُڑا مگر وہ وہاں تھی ہی نہیں۔ نہ جانے کب اور کہاں غائب ہو گئی تھی۔

یکا یک شور تھم گیا۔ میں نے باہر دیکھا تو نجمہ کو سڑک پر ننگے پیر بھاگتے ہوئے پایا۔ لوگ گھبرا کر اُسے دیکھنے لگے تھے۔ وہ دوڑی دوڑی جمیلہ کے پاس پہنچی۔ اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ ساری بھیڑ دم بخود ہو کر یہ ڈرامہ دیکھنے لگی۔ کسی کو روکنے یا کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ بھلا سٹی مجسٹریٹ کی بیوی کو کون ٹوک سکتا تھا۔ سارے محلہ میں ہمارا دبدبہ تھا۔ اس نے لا کر جمیلہ کو میرے سامنے کھڑا کر دیا اور سسکتی ہوئی بولی۔

"یہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ اِس دنیا میں ان کا اب کون ہے۔ اللہ مولوی جمن سے سمجھے جنہوں نے اسے گھر سے بے گھر کر دیا"۔

میں حیرت سے نجمہ کو دیکھنے لگا۔ وہ رو رہی تھی مگر اس کے چہرے پر ایسا جلال تھا جس کی تاب میری گنہگار آنکھیں نہ لا سکیں اور جھک گئیں۔

(جنوری ۱۹۸۰)

واپسی

صلاح الدین عمرانی نے اپنی سرخ رنگ کی ماروتی کار کو یوٹرن کیا اور تھری فیز کاٹج میں داخل کر دیا۔ یہ کاٹج اس نے چند سال قبل شہر کی پوش لوکلٹی میں بنوایا تھا۔ اس کے اجداد سالہا سال سے محلہ جمال پور کی ایک گلی میں رہتے آئے تھے۔ صلاح الدین عمرانی کا بچپن اس گلی میں گزرا تھا جہاں مکانات ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ کھڑکیوں سے کھڑکیاں اور دروازوں سے دروازے منہ در منہ شاہد و مشہود بنے رہتے تھے۔ چائے کی پیالی کہیں ٹوٹتی تو پڑوسی کا بچہ اپنے گھر میں مار کھا جاتا۔ ریڈیو پر پریتم آن ملو کی آواز کے ساتھ تفسیر قرآن پاک کی آواز کچھ اس طرح مدغم ہو جاتی کہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ کون سی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو، دال کی بگھار، تلے ہوئے مرچوں کی تیزی، تازہ پکی ہوئی روٹیوں کا سوندھا پن اڑ اڑ کر تمام گھروں میں جھانک آتا۔ گندے باتھ روم کی بدبو اور پسینے میں بسے کپڑوں کا تعفن بھی پڑوسیوں کی مشترکہ روایت تھی جسے وہ سب ہنسی خوشی مل جل کر بانٹتے تھے۔ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں اتنی ہی سرعت سے شریک ہوتے تھے جتنی سرعت سے خوشبوئیں اور بدبوئیں ایک دوسرے کے گھروں میں

درآتی تھیں۔شام ہوتے ہی محلّہ کے مختلف نکڑوں پر کباب اور تکّے کی لاریاں لگ جاتیں اور توے اور کڑاھیوں سے اٹھ کر دھواں پھیلتا ہوا مسجدوں کی دہلیز پر پہنچ جاتا اور نماز مغرب میں مشغول نمازیوں کے نعلین چوم کر واپس آجاتا۔

صلاح الدین عمرانی نے ، جواُن دنوں صلاحو ہوا کرتا تھا، اسی گلی میں آنکھ کھولی تھی اور بچپن نیز لڑکپن کی حدوں کو وہیں پار کیا تھا۔اسی گلی میں وہ کھیلا تھا، اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے گلے ملا تھا ان سے مار پیٹ کی تھی۔عید میلاد کے جلوسوں میں علم لے کر چلا تھا محرّم کی مجلسوں میں ماتم کیا تھا، عرس میں درگاہ مقدس کے غسل میں شریک ہوا تھا۔نہایت خلوص واحترام کے ساتھ رمضان کے روزے رکھا تھا اور پورے جوش وخروش کے ساتھ عید منایا تھا اور ان معمولات اور حرکات میں اس کے والدین کی تربیت تو شامل تھی ہی لیکن محلّہ کی مشترکہ تہذیب کی جلوہ گری زیادہ تھی۔آپس میں گتھی ہوئی محلّہ کی مختلف الاشکال روایت وتہذیب سے صلاح الدین عمرانی کا خمیر اٹھا تھا۔حاجی کمال الدین کی وفات کے بعد کاروبار اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ صلاحو سے صلاح الدین بنا اور پھر صلاح الدین عمرانی ہوگیا۔اس نے اپنی محنت ولگن سے تجارت میں چار چاند لگا دیئے۔اللہ جب نواز نے پر آئے تو اس کی حد ہے نہ حساب۔دیکھتے دیکھتے صلاح الدین آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا۔جب تک والدہ حیات تھیں اقدار کی فصیل اس کی محافظ تھی لیکن ان کے انتقال کے بعد حفظ وامان کی یہ دیوار ڈھے گئی اور وراثت میں ملے ان تین کمروں کا مکان صلاح الدین کے لئے کسر شان ہوگیا۔دوسرے گھروں سے آنے والی خوشبوئیں اسے ناگوار لگنے لگیں۔گلی کے نکڑ پر تکّے کی کڑھائی سے اٹھتا ہوا دھواں اس کے اعصاب میں تناؤ اور تنفس میں رکاوٹ پیدا کرنے لگا۔گلیوں میں اچھلتے کودتے شور مچاتے لڑتے جھگڑتے بچے اس کی برداشت سے باہر ہونے لگے۔لنگی اور کرتا پہنے ٹوپیوں میں یہاں وہاں کھڑے بیٹھے لوگ اسے ذلیل وخوار لگنے لگے۔عید میلاد اور محرم کے جلوسوں سے اسے وحشت ہونے لگی۔پرانی قدروں سے اس کا رشتہ ٹوٹنے لگا اور روایت کی چادر تار تار ہونے لگی دھیرے دھیرے وہ مغربی تہذیب کا دلدادہ ہوتا گیا اور محلّہ کی گلیوں اور مسجدوں کے صحنوں سے دور اس کی شامیں کلبوں اور ہوٹلوں میں گزرنے لگیں۔

اور مزاح کی خوبیاں یہ سب ابتدائی ماحول کی دین ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی پاسداری، مذہب سے وابستگی، انسانی رشتوں کی حرمت اور معاشرے سے محبت کا جذبہ ان کی رگ و پے میں سمایا ہوا ہے جس نے ان کی تحریروں کو ابہام، اہمال اور ژولیدگی سے محفوظ رکھا ہے۔ لایعنیت اور لامرکزیت سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ اپنی بات دل نشیں طریقے سے اتنی آسانی سے کہہ لیتے ہیں کہ قاری کو بوریت کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا۔ اس انتخاب میں شامل ان کے افسانے گذشتہ صدی کی آخری تین دہائیوں میں لکھے گئے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے بعد شعروادب میں جدیدیت کا آغاز ہوا۔ ترقی پسند ادب کی مخالفت یا ضد میں بیشتر قلمکاروں نے فیشن پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے افسانے کا تانا بانا بکھیر کر رکھ دیا۔ کتھا، اکتھا بن گئی۔ کہانی کا بنیادی حسن کہانی پن غائب ہوگیا۔ شاعری میں بھی شعوری طور پر غیر ضروری ابہام اور ناموزوں علامتوں کا استعمال کثرت سے ہوا۔ عام قاری اور شعروادب کے مابین دوری بڑھتی چلی گئی۔ بلاشبہہ شعروادب میں تجربے ناگزیر ہیں۔ ان کی راہ مسدود کردی جائے تو ادب کا بہتا ہوا دھارا کیچڑ بن جاتا ہے۔ جدید رجحانات نے شعروادب کو تازگی بخشی اور نیا افق عطا کیا مگر وافر تعداد میں ایسا ادب بھی لکھا گیا جس کا تعلق ادب سے کم تجربے اور اندھی تقلید سے زیادہ تھا۔

شعروادب میں ایک ناپسندیدہ روش یہ رہی کہ نئے لوگوں نے پرانے لوگوں کو یا نیا لکھنے والوں نے پرانے انداز کے لکھنے والوں کو ادب سے خارج قرار دینے کے فیصلے بھی صادر کئے۔ ترقی پسند تحریک نے اپنے پیش روؤں کو Out of Date قرار دیا۔ ان کی تحریروں پر فسردگی کا الزام عائد کیا۔ اس کے بعد جدیدیت کا دور آیا تو انہوں نے ترقی پسند ادب پر الزامات تراشے اب مابعد جدیدیت نے مورچہ سنبھالا ہے۔ غیر ادبی تحریروں کو ادب سے خارج قرار دینا غلط نہیں۔ دوسری طرف گروہ بندی کے ذریعہ اپنے حصار سے باہر کے قلمکاروں کو رد کردینا بھی مستحسن عمل نہیں۔ فن پارہ کی پرکھ لیبل سے نہیں، اس کی فنی خوبیوں کے حوالے سے کی جائے۔ یہ ادب اور قلمکار دونوں کے حق میں بہتر ہے۔

اردو افسانے کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ شاعری کی دیگر اصناف کی طرح اس کی روایت بھی مستحکم نہیں تھی۔ ابھی افسانہ اپنی اٹھان کی طرف گامزن تھا کہ اس پر روایتی، ترقی

اس دن وہ کلب سے رات ڈھلے گھر لوٹا تھا۔ ڈنر بھی کچھ زیادہ ہو گیا تھا اس لئے گرانی تھی نمود سحر سے چند گھڑیاں قبل اس کی آنکھ لگی تھی کہ گلی کی مسجد سے فجر کی اذان فضا میں پھیلتی ہوئی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ جاگ گیا۔ اس نے سر میں شدت کا درد محسوس کیا۔ کچی نیند سے دفعتاً بیدار ہونے کا نتیجہ عموماً دردِ سر ہوتا ہے۔ وہ اپنی پیشانی دبانے لگا۔ مؤذن اذان دیتا رہا۔ الصلوٰۃ خیر من النوم کی آواز پر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب یہ محلّہ چھوڑ دے گا، مکان میں تالا لگا دے گا اور کسی اچھے مہذّب علاقے میں اٹھ جائے گا۔

تھری فیز کا ٹچ اسی حادثہ کے بطن سے وجود میں آیا تھا۔

وہ گھر کے اندر داخل ہوا۔ دونوں بچے ٹی۔ وی۔ دیکھ رہے تھے۔ تیرہ سالہ بیٹی جین کا پتلون جس کے ہپ پر ٹیک می (Take me) لکھا ہوا تھا، پہنے تھی۔ سفید بلاؤز کے اگلے حصّہ پر ڈونٹ بی شائی (Do not be shy) کی پیننگ تھی۔ اس کے بال لڑکوں جیسے کٹے تھے وہ قالین پر دوزانو نصف خمیدہ دونوں ہاتھوں کو رحل بنائے کتاب رُو کو نکائے ہوئے تھی اور پورے انہماک سے اسٹارٹی۔ وی پر پروگرام دیکھ رہی تھی۔ دس سالہ بیٹا تنگ نیکر اور ڈھیلی ڈھالی بنیائن پہنے ہوئے تھا جس پر ہی مین ان میکنگ (He man in making) لکھا ہوا تھا۔ وہ پیٹ کے بل لیٹا ہوا ٹی۔ وی۔ اسکرین پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ صلاح الدین عمرانی کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔ ''ہائے کڈس''

دونوں بچّوں نے چونک کر اپنے باپ کو دیکھا۔

''ہائے ڈیڈ''

''کیا آرہا ہے ٹی۔ وی پر؟''

''بور''۔ بیٹی نے منہ بنایا۔ ''آدھ گھنٹہ سے دیکھ رہے ہیں ہم لوگ۔ ایک بھی کس (Kiss) کا سین نہیں آیا نہ ہی کوئی اموشنل امبریسنگ۔ ایک دم بور۔ اسٹارٹی۔ وی نہ ہوا ریاض ٹی وی ہو گیا''۔

بھائی نے بہن سے اتفاق کیا۔ ''سچ ڈیڈ۔ اس سے اچھا تو زی ٹی وی ہوتا ہے، جوتے کی

ایڈورٹائزمیں بھی اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح عورتوں کے ہپ دکھائی دے جائیں''۔

صلاح الدین عمرانی نے زوردار قہقہہ لگایا۔''فنی چیپس (Funny chaps) بڑی گہرائی سے تم لوگ پروگرام دیکھتے ہو، وہاٹ اے سوائن بوتھ آف یوآر'' (What a swine both of you are)۔پھراس کی نظر دیوار پر آویزاں ایک نئی پینٹنگ پر مرکوز ہوگئی۔

''یہ کون لایا؟''اس نے بچوں سے پوچھا''مم''۔بیٹی بولی۔''اور دیکھئے ڈیڈ کتنی ونڈرفل پینٹنگ ہے۔آپ جو بھی تصور کریں وہی اس میں دکھائی دیتا ہے۔مثلاً آپ یہ تصور کریں کہ دو گدھے گھاس چر رہے ہیں تو آپ کو دو گدھے دکھائی دیں گے اور اگر آپ یہ تصور کریں کہ گدھے نہیں دو انسان ہیں ایک مرد اور ایک عورت اور وہ دونوں ڈانس کر رہے ہیں تو وہی دکھائی بھی دے گا، مم تو یہ بھی کہتی ہیں کہ اگر آپ گہرائی سے یہ تصور کریں کہ وہ دونوں آپس میں.....''

''ہاں سچ''.....اسی وقت اس کی بیوی دوسرے کمرے سے نکل کر آ گئی اور بیٹی کا جملہ اچک لیا.....''میں تو یہی سوچ کر لائی بھی تھی، وہاٹ اے فنٹاسٹک امیجینیشن (What a fantastic Imagination)۔آپ ذرا غور کریں پھر دیکھئے یہ پینٹنگ کیا کنوے کرتی ہے۔پورے دس ہزار روپے دیئے ہیں۔

''نان سنس'' بیٹے نے سارے تصورات پر پانی پھیر دیا۔''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی نے فرش پر رنگ گرا دیا ہے یا دیوار سے پلاسٹر اکھڑ گیا ہے۔دس ہزار روپوں میں تو دو اصلی گدھے خریدے جا سکتے ہیں بلکہ دو اصلی انسان بھی مل جائیں گے''۔

''شٹ اپ.....''ماں نے بیٹے کو ڈانٹ دیا۔''اپنی عمر سے بڑی باتیں مت کرو۔تجریدی آرٹ سمجھنے کی ابھی تمہاری عمر نہیں ہے''۔

صلاح الدین کو محلہ جمال پور کا مکان یاد آ گیا۔اس کے سونے کے کمرے میں آیت الکرسی فریم کی ہوئی لگی تھی جسے اس کے والد کمال الدین حج کی واپسی پر مکہ معظمہ سے لائے تھے۔ان

کا حکم تھا کہ صبح اٹھ کر اسے پڑھو پھر کمرے سے باہر نکلو۔ اِس آیت میں زماں و مکاں سبھی سموئے ہوئے ہیں ۔ یہ ہر مرض کا علاج ہے۔ ابتدا سے انتہا تک کے تمام مدارج اسکے سہارے بخوبی طے ہوتے ہیں ۔ وہ فریم اب بھی وہیں لگا تھا۔ جب کبھی پرانے مکان پر جاتا تو اس فریم پر جمی گرد جھاڑنے کی ہمت وہ اپنے اندر نہ پاتا اور فریم سے نگاہیں چرا لیتا۔ اس فریم پر گرد بہت گہری ہوگئی ہوگی، اس نے سوچا۔

''کہاں کھو گئے تم، بتایا نہیں کہ پینٹنگ کیسی ہے''

بیوی کی آواز پر وہ چونکا۔ ''اچھی ہے لیکن اس گھر میں درجنوں پینٹنگز پہلے سے موجود تھیں''

''تھیں تو۔ لیکن یہ پینٹنگ تصوراتی ہے۔ آپ کے تصور کا ساتھ کوئی نہیں دے سکتا لیکن یہ پینٹنگ دیتی ہے۔ وہاٹ اے کلاسک ورک، ذرا غور سے تو دیکھئے''

''واؤ''

بیٹی کی آواز پر میاں بیوی اُدھر متوجہ ہو گئے

''کیا ہوا؟'' صلاح الدین نے پوچھا

''وہ بھاگ رہی تھی کہ اس کے اسکرٹ کا زِپ کھل گیا''

''وہاٹ اے اسٹپڈ گرل۔ صلاح الدین نے مسکرا کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔ اسی وقت کچھ آوازیں باہر سنائی دیں۔ صلاح الدین کے کان کھڑے ہو گئے، ''یہ کیسی آواز ہے''

چند لمحوں بعد آوازیں تیز ہو گئیں اور ان کی نوعیت شور کی ہوگئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مکان پر پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ ٹوٹ کر فرش پر بکھرنے لگے۔ بچوں نے چیخ مار کر ٹی وی بند کر دیا۔ صلاح الدین نے گھبرا کر باہر کا دروازہ بولٹ کر دیا۔

''کیا ہوا؟'' بیوی نے بوکھلا کر پوچھا

''مجھے یہ بتانے کا موقع ہی نہ ملا کہ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے اسی لئے تو میں آج جلدی گھر آ گیا، پرانے شہر کے زیادہ حصوں میں کرفیو لگا دیا گیا ہے''

''ہم سے کیا مطلب''۔ بیوی نے جھنجھلا کر کہا ''ہم تو مسلمانوں سے دور رہتے ہیں''

''لیکن ہیں تو مسلمان''

''کس طرح؟'' بیوی کی جھنجھلاہٹ میں غصہ در آیا

''میرا نام صلاح الدین ہے اور تمہارا بشریٰ۔ بیٹے اور بیٹی کا نام کٹو اور کٹی بھلے ہی ہو۔''

''آہاہاہا''۔ بیوی نے صلاح الدین کا مذاق اڑایا۔ ''نام سے کیا ہوتا ہے کام تو مسلمانوں جیسا نہیں کرتے۔ یہاں آنے کے بعد کبھی نماز پڑھی، روزہ رکھا، فاتحہ درود کیا، عید بقرا عید منائی، کچھ کیا پندرہ سالوں میں جس سے مسلمان سمجھے جائیں؟''۔

''نہیں'' صلاح الدین نے مری مری آواز میں اعتراف کیا۔

''تو پھر یہ لوگ ہمیں مسلمان کیوں سمجھ رہے ہیں۔ ہمارے بچے ان کے بچوں کے ساتھ گربھا کرتے ہیں ڈانڈیا راس کھیلتے ہیں ڈراموں میں رادھا کرشن بنتے ہیں۔ جیسیس اور میری کارول ادا کرتے ہیں کونونٹ میں پڑھتے ہیں۔ اسکرٹ چڈی پہنتے ہیں انگریزی بولتے ہیں اتنا ثبوت دینے کے باوجود بھی یہ لوگ ہمیں مسلمان سمجھتے ہیں اور ہم پر حملہ کرتے ہیں۔ ارے ہم تو مہینوں تک گوشت مچھلی نہیں کھاتے اس حد تک مصالحت کر لی ہے''۔

اسی وقت ایک بھاری پتھر کھڑکی کے شیشے کو توڑتا ہوا ٹی۔ وی کیبنیٹ پر گرا اور اسے چکنا چور کر گیا۔ ساتھ ہی ساتھ دروازے پر شدید ضربیں پڑنے لگیں۔ آوازوں کا زور بڑھ گیا۔ ''جلا دو پھونک دو'' دفعتاً ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے آگ کا ایک گولا آ کر صوفے پر گرا۔ کور میں آگ لگ گئی۔ چاروں کی آنکھوں میں موت رقص کرنے لگی۔ بیٹی ماں کی اور بیٹا باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

صلاح الدین کاٹج کے پچھلے دروازہ کی طرف سب کو لے کر بھاگا۔ وہ باہر نکلا ہی تھا کہ دیکھا اس کا پڑوسی اجیت پانڈیا بندوق لئے وہاں کھڑا ہے۔ ان چاروں کے قدم زمین پر جم گئے۔

''تم۔ تم۔ ہماری جان بخش دو۔ گھر جلا دو، لوٹ لو سارا سامان لیکن ہمیں جانے دو''۔

صلاح الدین رو پڑا اور اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی رونے لگے۔ اجیت پانڈیا آگے بڑھا۔ اس نے صلاح الدین کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''گھبراؤ نہیں جلدی سے میری کار میں جا بیٹھو میں تم لوگوں کو لینے ہی آ رہا تھا۔''

صلاح الدین نے مشتبہ نگاہوں سے اپنے پڑوسی کو دیکھا۔ اجیت پانڈیا نے اس کی پیٹھ

تھپتھپائی ۔''جلدی کرو۔تم اسٹیرنگ سنبھالو ۔ بچے اور بھابی پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔جب تک تم لوگ کار میں نہیں جاتے میری بندوق تم سب کی حفاظت کرے گی۔میں بارہ آدمیوں کو ماردوں گا۔ہری اپ''

وہ چاروں کار میں جا گھسے ۔صلاح الدین نے کار اسٹارٹ کی تو اجیت پانڈیا بھی لپک کر آیا اور اگلی سیٹ پر صلاح الدین کے پاس بیٹھ گیا۔اس نے بندوق کی نال باہر نکال لی۔کار چلی۔اسی وقت ایک دھماکہ ہوا اور تھری فیز کاٹج شعلوں میں لپٹ گیا۔

نیند رات بھر نہیں آئی ۔آتی بھی کیسے ۔شعلوں میں لپٹا تھری فیز کاٹج اور پچھلے دروازے سے نکل بھاگنے کا عمل اور اجیت پانڈیا کا اپنی جان پر کھیل کر انہیں بچانے کا عظیم کارنامہ اور پھر محلہ جمال پور کی اس گلی میں موروثی مکان میں صحیح وسلامت آجانا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا کہ وہ آرام سے سو جاتا۔وہ جاگتا رہا۔سرہانے آیت الکرسی کا کتبہ اب بھی لگا تھا۔زیرو بلب کی ملگجی روشنی میں اس فریم پر اپنی نگاہیں گاڑے وہ لیٹا تھا۔رات سرک رہی تھی ، کرفیو لگا ہوا تھا۔باہر فضا بوجھل تھی لیکن اندر کا ماحول گھٹن سے پاک تھا۔دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک اور دل کی دھک دھک نئی زندگی کی بشارت دے رہی تھی۔اس کی بیوی پاس لیٹی بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔دونوں بچے نیند کی آغوش میں سرِشام چلے گئے تھے لیکن وہ جاگ رہا تھا۔اندر کہیں سے آواز آرہی تھی ۔زندگی لمحات کا مجموعہ ہے ، ان لمحوں کا ہر وقت تجزیہ کرتے رہو۔ایک ایک لمحے کا حساب مانگا جائے گا۔وہ لمحات جوان پابند گلیوں میں گزرے ہیں وہ الگ کھاتے میں ہیں اور جو تھری فیز کاٹج کی آزاد فضا میں بیتے ہیں وہ الگ کھاتے میں ہیں اور وہ لمحات جو اِس وقت سانس کی آمد و رفت کا اشاریہ ہیں ان کی الگ شناخت ہے۔ایک لمحہ کی خطا پر صدیوں کو سزا ملتی ہے ۔صرف ایک لمحہ زندگی کا نقشہ بدل دیتا ہے۔کسی مخصوص لمحے کو گرفت میں لینے کا نام معراج ہے اور چھوڑ دینے کا زوال ہے۔

وہ جاگتا رہا اور آواز سنتا رہا۔پرانے وقت کی گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی ۔سوئی اس کی کس نمبر پر تھی یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔زیرو بلب کی روشنی واضح نہیں کر پا رہی تھی۔اس نے ہاتھ بڑھا کر اس الارم گھڑی کے بٹن کو دبانا چاہا جس میں وقت کی آواز بند تھی۔بٹن دبایا اور آواز آئی ''صبح کے پانچ بج رہے ہیں'' لیکن وہ گھڑی وہاں نہ تھی ، وہ تو تھری فیز کاٹج میں تھی اور اب وہ جل چکی ہوگی اور اس کے

اندر بیٹھی ہوئی عورت مر چکی ہوگی۔ اس نے ہاتھ سمیٹ لیا۔ اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ مزے سے سو رہی تھی جیسے برسوں کی نیند ذہن کے ایک گوشے میں چھپائے ہوئے تھی اب تک اور اس گلی میں آ کر خراج وصول کر رہی تھی۔ وقت جاننے کی خواہش نے شدت اختیار کی اور وہ اٹھ کر بلب جلانے ہی والا تھا کہ گلی کی مسجد سے مؤذن نے فجر کی اذان دے دی۔ اللہ اکبر۔

برسوں پہلے کی بات تھی۔ یہی لمحہ تھا جب اس نے خطا کی تھی اور پھر سزا کا مستحق ہوا تھا۔ آدم کا قصور بھی ایک لمحہ کا تھا اور ابلیس نے بھی بس ایک لمحہ کی خطا کی تھی دونوں اپنے اپنے مقام سے گرادئے گئے تھے۔ قادر المطلق کا حساب کھرا ہوتا ہے۔ وہ ڈھیل دیتا ہے۔ دیتا چلا جاتا ہے اور جب رسّی کھینچتا ہے تو صدیوں کا حساب پل میں کر لیتا ہے۔

مؤذن کی مقدس آواز کے ساتھ فیصلہ کن لمحہ پھر آیا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ الماری کے دراز سے برسوں پرانی وہ ٹوپی جسے صلاحو پہنا کرتا تھا ڈھونڈ کر نکالی۔ اسے سر پر رکھا اور دبے قدموں سے باہر جانے لگا کہ بیوی کی آواز آئی..... ''وضو گھر سے کر کے جاؤ ثواب زیادہ ملے گا''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے سر کو دوپٹہ سے منڈھ لیا تھا۔ صلاح الدین نے اسے غور سے دیکھا۔ کیا یہ وہی عورت ہے جو ابھی کل دس ہزار روپئے میں ایک ایسی پینٹنگ خرید کر لائی تھی جس میں عریاں مرد و عورت کے اتصال کا تصور ابھرتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اپنی بیوی کو دیکھتا رہا جو گردن جھکائے دوپٹے کے کونے سے اپنی تر آنکھیں خشک کرتی چلی جا رہی تھی۔ صلاح الدین کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ جذبات سے مغلوب وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ غسل خانے میں جاتے ہوئے اس کی نظریں دوسرے کمرے میں لیٹے اپنے بچّوں پر پڑیں۔ دونوں ایک دوسرے مین گڈمڈ گہری نیند سو رہے تھے۔ حی علی الصلوٰۃ۔ مؤذن آواز دے رہا تھا۔ منہ در منہ گھروں میں روشنی ہونے لگی تھی اور اندرون خانہ چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔

صلاح الدین نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ تھری فیز کاٹج جل جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور وضو کے لئے حمام میں داخل ہو گیا۔

(دسمبر ۱۹۹۶)

کلجگ کا آشرم

سوریہ سوامی نے اپنے سکریٹری سے کہا

''اگلا منتری''

سکریٹری نے ہاتھ جوڑ لئے۔''سوامی جی آج کی لسٹ میں اب کوئی منتری باقی نہیں رہا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے''؟ابھی تک تو صرف دس بارہ منتری ہی آئے جب کہ اپنے دیش میں سنٹرل اور اسٹیٹ منسٹروں کی تعداد ۵ سو سے کم نہیں''۔

سکریٹری نے بدستور ہاتھ جوڑے رکھا۔''سوامی جی ستیہ وچن لیکن آج صرف سنٹرل منسٹروں کا دن تھا۔اسٹیٹ منسٹروں کے لئے الگ الگ دن باندھ رکھا ہے آپ نے''

''لیکن سنٹرل منسٹر بھی ساٹھ سے اوپر ہیں ان میں سے کتنے آئے؟ کیا میری آنچ مدھم ہو رہی ہے یا منتریوں کی سمتائیں کم ہو رہی ہیں''؟

''نہیں سوامی جی دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔صحیح بات یہ ہے کہ جب سے آپ کا نام اُس کے ساتھ جوڑا جانے لگا ہے لوگ بدکنے لگے ہیں۔''

''کس کے ساتھ؟ پرمیلا کے؟''

سکریٹری آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرایا۔

''نہیں سوامی جی۔ اِس قسم کی جوڑ توڑ تو عام بات ہے۔ اسّی فیصد نیتا کسی نہ کسی سے جُڑے ہوئے ہیں۔ عورتوں سے جُڑنا تو آج کا اسٹیٹس سمبل ہے۔ اس کے علاوہ آپ ہی اکیلے پرمیلا سے تھوڑے ہی بندھے ہیں کئی دوسرے جانے مانے منتری گنٹر بھی ہیں اُس زلف گرہ گیر کے اسیر۔''

سوامی جی مسکرا اٹھے

''تم اردو بھی بول لیتے ہو''

سکریٹری کھُل کر مسکرایا

''یہ ظالم زبان ہی ایسی ہے۔ اوپر سے گالیاں تو دیتا ہوں اسے لیکن ''بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر''

سوامی جی ہنس پڑے۔ سکریٹری بولا۔

''آپ نے جب سے سنسار کا موہ تیاگا اور دیوان چند سے سوریہ سوامی بنے، بھوپال سے دلّی آئے جانے کتنی پرمیلائیں آئیں اور گئیں لیکن آپ کی سادھنا پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ لوگ اسی طرح آپ کے درشن کو ترستے ہیں اور مَن برستے ہیں''۔

سوامی جی نے پیار سے اپنے سکریٹری کو دیکھا

''پھر کس نام کا ذکر رہے تھے تم؟''

''ارے وہی شاٹ گن اسکینڈل''

سوامی جی کے چہرے کا تیج کجلا گیا اور پیشانی پر تین متوازی لکیریں لہرا اٹھیں

''دیکھ لینا سب کو پھونک ڈالوں گا''۔ وہ پھنکارے۔ منہ لگا سکریٹری سوامی جی کے قریب کھسک آیا اور ان کا ہاتھ دباتے ہوئے بڑی رازداری سے بولا۔ ''لیکن سوامی جی ایک بات ہے''

''وہ کیا؟'' سوامی جی تھوڑا نرم پڑے۔ پیشانی کی لکیریں مدھم ہوگئیں۔ سکریٹری بولا یہ ''منتری لوگ اگلے دروازہ سے آتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں پکڑ نہ لئے جائیں''۔

سوامی جی پھر بھڑ کے۔ ''کون پکڑے گا۔ سالے اے بی سی والے؟''

''شی'' سکریٹری نے سوامی جی کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''دھیرج رکھئے اے؛ بی سی والے تو آپ کی لنگوٹ چھو کر ترقی پا جاتے ہیں۔ ان کی بات نہیں۔''

''پھر''؟

''یہ پریس اور میڈیا والے کچھ نئے لڑکے کچھ نئی لڑکیاں جو جینس کا پتلون اور کھدر کا کرتا پہنے اور کندھے سے جھولا لٹکائے ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہر آن اگلی پچھلی باتوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ سوں سوں ماحول سونگھتے ہیں اور کیمروں کا بٹن دباتے رہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں جیب میں رکھے منی ٹیپ ریکارڈر کو یہ لوگ ہمیشہ آن رکھتے ہیں۔ یہ ایک بڑی خطرناک قوم پیدا ہوگئی ہے اس ملک میں۔ انہیں نہ تو ریت کی فکر ہے نہ میت کی نہ پریت کی۔ انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تپسیا کیا ہے۔ بھگتی کیا ہے سادھنا کیا ہے، گیان کیا ہے اور گیان کا سوتر کہاں ہے۔ یہ تو بس دھر پکڑنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ آج منتری کل ودھایک، پرسوں سادھو مہاتما، نرسوں جوگی اور ترسوں امام صاحب قبلہ۔ کسی کو بھی یہ پتلون اور کرتا پہنے اور کھدر کا جھولا لٹکائے نئی نسل نہیں چھوڑتی۔''

''مائی فُٹ'' سوامی جی نے نفرت سے کہا۔ سکریٹری نے اپنی بات جاری رکھی۔

''ان کی ڈر سے منسٹروں نے اگلے دروازہ سے آنا چھوڑ دیا۔''

''تو آشرم کے پچھلے دروازے کھول دو''۔ سوامی جی نے مشورہ دیا سکریٹری نے ہاتھ دبانا بند کر دیا۔

''لیکن یہ جھولا لٹکوئے پہلے ہی سے بند دروازے پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔''

''مائی فُٹ''

سکریٹری خاموش ہوگیا۔ سوامی جی پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے چند لمحوں بعد وہ دبے دبے لہجے میں بولے۔

''تو یوں کرو کہ بھگتوں سے کہدو کہ فون پر بھوشیہ کا گیان اور شبھ گھڑیوں کا پتہ کر لیا کریں جنم کنڈلیاں اور ہست ریکھاؤں کے پرنٹ اپنے بلیک کیٹ کے ذریعہ بھیج دیا کریں خود نہ آئیں۔''

''لیکن اس میں بھی ایک مصیبت ہے''

''اب کیا؟''

''وہ یوں کہ فون والے بھی جینئس کیٹیگری کے لوگ ہیں۔انہوں نے اپنے سسٹم میں اتنا عمدہ انتظام کر رکھا ہے کہ آپ فون ایک جگہ لگائیں تو کئی جگہ مل جاتا ہے۔اس طرح آپ اپنے بھگتوں سے بات کرتے وقت لال چندللومل سے بازار بھاؤ اور گوپی ناتھ سلیکھیا اور اس کی رکھیل میں ہونے والی وارتالاپ بھی سن سکتے ہیں اور جب آپ سن سکتے ہیں تو اپنی بات سنا بھی سکتے ہیں۔ ٹیلی فون محکمہ کی مساوات اور معاملہ فہمی بے مثال ہے۔اس کے علاوہ خفیہ ایجنسی والے فون ٹیپ بھی کرتے ہیں یہ بات الگ ہے کہ وہ آپ کی بات ٹیپ کرنا چاہیں تو گودی لال منتری اور کیمرے ڈانسر پرمیلا کی بات بھی ریکارڈ ہو جاتی ہے۔''

سوامی جی جز بز ہو گئے۔''تم پھر پرمیلا کی بات بیچ میں لائے''

سکریٹری ہنسنے لگا۔''نہیں وہ تو ایسے ہی''

سوامی جی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔انہوں نے پہلو بدلا۔پھر بولے۔

''تو پھر ممبر آف پارلیمنٹ کو ہی آنے دو''۔

آسن کے پاس دیوار میں بڑی نفاست سے الکٹرک سوئچ بورڈ لگا تھا۔سکریٹری نے ایک سوئچ آن کیا فوراً دروازے کے باہر لگی لال بتی بجھ گئی اور ہری جل اٹھی۔وہاں پہرے پر بیٹھا چیلا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔''ساؤدھان''

ویٹنگ روم میں آرام دہ صوفوں میں نیم غنودگی کے عالم میں دھنسے عوام کے نمائندے بیدار ہو گئے۔رسپشن پر بیٹھی نازک اندام خوبصورت لڑکی نے اپنے پلے بڑھے ناخنوں کو ہیر پن سے صاف کرنا بند کر دیا۔اس کے سامنے ناموں کی فہرست تھی۔اس نے لال پینسل اٹھائی اور ایک نام کا احاطہ کرتے ہوئے بولی۔

''شری گوردھن داس جھٹپٹیا اندر جائیں۔''

گوردھن داس جھٹپٹیا مشرقی علاقے کا نمائندہ تھا اور ۳۸ لاکھ روپئے خرچ کر کے تین سو

پسند اور جدیدیت کے لیبل لگنے شروع ہو گئے۔ ہماری کلاسیکل شاعری تو بڑے سے بڑے وار کو جھیل گئی مگر افسانہ لہولہان ہو گیا۔ کم سے کم وقت میں شہرت اور انعام واکرام بٹورنے کے لئے غیر ادبی ہتھکنڈوں کا استعمال بھی کثرت سے ہوا۔ نقاد خوش تھے کہ فنکار ان کی انگلی پکڑ کر چل رہے ہیں اور ہر قدم ان کی مرضی کے مطابق اٹھایا جا رہا ہے۔ جن لوگوں نے نقادوں کی بنائی روش یا فارمولا قبول کرنے سے انکار کیا انہیں دیس نکالا ملا۔

سید ظفر ہاشمی نے فیشن زدگی کو نہیں اپنایا۔ نجی زندگی اور ادب کے معاملے میں ان کے یہاں تضاد نہیں۔ وہ زبان و ادب کو مذہب و اقدار سے نہ صرف قریب رکھنا چاہتے ہیں، عوام کی تربیت بھی اس نہج سے چاہتے ہیں کہ وہ زبان اور ادب کو مذہبی اور اخلاقی اقدار کے حصار سے باہر نہ جانے دیں۔ یہی ان کا نصب العین ہے۔ ان کے نزدیک کسی بھی زبان میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے قصے، کہانیاں اور افسانے پہلی سیڑھی ہیں کہ انہیں پڑھنے کے بعد ہی دوسری اصناف ادب سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اپنے رسالہ گلبن میں بھی انہوں نے اپنے اس موقف پر زور دیا۔ ہاشمی نے ۱۹۹۰ء میں اردو کے چند عمدہ افسانوں کا انتخاب قارئین کے سامنے بھی پیش کیا۔ بعد میں گلبن کے اس خصوصی نمبر کی کہانیاں کتابی شکل میں شائع کیں۔ ہاشمی کے افسانوں کے تعلق سے ان کا یہ موقف بھی ذہن نشیں رکھنا ہوگا۔

سید ظفر ہاشمی نے اپنی صحافتی اور ادبی نگارشات کے معاملے میں نہ اندھی تقلید کی راہ اپنائی اور نہ خود کو بھیڑ میں گم کیا۔ نہ ستائش کی تمنا کی نہ صلے کی پرواہ۔ انہوں نے کسی اور کی طرح نہیں، اپنی طرح لکھنا قبول کیا۔ جس واقعہ یا حقیقت نے، احساس یا خیال نے ان کے دل کے دروازے پر دستک دی، انہوں نے بلا جھجک اس پر دروازہ وا کیا۔ نہ کسی کا انداز مستعار لیا نہ آہنگ۔ اپنا در اپنی آواز میں اپنے انداز سے کچھ اس طرح پیش کیا کہ وہ اپنی ہر تحریر میں موجود ہوتے ہوئے بھی اپنی تخلیق سے ضروری فاصلہ قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ تحریر کی روانی کچھ ایسی کہ مانو آب رواں۔

ہاشمی کے افسانے Decode کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کسی کنجی یا تجزیہ کے بھی محتاج نہیں البتہ یہ قاری سے اس بات کے ضرور متقاضی ہیں کہ انہیں بالواسطہ پڑھا جائے۔ یہ افسانے بیانیہ کا حسن ہیں ان میں کوئی پیچیدگی ہے نہ الجھاؤ۔ افسانوں کا نظام ضرور پرانا ہے، جسے یار لوگ

بارہ ووٹوں سے جیتا تھا۔ وہ صوفے سے تین بار اچھلا لیکن اس کا بھاری بدن دھنسا کا دھنسا رہا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہاں کھڑا چپراسی لپکا اور ''زور لگاؤ ہیا'' کہہ کر اسے اٹھا دیا۔ جھٹپٹیا کو یہ بات تو پسند آئی کہ چپراسی نے اٹھنے میں اس کی مدد کی لیکن ''زور لگاؤ ہیا'' کا نعرہ اسے برا لگا گویا وہ کوئی انسان نہ تھا بلکہ لکڑی کا کندا تھا جسے مزدوروں نے کھسکایا ہو۔ کوئی اور موقع ہوتا یا کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ اس چپراسی کی خوب خبر لیتا لیکن یہاں وہ مجبور تھا۔ سوامی جی کے چپراسی کو کچھ کہنے کی ہمت تو پردھان منتری میں بھی نہ تھی وہ تو صرف ایک ایم. پی. تھا وہ بھی تین سو بارہ ووٹوں سے جیتا ہوا۔ وہ اندر ہی اندر کھولتا ہوا اور اپنے بھاری بدن کا بوجھ گھسیٹتا ہوا کمرہ کے اندر داخل ہو گیا۔

''کیا سمسیا ہے مہاراج''۔ سوریہ سوامی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا جھٹپٹیا بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ہم کا منتری منڈل میں نا ہیں لیا گوا''

''کیوں؟ آپ پڑھے لکھے نہیں تھے اس لئے؟''

جھٹپٹیا سٹپٹایا۔ ''نہیں سوامی جی ای بات نہیں۔ پڑھائی لکھائی ہمارے دیش میں منتری بننے کے لئے ضروری نہیں یہ سب بے کار چیزیں تو صرف نوکری چاکری میں کام آتی ہیں''۔

''پھر''؟

بات ای ہے سوامی جی کہ پردھان منتری جی کہتے ہیں کہ ہماری جات کے کئی لوگ منتری منڈل میں آ گئے۔ وہ سب جاتوں کو ان کی آبادی کے حساب سے لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اب صرف جنگل باسی رہ گئے ہیں''۔

جنگل باسی؟ ارتھ تھ۔؟

سکریٹری نے جھٹ پٹ وضاحت کی۔ ''نیتا جی شیڈول ٹرائب کی بات کر رہے ہیں''۔

''اچھا۔ اچھا تو؟''

تو ہم کا ای سرٹیفکٹ دے دیں کہ ہم پچھلے جنم میں اُو رہن''

''یعنی شیڈول ٹرائب؟''

ہاں ۔ وہی ۔ اور ای تو آپ ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم پچھلے جنم میں کا رہن ۔ آپ کی بات پردھان منتری جی مان لیں گے'' اتنا کہنے کے بعد جھٹپٹیا یک جوش میں آ گیا۔

'' ارے آپ تو اگر کہہ دیں کہ ہم پچھلے جنم میں سور رہیں تو بھی پردھان منتری مان لیں گے۔ وہ آپ کے پکّے اور سچے بھگت ہیں ۔''

'' وہ تو ہے'' سوامی جی نے فخر سے اپنے سکریٹری کو دیکھا چپکے سے آنکھ بھی ماری

'' تو پھر کرپا کریں'' جھٹپٹیا نے ہاتھ جوڑ لئے۔ پھر چھوڑ دئے اور کرتے کی دونوں جیبوں سے نوٹوں کی دو دو گڈیاں نکالیں اور انہیں سوامی جی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

'' ایک لاکھ ہے اسے سویکار کریں اور بنا دیں''

'' کیا؟ ۔ سور؟''

'' نہیں جنگل باسی ۔ اتنے سے کام چل جائے گا ۔ نہ چلے گا تو ہم بتائیں گے''

سوامی جی نے نوٹوں کی دونوں گڈّیوں کو تھامتے ہوئے کہا '' ٹھیک ہے بنا دیں گے''

جھٹپٹیا نے پھر ہاتھ جوڑے ۔ اٹھا اور الٹے قدم کمرے سے باہر نکل گیا ۔ اس کے جانے کے بعد ایک دوسرا شخص اندر داخل ہوا۔

'' میرا نام لڈّو لال کھٹپٹیا ہے'' ۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اپنا تعارف کرایا۔

'' کیا پرابلم ہے؟''

'' مجھے اپنے علاقہ کی ترقّی کے لئے دو کروڑ روپے ملے ہیں ۔ کرپا کر کے یہ بتائیں کہ اس روپے میں میرا حق کیا بنتا ہے اور جنتا کا کتنا بنتا ہے''

سوامی جی نے ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ '' ہُشت ۔ جنتا کیا چیز ہے تم کو دیا ہے تم اپنے پاس رکھو۔ جنتا کا بیچ تو یوں ہی لگا دیا ہے سرکار نے'' ۔

کھٹپٹیا نے دانت نکالے۔ '' تو پردھان منتری سے کہہ دیں پوچھ گچھ نہ کریں۔''

'' کہہ دوں گا ۔ اطمینان رکھو ۔ ویسے پردھان منتری ایسے معاملے میں نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں نہ دیکھتے ہیں'' ۔

کھٹپٹیا خوش ہو گیا۔ ''دھنیہ ہو، دھنیہ ہو مہاراج۔ آپ کا یش بڑھے''۔ اتنا کہہ کر اس نے بھی اپنے کرتے کی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی بولا۔ ''پچاس ہزار ہیں۔ اِسے سویکار کریں'' سوامی جی مسکرائے۔ گڈی پکڑی بولے۔ سویکارا آپ جائیں۔ کھٹپٹیا اٹھا اور الٹے پاؤں کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی ایک تیسرا شخص اندر داخل ہوا۔

جے ہو سوامی جی۔ میرا نام ہے نارائن راؤ پلّے

''پلّے کہ پلّا''

''پلّے''

''ٹھیک ہے کیسے کشٹ کیا''

''میری بیوی بھاگ گئی ہے''

''یہاں تو نہیں آئی''

''وہ میرے ڈرائیور کے ساتھ بھاگی ہے''

''بیوقوف تھی۔ اگر ایک ڈرائیور کے ساتھ ہی بھاگنا تھا تو میرے ڈرائیور کے ساتھ بھاگی ہوتی۔ میں سنبھال لیتا۔ خیر۔ تو میں کیا کروں''؟

''کرپا کر کے پتہ لگائیں کہ وہ کس منتری کے پاس ہے تاکہ میں اس منتری سے ایک پٹرول پمپ الاٹ کروانے کی بات کر سکوں۔''

''ٹھیک ہے کل آجانا۔ اتا پتہ سب بتا دوں گا۔ پر دکھنا؟''

''یہ رہی'' نارائن راؤ پلّے نے بھی قمیص کی جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور اسے سوامی جی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اسے Accept کریں جی۔''

Accept کیا۔ سوامی جی نے مسکرا کر بنڈل پکڑ لیا۔ پلّے بھی واپس آ گیا اور اس کے جاتے ہی جینس کا پتلون اور کھدر کا کرتہ پہنے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔

سوریہ سوامی نے اسے غور سے دیکھا

''کیا چاہتی ہو''

''میں ایم. پی. بننا چاہتی ہوں۔''

''یعنی تم ایم. پی نہیں ہو؟''

''نہیں''

''ایم. ایل. اے. بھی نہیں''

''نہیں''

''ایم. ایل. سی. بھی نہیں''

''نہیں''

''اسمگلر بھی نہیں''

''نہیں''

''مافیا ڈان بھی نہیں''

''نہیں''

''تو پھر کس طرح آئیں'' سوامی جی چیخے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ اس آشرم میں بغیر کسی کوالی فیکشن کے قدم رکھو۔ تم کو آنے کس نے دیا؟ سکریٹری''

''جی سوامی جی'' سکریٹری ڈر گیا''

''اِس چھوکری کو دھکے مار کر باہر نکالو''

سکریٹری دانت پیستا ہوا اس لڑکی کی طرف بڑھا لیکن وہ لڑکی مڑی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر جاتے ہی سکریٹری کو جھٹکا لگا

''سوامی جی''

''کیا ہے''۔؟

''اس لڑکی کے کرتے کی ایک جیب میں قلم تھا اور دوسری میں شاید نوٹ بک تھی جسے میں نوٹوں کی گڈی سمجھے ہوئے تھا۔ ہوسکتا ہے اندرونی جیب میں چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ بھی چھپا رکھا ہو اور ممکن ہے آٹو میٹک کیمرہ بھی رہا ہو اس کے پاس۔''

''وہاٹ''۔سوامی جی کے چہرے پر وحشت برسنے لگی۔''یعنی کہ''

''ہاں وہی''

سوامی جی کھڑے ہو گئے۔

''بھاگو اور ہمارے سکیورٹی اسٹاف کو حکم دو کہ.....''

''سمجھ گیا سوامی جی'' سکریٹری نے بات اچک لی ''کل کے اخبار میں ایکسیڈنٹ کی خبر چھپ جائے گی۔اطمینان رکھئے''

''گڈ'' سوریہ سوامی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولے'' اور باہر بیٹھے تمام لوگوں سے کہو کہ ہماری سادھنا کا وقت ہو گیا۔ہم گیان دھیان میں لین ہونے جا رہے ہیں اس لئے اب کسی کو درشن نہ دیں گے اور ہاں! پرمیلا کو فون کرو بولو کہ ہماری انتر آتما دکھی ہے۔آجائے۔''

(جولائی ۱۹۹۷)

شناخت

میر پور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پُل کے قریب ایک عورت کی لاش پڑی تھی۔ کسی شخص نے اس کے چہرے پر ایک رومال ڈال دیا تھا۔ مسافروں کو پانی پلانے والی عورت لاش کے قریب بیٹھی ایک کالے کلوٹے نیم وحشی مریل بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ بچے کی عمر پندرہ بیس دن سے زیادہ نہ تھی۔ تماشائیوں کا ایک ہجوم وہاں اکٹھا ہو گیا تھا۔

''کون ہے یہ''؟ سب سے آگے اپنی جگہ بناتے ہوئے ایک شخص نے لاش کے بارے میں سوال کیا۔

قریب کھڑے ایک دوسرے شخص نے جواب دیا۔

''فقیرنی لگتی ہے''، لیکن فوراً ہی تیسرا شخص بول پڑا، ''مجھے بھکارن لگتی ہے''۔ ان دونوں کی باتیں سن کر ایک چوتھے شخص نے اپنا خیال ظاہر کرنا ضروری سمجھا اس نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے دراصل یہ عورت بھوک اور بیماری سے مر گئی ہے۔ بے چاری لاوارث ہو گی''۔

یہ سن کر ایک اور شخص جوان سب کی باتیں غور سے سن رہا تھا حیرت سے چوتھے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔اگر لاوارث ہوتی تو یہ بچہ کہاں سے آتا؟''اس پر چوتھے شخص نے تیز نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور تلخی سے بولا۔

''بچہ ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس عورت کا کوئی وارث بھی ہے''

''پھر کس بات کا ثبوت ہے'' پانچواں بحث پر اتر آیا۔اور اس سے پہلے کہ چوتھا یا کوئی اور بچے کی حالت نزول اور مقصد وجود پر روشنی ڈالتا پہلے نے بور ہو کر اپنا سوال دہرایا۔

''لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ عورت کون ہے؟''

''یہی تو ہم اندازہ لگا رہے ہیں۔''۔دوسرا شخص جس نے عورت کو فقیرنی تصور کیا تھا بڑے فلسفیانی انداز میں بولا۔

''مگر اس طرح تو معلوم نہ ہو سکے گا کہ یہ کون ہے۔'' پہلے نے شبہ ظاہر کیا۔

''تو کس طرح معلوم ہوگا؟''۔ وہ شخص جس نے اس عورت کو بھکارن گردانا تھا لپک کر پہلے کے قریب آ گیا اور اس سے قبل کہ مسئلہ کا حل ہاتھ پاؤں کی حرکت سے شروع ہو جاتا ایک چھٹے شخص نے مداخلت کر دی۔''جب کوئی ثبوت نہیں، کوئی گواہ نہیں، واقعات کا کسی کو علم نہیں پھر فیصلہ کیوں کر ہو؟''

''کوئی وکیل لگتا ہے۔'' کسی نے پیچھے سے آواز لگائی۔جس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔دودھ پلانے والی عورت کو اس ٹھٹھول پر غصہ آ گیا۔اس نے ڈانٹ کر کہا۔

''آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ایک لاش پڑی ہے اور آپ لوگوں کو دِلّگی سوجھ رہی ہے''۔

یہ سن کر لوگ بظاہر شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے اور ماحول پر خاموشی چھا گئی۔چند منٹوں بعد پہلا شخص پھر بڑبڑایا.....''لیکن یہ ہے کون؟''

اس بار دودھ پلانے والی عورت نے اسے براہِ راست جھڑکا۔

''اب آپ چپ رہیں تو اچھا ہو۔اگر زبان میں زیادہ کھجلی ہو رہی ہو تو یہاں سے چلے جائیے''

''یا گلے میں تختی لٹکا لیجئے جس پر لکھا ہو۔''یہ کون ہے'' کسی اور نے لقمہ دے دیا جس پر کچھ لوگ پھر ہنسے۔لیکن پہلا شخص بگڑ گیا اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آخر یہ تو معلوم کرنا ہی پڑے گا کہ یہ لاش کس کی ہے''۔

اس کی خستہ حالت دیکھ کر بغل میں کھڑے ایک شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور سمجھاتے ہوئے بولا۔

''بھائی صاحب ابھی پولس آجائے گی تو پتہ چل جائے گا آپ اتنا پریشان کیوں ہیں؟''

اسی وقت دو سپاہی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہاں آ گئے اور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے۔ان میں ایک لال ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور دوسرا لال پگڑی باندھے ہوئے تھا۔دونوں نے بڑے غور سے لاش کے سراپا کو دیکھا پھر گوشت کے اس لوتھڑے کو دلچسپی سے دیکھا جو شیشی سے دھیرے دھیرے دودھ چوس رہا تھا۔چند سکنڈ بعد دونوں نے ایک ساتھ گردن ہلائی اور ایک ساتھ بولے.....''یہ کون ہے؟''

ان کے منہ سے اتنا نکلنا تھا کہ پہلا جوش میں آ کر بولا۔

''یہی تو میں خود اتنی دیر سے پوچھ رہا ہوں''

پگڑی والے سپاہی نے پہلے تو اسے گھور کر دیکھا۔پھر گھڑک کر پوچھا۔

''کس سے پوچھ رہے ہیں اور آپ ہیں کون؟''

اس اچانک سوال پر پہلا گھبرا گیا،اور ہڑبڑا کر بولا۔

''میں۔میں بمبئی جا رہا ہوں۔''

''تو جائیے یہاں کیا تماشہ لگا رکھا ہے''اس بار ٹوپی والے سپاہی نے لتاڑا۔پھر وہ دوسروں سے مخاطب ہوا۔''آپ سب لوگ جائیے یہاں بھیڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔کوئی کھیل تو ہو نہیں رہا ہے۔معمولی سی بات ہے ایک بھکارن مر گئی ہے بس''۔

یہ سنتے ہی تیسرا جس نے مردہ عورت کو بھکارن بوجھا تھا،اچھل پڑا۔

''دیکھا!میں کہتا تھا نہ کہ بھکارن ہے''

پگڑی والے سپاہی نے اُسے بھی غور سے دیکھا۔اور پوچھا آپ کی تعریف وہ بولا،

''اے پی بندوق والا۔''

ٹوپی والے سپاہی نے اس کی کمر میں اپنا ڈنڈا چبھویا اور کہا۔"

"شری بندوق والا آپ کہیں اور جا کر چھوٹے۔ایک لاوارث لاش کے پاس کیا کر رہے ہیں۔"

اس مذاق پر مجمع نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔جس پر دونوں سپاہیوں نے اپنا ڈنڈا ہوا میں لہرا دیا۔اور گرج کر بولے....."ہالٹ"

سب چپ ہو گئے۔ویسے منہ پھیر کر کچھ لوگ اب بھی ہنس رہے تھے۔لیکن مجموعی طور پر خاموشی چھا گئی۔تھوڑی دیر بعد چوتھے نے ٹوپی والے سپاہی سے بڑی عاجزی اور انکساری سے کہا۔

"حولدار صاحب آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔یہ لاوارث ہے میں نے اپنی رائے ظاہر کی تھی لیکن کوئی مانتا ہی نہیں"۔

پگڑی والے سپاہی نے اُسے شرارت سے دیکھا۔اور بولا

"تو آپ کا کیا بگڑ گیا مہاراج کیا آپ بھی لاوارث ہیں؟اور کس نے کہا تھا کہ آپ اپنی رائے ظاہر کیجئے۔"

کھی کھی کی آوازیں پھر آنے لگیں۔اور چوتھا شرمندہ ہو گیا۔اس نے گردن جھکالی۔

اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا۔چند منٹوں بعد پگڑی والا سپاہی اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"پر یہ تو واقعی معلوم کرنا پڑے گا کہ یہ کون ہے؟"

"وہ تو ہے"۔ٹوپی والا فوراً متفق ہو گیا

"ایسا کیا جائے کہ اس کے چہرے سے رومال ہٹا کر دیکھا جائے شاید کچھ اتا پتا چل جائے"۔

"آئڈیا"ٹوپی والا سپاہی پھر فوراً متفق ہو گیا۔اس پر پگڑی والے سپاہی نے اپنے ڈنڈے سے لاش کے چہرے پر پڑا رومال ہٹایا۔پورے مجمع کی نگاہ لاش پر جم گئی۔

تیس بتیس سال کی عمر،بے رونق پتھرائی آنکھیں،سپاٹ چہرہ،بے رنگ ونشان پیشانی۔

"شاید....."

پگڑی والے سپاہی نے کچھ کہنا چاہا۔لیکن ٹوپی والے نے بات کاٹ دی۔

''لیکن اس قسم کی عورت ایسی ہی ہوگی۔نشان وشان کہاں ہوگا''

''گلے میں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا''۔ پگڑی والے نے ذرا قریب سے لاش کو دیکھا۔''پاگل ہوئے ہو کچرے سے دانا چننے والی عورت کے گلے میں کیا ہوگا۔''ٹوپی والا بولا۔

اس پر پگڑی والے سپاہی نے ٹوپی والے سپاہی سے کہا۔''ذرا تم قریب سے دیکھو کوئی نشان کہیں دکھائی دے رہا ہے۔''؟

ٹوپی والا سپاہی لاش کے قریب آیا۔اس نے جھک کر اس کا بغور معائنہ کیا۔اور نفی میں گردن ہلا دی۔

پگڑی والے سپاہی کے چہرے پر الجھن اور مایوسی کے آثار نمایاں ہوگئے''پھر کس کو سونپا جائے جب تک کہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ ہے کون''۔یعنی ہندو ہے یا مسلمان یا کچھ اور''۔وہ بڑبڑایا۔

اس کی بڑبڑاہٹ سن کر وہ شخص جس نے سب سے پہلے پوچھا تھا کہ یہ ہے کون۔جلدی سے بولا۔

''دراصل میرا بار بار پوچھنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ سب سے پہلے یہ پتہ لگایا جائے کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان یا کچھ اور''

''ہاں یہی تو میں بھی جاننا چاہتا تھا''دوسرا بولا۔

''مجھے بھی یہی معلوم کرنا تھا۔تیسرا بولا۔

''اور میرا دل بھی یہی سوال کر رہا تھا۔''چوتھا بولا۔

پھر کئی لوگ ایک ساتھ بولے۔

''ہاں ہاں یہ تو بہت ضروری ہے۔پہلے یہ معلوم کرو کہ یہ کس ذات کی ہے۔''

اس کے بعد سب نے باتیں کرنی شروع کر دیں اور ایک بھنبھناہٹ لاش کے اردگرد منڈلانے لگی۔بچہ آواز سے گھبرا گیا۔اس نے دودھ پینا بند کر دیا۔دودھ پلانے والی عورت نے بے بسی سے سب کو دیکھا اور بچے کو اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

''روایتی'' کہہ سکتے ہیں مگر فرسودگی نام کو نہیں۔ یہ اپنے عہد کی آواز ہیں۔ موضوعات کا تنوع، اعلیٰ کردار نگاری اور کلائمکس کے ساتھ عیوب سے پاک زبان و بیان نے افسانوں کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے۔

ہاشمی کے بیشتر افسانے اپنے اپنے وقت کے ماحول، سیاست اور حالات کی کسی نہ کسی طرح ترجمانی کرتے ہیں۔ قاری کے ذہن میں اگر وہ دور اور اس سے متعلق سیاق و سباق ہوں تو ان افسانوں کا مطالعہ کچھ اور بھی دلچسپ ہوگا۔ مثلاً ''یرغمال'' میں ان تین غیر ملکیوں کی کہانی ہے جو کشمیر میں اغوا کر لئے گئے تھے اور حکومت نے جرمنی سے سراغرسانی کی مدد مانگی تھی۔ اسے پڑھنے کے لئے قاری کو ان حالات سے واقف ہونا ضروری ہے ''کارگل کا تحفہ'' سمجھنے کے لئے زمانۂ جنگ کو تصور میں لانا ہوگا اور ''اصحاب فیل'' کو سمجھنے کے لئے فلسطینی بچوں کی یہودیوں سے ڈھیلوں اور پتھروں سے معرکہ آرائی کے واقعہ کی یاد تازہ کرنا ہوگی۔ یہ افسانے ایک مخصوص دور کے نباض ہیں انہیں ان کے زمانے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ افسانوں کے ساتھ ماہ و سال کا اندراج اسی غرض سے کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر قاری کے ذہن کی اس دور تک رسائی نہ ہو تب بھی یہ افسانے قابل مطالعہ ہیں۔

مثلاً ہاشمی کا ایک خوبصورت افسانہ ''گاؤں کہاں گیا'' کو ہی لیجئے۔ یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آتی ہے کہ ہاشمی نے یہ افسانہ اپنے گاؤں کے لئے لکھا۔

مرکزی ملازمت نے ہاشمی کو بمبئی، پٹنہ اور احمد آباد ایسے بڑے شہروں میں زندگی کے بیش قیمت سال گزارنے پر مجبور کیا۔ مگر ان کے دل و دماغ سے اپنے گاؤں کی یاد کبھی نہ گئی۔ وادیٔ غربت میں جب انہوں نے قدم رکھا تھا یادِ وطن دور تک انھیں سمجھانے آئی تھی مگر وہ مجبور تھے۔ ہاشمی کو اپنے گاؤں سے، اپنے ماحول سے، اپنے بچھڑے ہوؤں سے کس قدر محبت ہے، اس کا مجھے اندازہ ہے۔ ان کی اہلیہ ثریا ہاشمی احمد آباد میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ سال میں دو بار Vacation ہوتا۔ وہ دونوں چھٹیوں میں اپنے اپنے گھر جاتے۔ ثریا ہاشمی کو ان کے میکے الہ آباد میں چھوڑ کر ہاشمی ٹانڈہ چلے جاتے۔ احمد آباد واپس لوٹتے اور اگلے Vacation میں جانے کا پروگرام پہلے ہی بنا لیتے۔ اپنے گاؤں سے یہ محبت کیا شے ہے۔ اس کا اندازہ ان کے افسانہ

اسی وقت ایک شخص مجمع چیرتا ہوا سب سے آگے آکر کھڑا ہو گیا۔ اور بآواز بلند اعلان کیا۔

''یہ مسلمان عورت کی لاش ہے۔''

سب نے ایک ساتھ اس شخص کو دیکھا کچھ کو غصہ آیا، کچھ خوش ہوئے اور کچھ بھیڑ میں ایسے نا سمجھ اور غیر وابستہ بھی تھے جن کے پلّے کچھ نہ پڑا اور وہ ہنسنے لگے۔

پگڑی والا سپاہی ان کے قریب گیا اور پوچھا۔

''پہلے یہ بتایئے کہ آپ کون ہیں؟ اور آپ کو آتے ہی کیسے پتہ چل گیا کہ یہ مسلمان عورت کی لاش ہے۔''

اس شخص نے لاش کو دوبارہ دیکھا۔ گردن ہلائی اور بولا۔

''میرا نام احمد داؤد کارپوریٹر ہے۔ فلاحِ عامّہ ٹرسٹ کا منیجنگ ٹرسٹی ہوں اس کے علاوہ کارپوریشن کی ہیلتھ اور پبلک ویلفیر کمیٹی کا چیرمین بھی ہوں''۔

دونوں سپاہی اپنی اپنی پوسٹ میں فوراً سمٹ گئے۔ انہوں نے الرٹ ہو کر احمد داؤد کو سلوٹ کیا۔ احمد داؤد مسکرائے اور مجمع پر فاتحانہ نظر ڈالتے ہوئے بولے۔

''دراصل ہوا یوں کہ کل شام یہ عورت میرے آفس میں آئی تھی اور اس نے اپنا نام امیرن بتایا تھا''۔

اتنا کہہ کر انہوں نے اس نیم جان بچے کو دیکھا جو پانی پلانے والی عورت کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ پھر بولے۔

''یہ عورت چاہتی تھی کہ ہم اپنے یتیم خانے میں اس بچے کو رکھ لیں۔ ہم نے جب بچے کے باپ کا نام پوچھا تو عورت بڑی بے حیائی سے بولی ایک ہو تو بتاؤں اور چونکہ ناجائز بچوں کو ہم اپنے یتیم خانہ میں نہیں رکھتے اس لئے ہمیں انکار کرنا پڑا''۔

''لیکن یہ عورت یہاں آکر مری کیسے''۔ کسی شخص نے بیچ میں سوال کر دیا۔

احمد داؤد نے برا سا منھ بنایا۔ بولے۔

''اب ہمیں کیا معلوم۔ ہم نے موت کے فرشتے کو اس کے تعاقب میں تو لگا نہیں دیا تھا۔

البتہ یہ عورت بھوک سے بے حال تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ کہیں کوئی کام مل جاتا تو دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو جاتا۔ لیکن عورت بدچلن تھی دیکھتے ہوئے مکھی کون کھاتا۔ ایسی صورت میں ہم کیا کرتے اور کرتے بھی تو کس طرح۔ نہ جانے ایسے کتنے لوگ منہ اٹھائے چلے آتے ہیں''۔

ان کا بیان سن کر پہلا شخص جس نے سب سے پہلے شناخت کا سوال اٹھایا تھا، خوش ہو کر بولا۔

''تو ثابت یہ ہوا کہ یہ مسلمان عورت کی لاش ہے''۔

''الحمدللہ''۔ احمد داؤد نے حلق سے آواز نکالی۔ ''اور اسی لئے اس کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہیں''۔

اتنا کہہ کر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوئے۔

آپ لوگ میرے ساتھ پولس اسٹیشن چلیں۔ وہاں کاغذات مکمل کر لیتے ہیں۔ فلاح عامہ ٹرسٹ اس مردہ عورت کو اپنی تحویل میں لیتا ہے کہ یہ ہمارا فرض ہے''

احمد داؤد کے منہ سے ابھی پورا جملہ بھی نہ نکلا تھا کہ پانی پلانے والی عورت گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بچے کو اپنی چھاتی سے الگ کرتے ہوئے پوچھا'۔

''اور یہ زندہ بچہ''

احمد داؤد نے بڑی خفگی سے اسے دیکھا اور جھڑک کر بولے۔

''اس امر پر ہم اپنا خیال پہلے ہی ظاہر کر چکے ہیں۔ کوئی گنجائش نہیں''۔

''اتنا کہہ کر انہوں نے پولس والوں کو ساتھ لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

اس کے فوراً بعد صابن کی جھاگ کی طرح پوا مجمع چھٹ گیا اور پانی پلانے والی عورت بچے کو سینے سے لگائے لاش کے پاس تنہا رہ گئی۔

(نومبر ۱۹۸۶)

حجِّ اکبر

سید و میاں کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش حج کرنا ابھی باقی رہ گئی تھی۔ ان کی روکھی سوکھی زندگی کی محدود خواہشیں اللہ نے ایک ایک کر کے پوری کر دی تھیں۔ جس کے لئے وہ اپنے رب کے بہت شکر گزار تھے۔ دو لڑکیاں تھیں دونوں کی شادیاں شریف گھرانوں میں ہو گئی تھیں۔ ایک بیٹا تھا وہ بھی کھیتی باڑی میں لگ گیا تھا۔ بیوی کئی سال پہلے انہیں اپنی ساری ذمہ داریوں سے نجات دے گئی تھی۔ وہ اب اپنے وجود ہی میں کھو کر رہ گئے تھے۔ زیادہ وقت اللہ کی عبادت میں گزارتے اور باقی اوقات میں سڑک کے کنارے اسکول کے پاس خوانچہ لگا کر بیٹھے رہتے اور اسکول کے بچّوں کو کھٹی مٹھی گولیاں، کراری لیا، چاکلیٹ، اور پتنگ کی ڈور وغیرہ بیچا کرتے۔ ان تھے منّے گاہکوں کے علاوہ سڑک کی مرمّت کرنے اور بلڈنگیں بنانے والے مزدور بھی کبھی کبھار ان سے کھانے کی چیزیں خرید لیتے اور جب کوئی گاہک نہ ہوتا تو سید و میاں ایک ہاتھ سے خوانچہ پر منڈلاتی مکھیاں ہانکتے رہتے اور دوسرے سے تسبیح ہلاتے رہتے۔ کبھی کبھار اُدھر سے گزرتا ہوا کوئی پوچھ لیتا سید و میاں کیا حال ہے تو جواب دیتے ''اللہ میاں کا کرم ہے زیادہ کٹ گئی تھوڑی باقی ہے۔ اب تو بس یہی

آرزو ہے کہ پاک پروردگار اپنے حبیب کے آستاں کی زیارت کرادے''۔

''خدا پورا کرے گا''۔ پوچھنے والا کہتا اور چلا جاتا۔ سید و میاں پھر مکھیاں ہانکنے اور تسبیح ہلانے لگتے۔ پھر کوئی گاہک آجاتا تو وہ رومال کندھے پر رکھ لیتے اور بسم اللہ کہہ کر سامان دیتے اور بسم اللہ کہہ کر پیسے لیتے۔ شام کے وقت جب اسکول بند ہو جاتا تو بچے چیختے چلاتے، ڈوڑتے بھاگتے اور مزدور اپنے تھکے ہارے جسم کو اپنے پیروں پر اٹھائے تقریباً گھسٹتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ اسی وقت عصر کی اذان ہوتی سید و میاں اپنا خوانچہ اٹھاتے اور لاٹھی ٹیکتے گھر آجاتے۔ کرتے کی جیب سے اس دن کی آمدنی نکالتے اسے گنتے اور ٹن کے بکس میں بسم اللہ کہہ کر احتیاط سے رکھ دیتے اور تالا لگا دیتے۔ پھر وضو کرتے اور نماز کے لئے مسجد چلے جاتے۔

یہ سلسلہ سالوں سے چلا آرہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سید و میاں بوڑھے اور کمزور ہوتے چلے جارہے تھے۔ کھیتی کی تھوڑی زمین تھی جسے بیٹے نے سنبھال لیا تھا اور اپنے بیوی بچوں کا شکم پشتم پیٹ پال رہا تھا۔ سید و میاں کی دو وقت کی روٹی اور عید بقرا عید کا کپڑا بھی وہ کر دیتا تھا۔ انہیں اس سے زیادہ چاہئے بھی کیا تھا۔ کئی بار بیٹے نے سمجھایا بھی کہ بابا خوانچہ لگانا چھوڑ دو، دن بھر ہلکان ہوتے ہو۔ حج کے لئے جانا چاہتے ہو تو ایک بیگہ کھیت بیچ ڈالو مگر سید و میاں اپنی ہٹ پر اڑے رہتے۔

''کھیت بیچ ڈالوں گا تو تمہارا کیا ہوگا، تمہاری بیوی بچوں کا کیا ہوگا میری تو جیسے تیسے کٹ گئی۔ چار چھ سال زندگی اور بھوگ لوں گا مگر تمہارا کیا ہوگا''۔ اتنا کہتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے بیٹا بھی خاموش ہو جاتا وہ بھی کیا کرتا۔ باپ کی خواہش کو وہ مار نہیں سکتا تھا اور پوری کرنے کی اس میں طاقت نہ تھی۔ دو بیگھ کھیت کی اوقات ہی کیا تھی۔ بڑی مشکل سے تو دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کا انتظام ہو پاتا تھا۔ اس پر بھی سال کے مہینے دو مہینے ساون بھادوں بھنے ہوئے چنے اور گڑ کے شربت پر گذارا کرنا پڑتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو بھوکے پیٹ سو رہنا پڑتا تھا۔ کپڑے عید بقرا عید بن جاتے تو بن جاتے ورنہ تیوہار بھی خالی جاتے۔ ایسی حالت میں سید و میاں کے حج کے اخراجات کہاں سے پورے کئے جاسکتے تھے۔ مگر وہ تھے کہ ناممکن کو ممکن بنانے کی جد و جہد میں سرگرداں تھے۔ وہ خوانچہ لگاتے اور جو کچھ ملتا جوڑ جوڑ کر جمع کرتے۔ ٹن کے صندوق میں روپیہ رکھتے

وقت انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے مقامات مقدسہ ان سے تھوڑا قریب ہو گئے، اور ان کی نگاہوں کے سامنے گنبد خضریٰ آجاتا اور غلاف کعبہ جھلملانے لگتا۔ ان کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی اور وہ جلدی سے صندوق بند کر دیتے۔

جب سے لکڑیوں اور بکریوں کا کاروبار کرنے والے سیٹھ رحمت علی حج کر کے لوٹے تھے سید و میاں اُن کی صحبت میں دیر تک بیٹھنے لگے تھے۔ عشاء بعد حاجی رحمت علی کی بیٹھک میں محفل جمتی حقہ آتا، حاجی صاحب تخت پر مسند کے سہارے جلوہ افروز ہوتے اور حقے کی نے منہ میں لگا کر آنکھیں بند کر لیتے۔ چند منٹوں تک وہ متواتر کش پر کش لیتے پھر نے منہ سے نکالتے، ٹوپی سر سے اتار کر ایک طرف کھڑی کر دیتے (حاجی صاحب کی کلف دار چکن کی ٹوپی جہاں بھی رہتی کھڑی ہوئی نظر آتی۔) سر پر ہاتھ پھیرتے، حلق سے اللہ اکبر عجیب وغریب آواز میں نکالتے۔ پھر ارشاد فرماتے..... ''نور برستا ہے نور''

چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھے ہوئے سید و میاں مجسم گوش بن جاتے اور ذرا سا جھک کر سیٹھ کے نورانی چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیتے۔

''حاجی صاحب عرفات کا میدان کتنا بڑا ہے؟'' وہ پوچھتے۔

''بڑا؟ ارے صاحب اللہ کا کرشمہ نظر آتا ہے کرشمہ''

''اور کتنے آدمی ہوتے ہوں گے؟''

''آدمی؟ کیا بتاؤں سید و میاں سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، بھانت بھانت کے لوگ، ایرانی بھی، تورانی بھی، مصری بھی، افغانی بھی، افریقی بھی اور جاپانی بھی، کالے بھی اور گورے بھی چھوٹے بھی اور لمبے بھی.....

''او بھائی ذرا دیکھ کے چل آگے بھی پیچھے بھی''

کوئی مسخرہ گلی میں ہانک لگا دیتا تو حاجی صاحب کا کلام قطع ہو جاتا ان کی بھویں تن جاتیں۔ ''مردود'' وہ نفرت سے کہتے، تھوڑی دیر چپ رہتے پھر بولتے۔ بس کیا بتاؤں اللہ تعالیٰ کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ کرشمہ''

''سنا ہے ہزاروں آدمی ایک ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں'' کوئی اور پوچھتا اور حاجی صاحب جواب دیتے۔

''میاں لاکھوں کہو۔ لاکھوں۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری کائنات گردش کر رہی ہو، پورا عالم پروانہ ہو گیا ہو اور شمع کعبہ کے گرد گھوم رہا ہو۔ مالک حقیقی کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ کرشمہ''

ایک دن سید و میاں نے حاجی صاحب سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''حاجی صاحب حج کے لئے کتنے روپے چاہیئے''۔

''روپے؟ حاجی صاحب زور سے ہنس پڑے۔ ''میاں اتنے کہ تم گن نہیں سکتے۔ آستانہ بوسی کا شرف تو اسے حاصل ہوتا ہے جس پر اللہ کا کرم ہو۔ سب کے بس کی بات کہاں۔ کیا سمجھے؟''

''درست فرمایا۔ پھر بھی حاجی صاحب آپ کا کیا خرچ ہوا تھا''

''میری بات چھوڑ دو میاں۔ میں نے کوئی حساب تھوڑی رکھا تھا۔ پندرہ ہزار بھی ہو گیا ہو، بیس ہزار بھی۔''

''مگر لوگوں کا کہنا ہے کہ چھ ہزار میں کام چل سکتا ہے''

'ہاں' آں۔ اگر معمولی طرح سے کام نکالنا ہو تو چل بھی سکتا ہے۔ وہ جو پانی کے جہاز سے جاتے ہیں اور عام درجوں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ اتنے میں کام چلا بھی سکتے ہیں۔ میں تو خیر ہوائی جہاز سے گیا تھا۔ اور وہی جانتا ہوں۔ کیا سمجھے؟''

سید و میاں لاٹھی ٹیکتے گھر واپس آ گئے۔ اور سیدھے اپنی کوٹھری میں گئے چراغ کی ٹمٹماتی روشنی میں اپنا صندوق کھولا، تھیلی نکالی، اور روپیہ گننے لگے۔

ایک..... دو..... دس..... سو..... پانچ سو..... ہزار..... پانچ ہزار..... پانچ سو ترسٹھ

''بس اب پانچ سو باقی رہ گئے ہیں، اللہ نے چاہا تو اگلے سال پورے ہو جائینگے اور پھر۔''

سید و میاں اس سے آگے نہ سوچ سکے۔ روپے پوٹلی میں رکھ کر صندوق بند کر دیا۔ ایک ہاتھ میں مٹی کے تیل کی ڈبری پکڑے اور دوسرے سے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کوٹھری سے باہر آ گئے۔

عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ حاجی صاحب گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ حقہ کی سنہری

نے ہونٹوں میں دبائے بڑی ادا سے کش لے رہے تھے، آنکھیں بند تھیں۔ وہ اپنی ملائم ملائم انگلیوں سے کبھی چکنے سر کو ہولے ہولے سہلاتے اور کبھی داڑھی میں کنگھی کرتے۔ لکھنوی تمباکو کا دھواں فضا میں تحلیل ہو کر ایک سحر آمیز خوشبو بکھیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حاجی صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ قریب ہی بیٹھے سید و میاں کو دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں بولے۔

''سید و میاں، سنا ہے تم حج کرنے جا رہے ہو''

''جی حاجی صاحب'' سید و میاں نے کچھ اس طرح بوکھلا کر جواب دیا جیسے وہ کوئی جرم کرنے جا رہے ہوں۔

''اڑتے اڑاتے خبر ہم تک بھی پہونچی تھی کہ حج کی تمنا میں تم بھی جی رہے ہو مگر یہ معلوم نہ تھا کہ تم واقعی حج کرنے جاؤ گے بھی۔ حیرت ہے''۔

''اللہ کی مرضی'' سید و میاں نے گھبرا کر کہا۔

''وہ تو ہے، مگر بھئی یہ روپے کہاں سے اکٹھا کر لئے''۔

''اللہ نے انتظام کر دیا''

''وہ تو ہے، مگر پانچ چھ ہزار روپے؟''

''اللہ اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہے''۔ سید و میاں کے منھ سے نکلا حاجی صاحب نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

''کوئی کھیت بیچ ڈالا کیا؟''

''نہیں''۔

''پھر''۔

لیکن اس سے پہلے کہ سید و میاں جواب دیتے ایک عورت دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ حاجی صاحب نے دیکھا تو پوچھا..... ''کون؟''

''میں ہوں۔ حاجی صاحب''

''میں؟۔ میں کون؟''

''عیدو کی بیوہ ہے۔ حاجی صاحب''۔ کسی اور نے بتایا۔

''ہوں! کیا ہے''۔

حاجی صاحب نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔

''حاجی صاحب میری بٹیا سلمیٰ کی بات پکی ہوگئی ہے۔ آج وہ لوگ آئے تھے مگر......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''مگر کیا؟''

''وہ لوگ اگلے ہی مہینے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکا نوکری سے آیا ہوا ہے شادی کرکے جانا چاہتا ہے''

''تو؟''

''ابھی کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔ آج اس کے ابا زندہ ہوتے تو......'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

حاجی صاحب نے آنکھیں کھول دیں، سر سے ٹوپی اتاری، چندیا سہلائی پھر ٹوپی سر پر رکھ لی اور اس عورت کو غور سے دیکھنے لگے۔

''سلمیٰ کچھ کرتی ورتی ہے''۔ انہوں نے پوچھا

عورت نے دوپٹہ سے اپنے آنسو خشک کیے۔ بولی

''گھر پر ہی رہتی ہے۔ سیانی لڑکی کو کہاں بھیجوں''

''وہ تو ہے''۔ حاجی صاحب نے جلدی سے کہا۔ پھر بولے

''میرا مطلب تھا کسی شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی تو کچھ سلیقہ ولیقہ سیکھ جاتی۔ تعلیم نہ سہی طور طریقہ تو آجاتا''۔

عورت خاموش رہی۔ تھوڑے وقفے سے حاجی صاحب پھر بولے

''کہیں کوئی شریف گھرانا نہ ملے تو ہمارے ہی یہاں کر جاؤ۔ کچھ دن ہماری لڑکیوں کے ساتھ رہ لے گی تو انسان بن جائے گی۔ کیا سمجھیں؟''

''جی'' عورت نے دھیرے سے کہا۔

''اور شادی کے اخراجات کا انتظام تو اللہ کرے گا۔ وہی مسبب الاسباب ہے ہم اور تم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم حقیر بندے ہیں۔ وہی کوئی صورت نکالے گا''

''جی''

''بس جاؤ اور کل اسے بھیج دو اور اللہ پر بھروسہ رکھو''۔ اتنا کہہ کر حاجی صاحب نے حقے کی نے منہ میں لگالی اور پے در پے کئی کش لئے۔ چلم سے چنگاریاں چٹختی ہوئی نکلیں اور فرش پر بکھر گئیں۔ سیدو میاں جو اُن کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھے تھے، حاجی صاحب کو غور سے دیکھنے لگے۔ حقہ پینے سے آنکھیں تو لال ہو سکتی ہیں مگر چہرہ؟ وہ کیوں سرخ ہو گیا تھا۔ دھویں سے پتلیاں ٹمیالی تو ہو سکتی ہیں مگر وہ چمکنے کیوں لگیں اور یہ حاجی صاحب بار بار پہلو کیوں بدلنے لگے''

وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے آئے۔ اپنے گھر کی چوکھٹ پر بہو کی آواز سے ٹھٹھک گئے۔

''بچے چیتھڑے لٹکائے چل رہے ہیں۔ بابا سے کہو کچھ روپے دیدیں۔ ان کے کپڑے بن جائیں''۔

''کیا بکتی ہو''۔ بیٹے نے اپنی بیوی کو ڈانٹا۔ ''سردی، گرمی، برسات، کوئی بھی موسم ہو وہ دن بھر خوانچہ لئے سڑک پر بیٹھے رہتے ہیں۔ پائی پائی جوڑتے ہیں۔ تمہارے بچوں کے کپڑوں کیلئے؟۔ جب ہم اس لائق نہیں کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری کر سکیں تو کم از کم انھیں خود کر لینے دیں۔ ان کی راہ میں حائل نہ ہوں۔''

''مگر بچوں کا ننگا پن نہیں دیکھا جاتا''۔ بہو بولی۔ ''پیٹ خالی ہے یا بھرا کوئی نہیں دیکھتا مگر جسم سبھی دیکھتے ہیں۔ ویسے باہر نکلی ہوئی ہڈیاں اور اندر گھسی ہوئی آنکھیں پیٹ کی بھی چغلی کھاتی رہتی ہیں''۔ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

سیدو میاں نے اپنے سینے کے بائیں طرف شدت کا درد محسوس کیا۔ وہ دروازہ کا بازو پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور دھیرے دھیرے سینہ سہلانے لگے تھوڑی دیر بعد جب درد قدرے کم ہوا تو کھنکھارتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

ان کی بہو، جو چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی اور سر پر دوپٹہ ڈال لیا۔ بیٹا تخت پر لیٹا ہی رہا۔ انہوں نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ سہ دری میں لٹکی ہوئی لالٹین اتاری اور بھاری بھاری قدم اٹھاتے اپنی کوٹھری میں گئے۔ انہوں نے صندوق کھولا، روپے کی پوٹلی نکالی اور روپیہ گننے لگے۔ سید و میاں نے یہ حرکت سیکڑوں بار کی تھی مگر اس دفعہ انہیں روپیہ گننے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ کئی نوٹیں ایک ساتھ گڈ مڈ ہو رہی تھیں نوٹوں کو پہچاننے میں بھی وہ دھوکہ کھا رہے تھے۔ دو کی نوٹ ایک اور دس کی نوٹ بیس کی گن جاتے۔ لالٹین دھواں اگلنے لگی تھی اور بجھنے کے قریب ہو گئی تھی۔ اس کا دھواں آنکھوں میں جلن پیدا کر رہا تھا۔

بڑی مشکلوں سے وہ آخری نوٹ تک پہونچے۔ کُل پانچ ہزار نو سو بیاسی روپے تھے۔ انہوں نے ساری نوٹیں لاپرواہی سے تھیلی میں گھسیڑ دیں اور تھیلی کُرتے کی جیب میں رکھ کر اٹھ پڑے۔ صندوق کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیا۔ تالا فرش پر پڑا رہا۔ لاٹھی ٹیکتے ایک ہاتھ میں لالٹین لٹکائے وہ باہر آ گئے۔ سہ دری میں آتے ہی لالٹین بھبک کر بجھ گئی۔ انہوں نے پائے کی آڑ میں اسے رکھ دیا اور آنگن میں دیکھنے لگے۔ ان کا بیٹا بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے بہو کی طرف بڑھنے لگے۔ آنگن میں اندھیرا تھا۔ باورچی خانہ میں مٹی کے تیل کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ جنگلے سے چھن چھن کر آتی ہوئی مدھم روشنی چاروں طرف پھیلے اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ دالان سے آنگن میں اترتے وقت سید و میاں کا ہاتھ حقے پر پڑا اور وہ الٹ گیا۔ چلم ٹوٹ کر آنگن میں بکھر گئی اور اس سے چند شعلے بھڑک اٹھے۔

دفعتاً سید و میاں کو رحمت علی کی آنکھوں کی چمک یاد آ گئی اور ان کے بڑھتے قدم رک گئے انہوں نے اپنے پوتوں اور پوتیوں کو دیکھا جو چیتھڑوں میں لپٹے پڑے اِدھر اُدھر سو رہے تھے۔ ان کے جسموں سے نکلی ہوئی ہڈیاں سید و میاں کی آنکھوں میں گھسنے لگیں۔ ان کے رکے قدم اٹھ گئے اور بہو کی طرف بڑھنے لگے مگر اسی وقت راکھ کے ڈھیر سے ایک شعلہ پھر لپکا اور انہیں حاجی رحمت علی کا بار بار پہلو بدلنا یاد آ گیا۔ ان کے قدم جہاں تھے وہیں دوبارہ جم گئے اور گردن جھک گئی۔

جب کافی دیر ہو گئی اور سید و میاں اپنی جگہ سے ہلے نہیں تو بہو نے دھیرے سے پکارا۔

''گاؤں کہاں گیا'' پڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ گاؤں کیسا رہا ہوگا اور اب کیا بن گیا ہے۔اس کا علم اس افسانے سے بخوبی ہوتا ہے۔اس موضوع پر اور بھی افسانے اردو میں پڑھنے کو ملیں گے۔مگر ہاشمی کے افسانے کا حسن ہی کچھ اور ہے۔افسانے کی ہر سطر پر ہر لفظ میں ہاشمی کے دھڑکتے ہوئے دل کی خموش آواز سنائی دیتی ہے۔قاری افسانے کے مرکزی کردار علیم الدین کے ساتھ اکبر پور ریلوے اسٹیشن پر اترتا ہے۔گاؤں جانے کے لئے ٹمپو میں سوار ہوتا ہے، راستہ میں اریا بازار آتا ہے تو دل میں ہوک سی اٹھتی ہے کہ ذہن میں جگمگ کرتے چراغوں کے باوجود ہر طرف اندھیرا ہے۔خوبصورتی کا، خیر کا ہر نقش مٹ چکا ہے۔کچھ باقی ہے تو دیسی شراب کی دوکان۔افسانہ نگار کے ذہن میں جو سوال گونج رہا ہے اور جسے پوچھنے کے لئے اس نے لفظوں کا قطعی استعمال گوارا نہیں کیا، وہ یہ ہے کہ ترقی اور تبدیلی کے لئے کیا ہر پرانی چیز کو بھلے ہی وہ خوبصورت اور مفید ہو، مٹا دینا ضروری ہے؟ گاؤں کا حسن کھیت اور کھلیان، ہرے بھرے درخت، چرندے اور پرندے، میلے ٹھیلے، آپسی محبت اور بھائی چارگی سے قائم ہے، ان سب کو تہس نہس کر کے شہری تہذیب میں اسے مکمل طور پر تبدیل کرنے کے بعد گاؤں، گاؤں نہیں رہتا۔علیم الدین کے سوال پر کہ گاؤں کہاں گیا ان کا بھتیجا سلیم ٹھٹھول کرتے ہوئے یہ جواب دیتا ہے۔

''بڑے ابا! آپ کا گاؤں بھی وہیں کہیں جنگل میں ہوگا؟ اور بڑے ابا نیند نہ آرہی ہو تو چلئے ویڈیو پر فلم دیکھ آئیں۔گاؤں کے دھنیوں اور فقیروں نے انتظام کیا ہے۔ہر ہفتہ کرتے ہیں''۔

ہاشمی کا یہ افسانہ صرف بیانیہ افسانہ نہیں۔لفظوں سے بنائی گئی خوبصورت Painting ہے۔ہاشمی نے بھلے ہی یہ افسانہ اپنے لئے، اپنے گاؤں کے لئے لکھا ہو یہاں قاری کی شمولیت کچھ اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو ہر مقام پر موجود پاتا ہے۔

گاؤں کے ساتھ ہاشمی نے پرانی اقدار کو اجاگر کرنے کی غرض سے ایک اور لاجواب افسانہ تخلیق کیا ہے۔جس کا عنوان ہے ''سچ کیا ہے؟''

یہ افسانہ رشتوں کی پاکیزگی اور معصومیت کی معراج ہے۔اسے پڑھتے ہوئے اگر قاری کی پلکیں بھی نم ہو جائیں تو حیرت نہ ہوگی۔بیانیہ کا حسن اور سادگی، کرداروں کی نفسیات اور ان کے

''بابا''

سیدو میاں کے جسم میں حرکت آ گئی۔ان کے قدم پھر اٹھے مگر اپنی بہو بیٹے کی طرف نہیں بلکہ باہر کی طرف۔

عیدو کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے چور نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا ۔گلی میں سناٹا تھا۔میونسپلٹی کے لیمپ کی چمنی سیاہ ہوگئی تھی اور اس سے روشنی کے بجائے اندھیرا پھیل رہا تھا۔رام لال بنئے کی دوکان کے چبوترے پر خارش زدہ کتا اپنے جسم کو زمین پر رگڑ رہا تھا۔اس کے منہ سے نکلتی بھک بھک کی آواز چاروں طرف پھیلی خاموشی کو پھاڑ کر فضا میں وحشت پھیلا رہی تھی۔انہوں نے دھیرے سے دروازے پر دستک دی۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا۔ہاتھ میں لالٹین لئے سامنے سلمٰی کھڑی تھی۔سیدو میاں نے اسے دیکھا تو دیکھتے رہ گئے۔ایڑی سے لے کر چوٹی تک وہ شباب ہی شباب تھی،اس کے بھرے بھرے خوبصورت چہرے،غزالی آنکھیں،گھنی اور لمبی زلفیں،سرخ گالوں اور یاقوتی ہونٹوں سے پھسلتی ہوئی سیدو میاں کی نگاہیں جب اور نیچے آئیں تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔سلمٰی نے جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کرلیا۔بولی..... ''چاچا''

سیدو میاں پسینہ پسینہ ہوگئے،''تمہاری ماں ہے۔؟''انہوں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں اندر آیئے''

دونوں اندر آئے،عیدو کی بیوی باورچی خانے سے نکلی اور سیدو میاں کو چارپائی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیسے آنا ہوا بھیّا؟''

سیدو میاں نے سلمٰی کو چور نگاہوں سے دیکھا۔بولے۔

''میں یہ جاننے چلا آیا تھا کہ تم بیٹا کو حاجی کے یہاں بھیجو گی؟''

''ہاں کیوں نہیں۔اچھے لوگوں میں کچھ دن رہ لے گی تو اس کا پھوہڑ پن تو کم ہوگا اس کے علاوہ بھیّا حاجی صاحب شادی بیاہ کے خرچ کا بھی کچھ بندوبست کردیں گے''۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر.....''سیدو میاں کچھ کہتے کہتے رک گئے،

''مگر کیا بھیا؟'' عیدو کی بیوی نے پوچھا

سیدو میاں نے پھر سلمٰی کو دیکھا، وہ زمین پر اکڑوں بیٹھی لالٹین میں مٹی کا تیل ڈالنے لگی تھی۔ اس کی چوٹی کا آخری سرا زمین کو بوسہ دینے کے لئے لپک رہا تھا۔ غیر شعوری طور پر سیدو میاں کی نگاہیں اس کے پھیلے بازو اور اٹھے گھٹنے کے درمیاں گھس گئیں۔ انہوں نے گھبرا کر نگاہیں پھیر لیں۔

''وہاں مت بھیجو'' انہوں نے دھیرے سے کہا

عیدو کی بیوی حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ پوچھا۔ ''کیوں؟''

''بٹیا کی تربیت تم نے ایسی دی ہے جس پر کوئی بھی لڑکی ناز کر سکتی ہے۔ رہ گیا شادی کا خرچ تو.....''

سیدو میاں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ جیب سے روپے کی پوٹلی نکالی اور اسے چارپائی پر رکھتے ہوئے بولے۔

''چھ ہزار میں کچھ کم ہیں، پچھلے آٹھ سالوں سے جوڑ جوڑ کر رکھتا آیا تھا۔ حج کے لئے۔''

عیدو کی بیوی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ''بھیا''! وہ چیخی۔

''کیا ہوا؟'' سیدو میاں نے اس طرح پوچھا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

''یہ نہیں ہو سکتا''

''کیوں؟''

عیدو کی بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''تم مجھ پر اتنا بڑا احسان مت کرو''۔

''احسان کیسا؟۔ عیدو میرا دوست تھا۔ سلمٰی میری ہی بیٹی ہے یہ تو میرا فرض ہے''۔

''مگر تم حج کرنے کس طرح جاؤ گے''۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی، سیدو میاں گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

''حج مجھ پر فرض نہیں''..... انہوں نے اطمینان سے کہا۔ اور چپ چاپ گھر سے باہر نکل گئے۔

(جنوری ۱۹۸۲)

رُکا ہوا فیصلہ

احمد نگر مسلم یتیم خانہ کی مجلسِ انتظامیہ کی میٹنگ عصر بعد یتیم خانہ کی دومنزلہ عمارت میں پورے زور وشور کے ساتھ منعقد ہوئی۔ تقریباً سبھی اراکین شریک تھے۔ صرف نائب چیرمین قاسم بھائی عاصم بھائی گیرج والا آنے سے قاصر تھے کیونکہ ان کے گھر پر اسی دن انکم ٹیکس کا چھاپہ پڑا تھا اور پچاس لاکھ کی کڑی کڑی کرنسی نوٹیں پکڑی گئی تھیں۔ چھاپہ پڑنے سے ان کے دل پر دورہ پڑا تھا اور انہیں ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا گیا تھا۔ باقی تمام اراکین حاضر تھے۔ یہ میٹنگ دو اہم مسائل پر غور کرنے کے لئے بلائی گئی تھی۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ٹرسٹ کی آمدنی جو لاکھوں روپئے تک پہنچ گئی تھی اس کا کیا کیا جائے۔ ٹرسٹ کے دستور اور جائداد وقف کرنے والے کی ہدایت کے مطابق اسے صرف یتیموں پر ہی خرچ کیا سکتا تھا۔ لیکن یتیموں کی تعداد اتنی کم تھی کہ ان پر آمدنی کا دسواں حصہ بھی خرچ نہیں ہو پاتا تھا۔ کچھ پڑھے لکھے اور دنیا جہان دیکھے اور زندگی کو بھگتے لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس آمدنی کو دوسرے فلاحِ عامّہ کے کاموں مثلاً تعلیم وتربیت صحت وثقافت زبان وادب پر خرچ کیا جائے تو قوم کا مقدر بڑی حد تک سنور سکتا ہے۔ لیکن مذہب وشرع

کو بہتر طور پر جاننے کا دعویٰ کرنے والوں نے ایسے لوگوں کی نہ چلنے دیا تھا اور بات خلاف شرع ٹھہرائی گئی تھی، اس طرح مشورہ دینے والوں کو اپنی پوسٹ میں سمٹ جانا پڑا تھا اور مسئلہ وہیں کا وہیں رہا تھا کہ اس آمدنی کا کیا کیا جائے۔

ناظم علی ایڈوکیٹ کو جب یہ پتہ چلا کہ یتیموں کے علاوہ اس روپئے کو کہیں اور خرچ نہیں کیا جاسکتا تو انہوں نے ایک ایسا خیال ظاہر کیا جو بہتوں کے نزدیک مضحکہ خیز تھا گو کہ بات انہوں نے بڑے خلوص سے کہی تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ کیوں نہ ہم یتیموں کو مقامی اسلامیہ اسکول میں پڑھانے کے بجائے دہرہ دون کے اسکول میں داخل کرادیں۔ ہماری آمدنی اتنی ہے کہ ہم یہ خرچ آسانی کے ساتھ اٹھا سکتے ہیں اور یہ یتیم آگے چل کر آئی، اے، ایس بھی ہو سکتے ہیں اور منتری گورنر بھی۔ اس پر سب ہنسے تھے کئی لوگوں نے تو اپنی اپنی ٹوپیاں اتار کر اپنے چکنے سروں کو سہلایا بھی تھا کہ ایسی مزے دار بات کبھی کبھار ہی سننے کو ملتی ہے۔ بڑبڑائے تو سبھی تھے کہ یہ وکیل بھی گھاس کھائے ہوئے ہے جو ایسا مشورہ دے رہا ہے جو شرع کے سراسر خلاف اور ہماری روایت کے منافی ہے۔ بھلا یتیموں کو دہرہ دون میں پڑھانے کا کیا تک۔ یتیموں کو ایسے حالات میں رکھنا چاہئے اور ایسے اسکول میں پڑھانا چاہئے جہاں وہ اپنی حقیقت کو نہ بھولیں۔ ان کے رہن سہن، چہرے بشرے عادات واطوار، سوچ سمجھ، چال ڈھال، کپڑے لتے، سے ظاہر ہونا چاہئے کہ وہ یتیم ہیں۔ اگر وہ یتیم ہی نہ لگے تو پھر یتیم خانہ میں انہیں کیوں رکھا جائے اور یتیم خانہ چلانے کا مقصد کیا ہوگا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ یتیموں کو دون اسکول میں پڑھایا جائے اور انہیں ایسی تعلیم وماحول دیا جائے جو اراکین تک کے بچّوں کو بھی میسّر نہیں۔

ناظم علی وکیل نے پتہ نہیں گھاس کھائی تھی یا نہیں لیکن وہ وقتی طور پر خاموش ضرور ہو گئے اور ان لوگوں نے جنہوں نے دوپہر کے کھانے میں مرغ کی بریانی کھائی تھی تھوڑی دیر اور بحث جاری رکھی، لیکن کچھ حاصل نہ ہو سکا اور اب ان کے سامنے دوسرا مسئلہ جو اس سے بھی اہم تھا وہ یہ تھا کہ جمع شدہ رقم پر حاصل شدہ سود جو بیس لاکھ روپئے تک پہنچ گیا ہے اس کا کیا کیا جائے۔ اب سود تو اسلام میں ناجائز ہے دینے پر بھی اور لینے پر بھی۔ یہ سبھی جانتے ہیں۔ چیرمین الحاج

عبدالقادر رنگ والا سے لے کر چپراسی غفور میاں تک۔ غرضکہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ سود ناجائز ہے، نہیں جانتا تو بینک۔ ملک کا معاشی اور اقتصادی نظام نہیں جانتا۔ یہ جمع شدہ رقم پر سود دیتے چلے جاتے ہیں۔ بے وقوف کہیں کے۔ ان کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں۔ ارے مسئلہ تو قوم کے سامنے ہے کہ اس رقم کا کیا کیا جائے جو ناجائز اور حرام ہے جو زبردستی قوم کے سر تھوپ دی جاتی ہے اور جسے کہیں بھی خرچ نہیں کیا جا سکتا۔

ناظم علی وکیل نے بحث سن کر اپنا چشمہ آنکھ پر سے اتارا، اسے رومال سے صاف کیا دوبارہ چڑھایا اور بولے۔

''کیوں نہ ہم اس رقم کو مقامی اسکول میں دے دیں۔ اتنی بڑی رقم سے وہ اسکول کالج بن سکتا ہے اور آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے صوبہ میں ایک بھی کالج مسلمانوں کا نہیں ہے۔ اس کی سخت ضرورت ہے، بہت بڑا کام ہوگا''۔

ناظم علی وکیل کی بات سن کر ڈیسنٹ سِلک انڈسٹریز کے مالک اور یتیم خانہ کے سب سے معمر اور پرانے رکن جناب حاجی سمیع اللہ بھڑک اٹھے۔

''حرام رقم سے''؟ ان بچوں کی عاقبت کا کیا ہوگا۔ جو اس حرام رقم کے پرداختہ ہوں گے یہ بھی سوچا آپ نے کہ بس رائے دے دی''۔

ناظم علی وکیل لمحہ بھر کیلئے سٹک گئے لیکن تھے وکیل ہمت ہارنا ان کی فطرت کے خلاف تھا اور چپ رہنا بھی ان کے بس میں نہ تھا۔ چند لمحوں بعد وہ پھر بولے۔

''تو ایسا کریں کہ ایک اسپتال کھول دیں، یہاں اسپتالوں کی بڑی کمی ہے، اس سے بہتر کار خیر اور کیا ہو سکتا ہے''۔

حاجی سمیع اللہ نے اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں۔

''بات وہی ہوئی اسپتال ہو یا کالج رقم تو حرام کی ہی لگے گی۔ مریض اچھے ہونے کے بجائے زیادہ مریں گے اور اتنا ہی نہیں مرنے کے بعد بھی چین نہ پائیں گے''۔

ناظم علی وکیل کے چہرے کا رنگ اڑ گیا لیکن وہ تیسرا مشورہ دینے سے بھی باز نہ آئے

بولے۔ '' یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گندے نالے کے کنارے غلیظ جھونپڑیوں میں جولوگ رہتے ہیں ان کی رہائش کیلئے ایک کالونی بنادی جائے کیا حرج ہے''۔

حاجی سمیع اللہ بیٹھے بیٹھے کندھے سے جھک گئے۔ گردن کو دونوں شانوں کے درمیان دبالیا اور ناظم علی وکیل کی ناک پر اپنی آنکھیں جماتے ہوئے اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔

''وکیل صاحب! ہروہ کام جو حرام رقم سے انجام پائے حرام ہی ہوتا ہے۔ آپ سراسر خلافِ شرع اور خلافِ عقل باتیں کررہے ہیں''۔

ناظم علی وکیل ایک جھٹکے سے کھڑے ہوگئے اور ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے چیخے

''تواس بیس لاکھ کی رقم کا کیا کیا جائے۔ گٹر میں ڈال دیا جائے ناجائز بچّے کی طرح''

اس پر محفل میں سناٹا چھا گیا، چھت پر گھومتے ہوئے پنکھے کی گھرر، گھرر اور دیوار پر لگی پرانی وضع کی گھڑی کے پنڈلم کی ٹِک ٹِک صاف سنائی دینے لگی۔ پیش امام قاری جان محمد نے چپکے سے کلائی پر بندھی سنہری چین کی گھڑی دیکھی۔ مغرب کا وقت قریب ہورہا تھا۔ انہوں نے کرسی میں کسمسا کر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا جس پر کسی نے بھی توجہ نہ دی۔

تھوڑی دیر بعد چیرمین حاجی عبدالقادر رنگ والا نے سکوت توڑا۔

''حضرات! ہم نے پہلے بھی اس مسئلہ پر غور کیا ہے لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر رہے ہیں آج بھی ہم گھوم پھر کرو ہیں ہیں کہ سود کا استعمال کسی بھی حالت میں جائز کام کے لئے نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اب ہمیں فیصلہ کرہی لینا چاہئے کہ یہ رقم کسی دوسری قوم کو دے دی جائے کہ اپنی قوم اس کی مستحق نہیں۔ اس سلسلے میں ایک جگہ سے درخواست بھی آئی ہے کہ یہ رقم انہیں اپنا معبد بنانے کیلئے دے دیجائے۔ ان حالات میں ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ بیس لاکھ کی رقم درخواست دہندہ کو خیرسگالی کے طور پر دے دی جائے کہ وہ اپنا معبد بنالیں''۔

سب نے کہا منظور ہے۔

ناظم علی وکیل نے پوچھا بھی کہ یہ خیرسگالی ناجائز تو نہ ہوگی۔ لیکن ان کی بات کا کسی نے

جواب نہ دیا۔ انہوں نے اپنا چشمہ اتار کر رومال سے چہرے کا پسینہ پوچھا تو رومال تر ہو گیا۔ انہوں نے اپنی ٹانگوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور گہری سانس لے کر کرسی میں دھنس گئے۔

اسی وقت غفور چپراسی گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بولا ''صاحب غضب ہو گیا''۔

''کیا ہوا؟'' سب نے ایک زبان ہو کر پوچھا

نالے کے کنارے آباد جھونپڑیوں میں آگ لگ گئی اور آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ دیکھتے دیکھتے تمام جھونپڑیاں جل کر راکھ ہو گئیں سیکڑوں لوگ زندہ جل گئے۔

''ارے'' سب کے منہ سے نکلا

''اور حضور''

سب نے چپراسی کو ایک ساتھ دیکھا

''اپنے یتیم خانہ میں ایک یتیم انور ہے اس کے ماں باپ بھائی بہن بھی اسی جھونپڑی میں تھے۔ آگ کی خبر سنتے ہی انور دہشت سے بے ہوش ہو گیا''۔

''ارے، ارے'' سب کے منہ سے پھر نکلا

لیکن حاجی عبدالقادر رنگ والا کی بھنویں تن گئیں۔ ان کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا سپرنٹنڈنٹ احمد علی کو گھورتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

اس لڑکے کے ماں باپ دونوں ہی زندہ تھے؟

''جی'' احمد علی نے اس طرح کہا جیسے جج کے سامنے اقبال جرم کر رہے ہوں۔ جواب سن کر حاجی عبدالقادر رنگ والا کی آنکھوں کے ڈورے بھی سرخ ہو گئے انہوں نے بڑے کرخت لہجہ میں کہا۔

''پھر اسے یتیم خانہ میں کیوں داخل کیا گیا۔ وہ لڑکا جس کے ماں باپ دونوں زندہ ہوں یتیم کس طرح ہوا، آئیں؟''

احمد علی کو پسینہ چھوٹ گیا۔ انہوں نے گھگھیاتے ہوئے صفائی پیش کی۔

''صاحب دراصل اس کے والدین بہت غریب نادار اور بیمار تھے فاقہ پر فاقہ کر رہے تھے

،میں نے ترس کھا کر.....''۔

''خاموش'' حاجی عبدالقادر رنگ والا نے ڈانٹ کر احمد علی سپرنٹنڈنٹ کی بات کاٹ لی اور کڑک کر کہا۔

''آپ اِسی وقت ملازمت سے استعفیٰ دے دیں ورنہ مجھے نکالنا پڑے گا۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں لیکن یہ کبھی بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ یتیموں کا مال کوئی اور کھائے ، یتیموں کا پیسہ کہیں اور خرچ ہو، آخر مجھے اللہ کو منہ دکھانا ہے کہ نہیں''۔

''اسی وقت امام قاری جان محمد نے کلائی پر بندھی سنہری چین کی گھڑی پھر دیکھی اور ایک جھٹکے سے یہ کہہ کر اٹھ گئے۔

''مغرب کا وقت ہوگیا''۔

(جنوری ۱۹۹۱)

بارش کا نزول

''ان لوگوں کی مثال ایسی ہیں جیسے آسمان سے بارش ہورہی ہو۔ اس میں چمک ہو، کڑک ہو، اور یہ کڑک کی وجہ سے موت کی ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لے رہے ہوں۔ یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کیلئے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے''۔

(سورۂ بقر)

اُن چاروں نے ریگستان میں خیمہ گاڑ کر طنابیں کھینچ دی تھیں اور اب منہ اٹھائے آسمان کو تک رہے تھے۔

''کیا دیکھ رہے ہو''؟ چوتھے نے پہلے سے پوچھا تو اس نے جواب دیا ''وہی جو دوسرا دیکھ رہا ہے''۔

''مگر میں تو کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہا ہوں''۔ دوسرے نے صفائی پیش کر دی لیکن آسمان کو تکنا بند نہیں کیا۔

''تو میں وہ دیکھ رہا ہوں جو یہ دیکھ رہا ہے''۔

پہلے نے تیسرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر تیسرا گھبرا کر بولا۔'' یہ جھوٹ ہے مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے''۔

ان کی باتیں سن کر چوتھا بولا۔

''تم تینوں اندھے ہو مجھے تو بادل کا ٹکڑا نظر آنے لگا ہے''۔

اِس انکشاف پر باقی تینوں دوڑ کر چوتھے سے لپٹ گئے۔''تو تم نے دیکھ لیا؟'' انہوں نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔

اپنی نگاہیں آسمان سے ہٹائے بغیر چوتھے نے جواب دیا۔''ہاں! میں نے دیکھ لیا۔ میں نے کہا تھا نہ ایک دن بارش ہو کر رہے گی''۔

''مگر جب ہم چلے تھے تو آسمان صاف تھا اور اب بادل کا یہ ٹکڑا کہاں سے آ گیا'' پہلے نے حیرت سے کہا۔

چوتھا آسمان پر نگاہیں بدستور جمائے ہوئے بولا۔

''میں نے زائچہ دیکھا تھا اسی طرح جس طرح ہمارے اجداد نے دیکھا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ایک دن آئے گا جب بارش ہوگی اسی طرح جس طرح ہمارے اجداد کو معلوم تھا اور وہ دن شاید آ گیا''۔

''لیکن تم ڈر کیوں رہے ہو ہم نے تو خیمہ گاڑ لیا ہے'' دوسرے نے ہمت بندھانے کے لئے کہا۔ حالانکہ اس کے چہرے کا رنگ خود ہی اڑ گیا تھا۔

''دوسرے کی بات سن کر چوتھا بولا''۔

''یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم نے خیمہ گاڑ لیا۔ لیکن بارش مسلسل ہوگی اور ہمارا خیمہ اکھڑ جائے گا یہ ہمیں معلوم ہے اسی طرح جس طرح ہم سے پہلے آنے والوں کو معلوم تھا کہ ایک دن آئے گا جب بارش ہوگی اور ہمارا خیمہ اکھڑ جائے گا اور پھر بارش کا پانی ریگستانوں میں بہتا ہوا سمندر میں گرے گا اور سمندر کے پانیوں سے ہم آغوش ہوتا ہوا میدانوں میں جائے گا اور وہاں سے پہاڑوں

باطن تک افسانہ نگار کی رسائی اپنے طلسم میں کچھ اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ ہم افسانے کے اختتام کے بعد بھی اس کے حصار سے نکل نہیں پاتے۔ بلکہ نکلنا نہیں چاہتے۔ اگر ہم کرامت علی ہیں تو ہمیں اپنی دینداری، صوم وصلوٰۃ کی پابندی سب کچھ محض فریب نظر آئے گی۔ اگر ہم قدرت النساء ہیں تو بے بسی اور ندامت شرمندہ ہونے سے نہیں بچا سکے گی۔ اور اگر بفضل خدا ہم قمر الحسن ہیں تو قدرت النساء کی پاکیزہ اور معصوم محبت، اس کی بے بسی اور ندامت ہمیں بے اختیار اسے گلے لگانے کے لئے مجبور کر دیگی۔ یہ افسانہ حقیقی رشتوں کا عرفان، رشتوں کا تقدس اور ان رشتوں کو سلامت رکھنے کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ ادب کا تہذیب اور اعلیٰ اقدار سے رشتہ کیسے قائم کیا جا سکتا ہے اس کا پتہ بھی اس افسانے سے ملتا ہے۔

''شناخت''، ''جوٹھن''، ''کارگل کا تحفہ''، ''ادیا پرشاد'' اور ''مدرسے سے قبر تک''۔ ہاشمی کے ایسے افسانے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد ذہن میں ان کی گونج تادیر قائم رہتی ہے۔ ''مدرسے سے قبر تک'' افسانہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہاشمی مذہب کی تعلیم کے لئے منفی طریقۂ کار Negative out look کو معصوم ذہن کے لئے نقصان دہ قرار دیتے ہیں۔ اور بچوں کی تعلیم کے لئے ایسا طریقہ اپنانے کی وکالت کرتے ہیں جو اسے خوف زدہ نہ بنا دے۔ اس کے دل میں مذہب سے بیزاری نہ پیدا ہو بلکہ محبت کا جذبہ ابھرے وہ خود بھی ترقی کرے، قوم بھی اور ملک بھی

ہاشمی کے افسانوں کی ان خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا صرف اس لئے ضروری تھا کہ ہمارے ناقدین نے اب تک ان پر توجہ نہیں دی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہاشمی کے پاس ان کے رسالہ گلبن کے سبب تمام ایسے وسائل موجود تھے جن کے ذریعے اگر وہ چاہتے تو اپنے قارئین، اپنے قلمکار ساتھیوں اور نقاد حضرات کو متوجہ کر سکتے تھے۔ مگر ان کی انکساری اور شرافت نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ آپ چاہیں تو اسے ان کے قلندرانہ مزاج، عجز وانکسار یا درویشانہ روش سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے نقاد کب تک مرحوم قلمکاروں کی قبر پر چادر چڑھاتے رہیں گے وہ کب تک اپنے گروہ کے زندہ قلمکاروں کو بانس پر چڑھا کر بجوکا بناتے رہیں گے۔ انہیں کون یاد دلائے گا کہ تنقید کا منصب کیا ہے؟ اپنے مضمون میں ہاشمی کے دیگر افسانوں پر مزید گفتگو نہ کرتے

پر چڑھ دوڑے گا''۔

چوتھا خاموش ہوگیا اور باقی تینوں کو دیکھنے لگا جو اس کی بات سن کر تھر تھرانے لگے تھے۔

''ارے تم تو ڈر گئے''۔اس نے پہلے کو ہلایا۔اس پر پہلا خفت مٹاتے ہوئے بولا۔''ڈرنے کی کیا بات ہے بادل کا ٹکڑا بہت چھوٹا ہے یہ پورے ریگستان پر کیسے چھا سکے گا۔اس کے علاوہ ہمارے پاس خیمہ جو ہے''۔

اس پر چوتھا بولا۔

''مگر ہمارا ذائچہ غلط کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم سے پہلے گزرنے والوں نے ہمیں خبردار کیا ہے کہ ایک دن بارش ضرور ہوگی اور بجلی کڑکے گی اور ہمارے خیمہ کو ہمارے جسموں کے ساتھ جلا کر خاک کردے گی''۔

چوتھے کی بات سن کر دوسرا بول اٹھا۔

''لیکن ابھی بادل کا ٹکڑا محض ایک پرندے کی طرح اڑ رہا ہے۔کل صبح دیکھیں گے اب چلو خیمے میں آرام کریں کہ ہم چرواہوں کی ڈرپوک اولاد نہیں۔ہم نے اپنے خداؤں کو کبھی ناراض نہیں کیا''۔

وہ سب خیمے میں جا کر اپنی اپنی گدڑیوں میں دبک گئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن نیند کسی کو نہ آئی۔تھوڑی دیر بعد چوتھے نے پکارا۔

''تم لوگ سو گئے کیا؟''

''نہیں تو''باقی تینوں ایک ساتھ بولے۔

''میں تم لوگوں کو ایک ترکیب بتاتا ہوں۔''چوتھے نے کہنا شروع کیا''وہ یہ کہ جب بارش شروع ہو تو ہم خیمے سے باہر نکل پڑیں اور بھیگ جائیں کہ بھیگے جسموں کو بجلی نہ جلا پائے گی۔''

چوتھے کی بات سن کر باقی تینوں ہنسے لگے

''تمہاری عقل ماری گئی ہے۔''تیسرے نے چوتھے کا مذاق اڑایا۔''اس سے بہتر ہے کہ ہم خاموش ہو جائیں اور اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر آنکھیں بند کرلیں اس طرح بجلی کی کڑک

ہمارے اعصاب کو تکلیف نہ دے گی اور روشنی سے ہماری آنکھیں اندھی نہ ہوں گی اور ہم نیند کی آغوش میں چلے جائیں گے اور جب اٹھیں گے تو مطلع صاف ہوگا''۔

تیسرے نے اپنی بات ختم کی تو پہلے نے پوچھا۔

''اگر طوفان آجائے تو۔'' اس پر چوتھے نے کہا

''طوفان کی بات ہمارے اجداد نے نہیں بتائی ہے صرف اتنا بتایا ہے کہ بارش ہوگی اور پانی پھیلتا جائے گا۔ وہ ریگستانوں سے نکل کر سمندروں کو روندے گا۔ وہاں سے نکل کر میدانوں میں جائے گا اور دیکھتے دیکھتے مشرق مغرب شمال جنوب سیراب ہو جائیں گے اور ہم میں جو بھیگے گا بجلی اسے جلا نہ پائے گی۔ جو خیمہ میں چھپا رہے گا اس پر ہی بجلی گرے گی''..... چوتھا اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ پہلے نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔

''تم ہونق ہو۔ بجلی کو اگر گرنا ہوگا تو باہر گرے گی پورا ریگستان چھوڑ کر وہ ہمارے خیمے پر کیوں گرنے لگی''۔

''لیکن ہمارے زائچے غلط نہیں ہو سکتے۔''

چوتھا اپنی بات پر اڑا رہا۔ ''ہمیں اپنے اجداد کے قول کی صداقت پر شبہ نہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوگا، وہ دیکھتے دیکھتے پورے ریگستان پر چھا جائے گا اور پھر بارش ہوگی اور بارش کا پانی ریگستانوں کو سیراب کرتا ہوا سمندروں کے سینے پر دندناتا ہوا میدانوں میں جا گرے گا''۔

''تم کتنی بار وہی بات دہراؤ گے۔'' تیسرا عاجز آ کر بولا۔

''اچھا تو تم تینوں سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔''

چوتھے نے مشورہ دیا۔ اس پر دوسرا خفا ہو گیا۔

''بیوقوف نہ بناؤ۔ ہم سو جائیں اور جب بارش ہو تو تم چپکے سے باہر چلے جاؤ اور بھیگ جاؤ اور ہمارے خیمے پر بجلی گرے اور ہم خاک ہو جائیں''۔

''تو تم لوگ جاگو۔ میں سو جاؤں۔'' چوتھے نے ایک اور مشورہ دیا اس پر پہلا ہنس پڑا۔

''اب یہ تو اور زیادہ حماقت ہوگی کہ ہم جاگتے رہیں اور تم مزے میں سوتے رہو اور آخر میں پتہ چلے کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ پانی برسا نہ بجلی گری''۔

اب چوتھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے'' اس نے بڑی متانت سے کہا۔ ''ہمارے اجداد نے پیشین گوئی کی ہے کہ آسمان میں بادل کا ٹکڑا نمودار ہوگا، پھر وہ پھیلتا جائے گا، اور صحرا پر چھا جائے گا، پھر بارش ہوگی اور پانی ریگستانوں سے بہتا ہوا سمندروں میں چھلانگ لگا دے گا اور.....''

چوتھا اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ تیسرے نے پھر اسے جھڑک لیا۔ ''تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کب تک ایک ہی رٹ لگاتے رہو گے''۔ تیسرے کی بات سن کر چوتھے نے اپنے کندھے اچکائے۔ پھر بولا۔

''تم لوگ میری بات سنو۔ میں نے زائچہ خود دیکھا ہے''۔ اس پر تینوں اپنی اپنی گدڑیوں سے نکل آئے اور ایک ساتھ بولے ''اچھا کہو'' تب چوتھے نے کہنا شروع کیا۔ ——

''جب بارش ہونے لگے تو ہم لوگ اپنے خیمے اکھاڑ دیں اور خود کو کھلی فضا میں ڈال دیں کہ باہر بارش ہوتی رہے گی اور بجلیوں کا ڈر نہ ہوگا کہ بجلیاں بھیگے جسم پر اثر نہ کریں گی۔ وہ تو خشک جسموں کی ہی متلاشی ہوں گی۔ یہ خیمے ہمارے کس کام کے''۔

چوتھے نے اپنی بات ختم کی تو پہلا زور سے ہنس پڑا۔ باقی تینوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''کیا تمہیں ڈر نہیں لگ رہا ہے؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''نہیں'' پہلے نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' دوسرے اور تیسرے نے ایک ساتھ پوچھا تو پہلے نے بتایا۔

''سفر پر روانہ ہوتے وقت میں نے اپنی جھولی میں ایک خدا رکھ لیا تھا وہ میری حفاظت کرے گا''۔

اس کی بات سن کر دوسرا بھی ہنسنے لگا

''یہ مجھے بیوقوف سمجھتا ہے۔نہیں جانتا کہ میں نے بھی ایک خدا اپنی گدڑی میں چھپا رکھا ہے''۔

دوسرے کی بات سن کر تیسرا بھی قہقہہ لگانے لگا۔

''تم دونوں ہی عقلمند نہیں میں نے بھی اپنی اندرونی جیب میں ایک خدا رکھ چھوڑا ہے۔''

ان تینوں کی بات سن کر چوتھا مایوس ہو گیا

''میرے پاس تو کوئی خدا نہیں، اب میری حفاظت کون کرے گا؟''

وہ رونے لگا۔اس پر باقی تینوں نے اسے چپ کرایا کہ وہ اپنے خداؤں سے اس کی سفارش کر دیں گے۔

چوتھا چپ ہوا تو ان سب نے طے کیا کہ سونا چاہئے اور جب یہ طے پایا کہ سونا چاہیئے تو چوتھے نے مشورہ دیا کہ سونے سے پہلے ایک بار جا کر دیکھ لینا چاہیئے کہ بادل کتنا بڑھ گیا ہے۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔باقی تینوں چوتھے کی رائے سے متفق ہو گئے۔اس پر چوتھا اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر گیا مگر دوسرے ہی لمحے چیخ مارتا ہوا خیمے کے اندر گھس آیا۔

''کیا ہوا؟'' باقی تینوں نے گھبرا کر پوچھا۔

''بادل پورے ریگستان پر پھیل چکا ہے۔اب تو بارش ضرور ہو گی اور پانی ریگستانوں سے ہوتا ہوا سمندروں میں جا گرے گا اور پھر میدانوں سے ہوتا ہوا.....''

''بکواس بند کرو'' تیسرے نے زور سے ڈانٹا تو چوتھے نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ چند لمحے سکوت کی نذر ہو گئے۔پھر دوسرا بولا۔

''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ صحرا اجالوں کے نرغے میں آ گیا ہے۔کیا تم لوگوں کو ایسا نہیں لگتا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' تیسرے نے تائید کی۔''مگر ایسا کیوں ہے؟ بادل گھرنے سے اندھیرا بڑھ جانا چاہیئے''۔

''یہ سفید بادل ہیں''۔چوتھے نے بتایا۔''ہم سے پہلے گزرنے والوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ بادل سفید ہوں گے مگر پانی سے بھرے ہوں گے اور بارش شدید ہو گی اور پانی ریگستانوں

سے گزرتا ہوا.....''

''یہ دیوانہ ہوگیا ہے۔'' پہلے نے حقارت سے کہا۔''بار بار وہی بات کہہ رہا ہے۔ اس کا اعتماد ہمارے خداؤں سے اٹھ گیا ہے ورنہ اس کی جھولی میں بھی کوئی خدا موجود ہوتا اور یہ قابو میں ہوتا۔''

پہلے کی بات سن کر چوتھا سوچ میں پڑ گیا۔ اتنے میں زور سے بجلی تڑکی چاروں منہ کے بل زمین پر لیٹ گئے۔ چند ساعتوں بعد چوتھا بیٹھتے ہوئے بولا۔ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں کہیں بارش تو شروع نہیں ہوگئی''۔

''خبردار'' باقی تینوں نے اسے پکڑ لیا۔

''اچھا تو میں خیمے کے سوراخ سے جھانک کر دیکھتا ہوں''۔ اتنا کہہ کر چوتھا ایک جھٹکے کے ساتھ تینوں کی گرفت سے آزاد ہوگیا اور خیمے کی دیوار کے پاس پہونچ گیا۔ اس نے پردے میں ایک سوراخ تلاش کر لیا اور اس پر اپنی ایک آنکھ لگا کر باہر جھانکنے لگا۔ دفعتاً وہ فرطِ مسرّت سے چیخ اٹھا۔

''ارے پورا ریگستان تر و تازہ ہوگیا۔ بارش برستی جا رہی ہے۔ تم لوگ ذرا سوراخ کے قریب آؤ اور دیکھو کہ کیسی فرحت بخش ہوا چل رہی ہے۔''

''نہیں'' باقی تینوں نے سہم کر کہا اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ چوتھے نے سوراخ کو پھاڑ کر بڑا کر دیا اور اس کے اندر اپنی ناک ڈال کر گہری گہری سانس لینے لگا۔ وہ خیمے سے چپک گیا تھا۔

باقی تینوں تھر تھرانے لگے۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنے خداؤں کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالا اور انہیں سینوں سے لگا کر گڑگڑاتے ہوئے نجات کی بھیک مانگنے لگے۔

چوتھے نے سوراخ کو کشادہ کر دیا اور پورا سر باہر نکال کر مسرّت سے چلانے لگا۔

''ارے تم تینوں آ کر دیکھو کتنا دلفریب منظر ہے۔ کیسی سوندھی سوندھی مہک زمین سے اٹھ رہی ہے۔ پورا ریگستان بیدار ہوگیا ہے۔ چپہ چپہ سیراب ہوگیا ہے''۔

وہ تینوں اپنے اپنے خداؤں کو اپنی پیشانیوں سے رگڑنے لگے اور چیخنے لگے۔

''اے خدا ہمیں بجلی سے محفوظ رکھ۔'' انہوں نے اپنے سروں کو ایک دوسرے سے جوڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اسی وقت بجلی پھر تڑکی۔

چوتھے نے خیمے کا سوراخ مزید بڑا کر دیا اور آدھا دھڑ باہر نکال کر چیخنے لگا۔

''ذرا دیکھو تو جب بجلی چمکتی ہے تو پورا ریگستان روشن ہو جاتا ہے اور بارش کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ ارے تم لوگ کتنے بدقسمت ہو کہ اس دلفریب منظر سے محروم ہو''۔

باقی تینوں نے اب رونا شروع کر دیا۔

''اے خدا ہم پر رحم کر۔ ہم نے تم میں سے کسی کے ساتھ نافرمانی نہیں کی۔ گرچہ ہمارے اجداد نے بادل کے اس سفید ٹکڑے کا ذکر کیا تھا لیکن ہمیں تمہاری طاقت پر بھروسہ تھا اور ہم نے خیمے گاڑ لئے تھے کہ ہم یہاں بجلی سے محفوظ رہیں گے اب تو ہی حفاظت کرنے والا ہے''۔

اسی وقت بجلی اتنی زور سے چمکی کہ ان تینوں کو ایسا لگا جیسے خیمے میں آگ لگ گئی ہو۔ وہ گھبرا کر ایک دوسرے سے گتھ گئے اور اپنے اپنے بال نوچنے لگے، اور ہذیان بکنے لگے۔

چوتھے نے خیمے کی چادر پھاڑ ڈالی اور باہر نکل گیا۔ اس کا باہر نکلنا تھا کہ بجلی پھر تڑکی اور ایک شعلہ اسی سوراخ سے اندر داخل ہو گیا۔

وہ تینوں اندر تھے مگر اس طرح کہ نہ اب وہ دیکھ سکتے تھے اور نہ سن سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے کہ صحیفوں میں ان کا ذکر بار بار آیا ہے۔

اور چوتھا باہر کھڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور بارش کا پانی ریگستانوں کو سیراب کرتا ہوا، سمندروں کی سطح پر اچھلتا ہوا، میدانوں سے گزرتا ہوا، پہاڑوں کو سر کرتا ہوا کرۂ ارض پر پھیل رہا تھا۔

(ستمبر ۱۹۸۴)

مدرسے سے قبر تک

گاؤں کے باہر ایک مسجد تھی۔ جس کے صحن میں نیم کا ایک گھنا درخت تھا اور اس درخت کے نیچے ایک پختہ چبوترہ تھا جو گاؤں کا مدرسہ تھا۔ اسی پر لڑکے سروں پر ٹیڑھی، میڑھی، کچھ صاف کچھ میلی ٹوپیاں اوڑھے اور کمسن لڑکیاں دوپٹوں سے اپنے سروں کو منڈھے جھوم جھوم کر سپارے پڑھ رہے تھے۔ مولوی صاحب جو مسجد کے امام بھی تھے نیم غنودگی کے عالم میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں سوتا سمجھ کر بچوں نے آواز مدھم کر دی۔ مگر مولوی صاحب سوئے کہاں تھے۔ وہ تو بس اونگھ رہے تھے۔ کانوں پر آواز کی ضرب ہلکی پڑی تو انہوں نے چپکے سے آنکھیں کھولیں اور اپنے شاگردوں کو گھورا۔ مولوی صاحب کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے سرخ ڈوروں کی گرفت میں بچوں کی روحیں آ گئیں اور وہ زور زور سے پڑھنے لگے۔ مولوی صاحب نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

چند منٹوں کے بعد بچوں کی آوازیں دوبارہ کمزور پڑیں تو انہوں نے شاطرانہ انداز سے آنکھیں کھولیں۔ پاس رکھی چھڑی اٹھائی اور اسے فرش پر دے مارا۔

''سپارے بند کرو اور اردو کی کتاب نکالو''۔

انھوں نے حکم دیا۔تمام بچّوں نے جھٹ پٹ سپارے بند کردئے۔رحل سمیٹ کر ایک طرف رکھدیا اور اپنی اپنی تھیلیاں ٹٹول ٹٹول کر اردو کی کتاب نکالی۔مولوی صاحب نے سب کو باری باری دیکھا اور جب انہیں یقین ہوگیا کہ ہر بچّہ ان کے وجود کے احساس سے دب کر، سہم کر، گردن جھکائے، ہاتھ میں کتاب تھامے اپنی زندگی سے عاجز ہو چکا ہے تو انہیں اطمینان ہوگیا اور انہوں نے آنکھیں دوبارہ بند کرلیں اور اپنے عزیز شاگرد سے بولے۔

''جابر آج کا سبق یاد کراؤ''۔

مولوی صاحب کے قریب بیٹھا جابر اچھل کر کھڑا ہوگیا۔اس نے اپنی دوپلّی ٹوپی ذرا سی کج کی آنکھوں میں اپنے استاد کی کرختگی اور چہرے پر خشونت طاری کرلی۔اس نے دونوں ہونٹ سکوڑ لئے اور گردن تان کر مولوی صاحب کی چھڑی اٹھالی۔تمام ننھے منّے بچّوں کے جسموں میں زلزلہ آگیا۔ایسا زلزلہ جس سے زمین پھٹتی تو نہیں، آتش فشاں ابلتا تو نہیں مگر زمین دہل ضرور جاتی ہے۔ان کے نرم اور ملائم اجسام کانپنے لگے۔اور نازک دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگے۔

جابر نے بچّوں پر طائرانہ نظر ڈالی۔سب کی گردنیں جھکی ہوتی تھیں اور وہ اپنی اپنی کتابیں کھولے آنے والے لمحے کا دھڑکتے دلوں سے انتظار کررہے تھے۔

جابر کو جب اطمینان ہوگیا کہ وہ ہر ایک کے حواس پر چھا چکا ہے اور سارے بچے اپنی اپنی قبروں میں گھس چکے ہیں تو اس نے اپنے چہرے پر کرختگی کچھ زیادہ ہی کرلی اور حکم دیا۔

''عذاب قبر والا سبق نکالو''۔

بچّوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔مدرسے میں داخل ہونے کے بعد ان کے چہروں پر جو تھوڑی بہت شگفتگی باقی رہ گئی تھی وہ بھی کافور ہوگئی۔جلدی جلدی سبھوں نے قبر والا سبق نکال لیا۔

''پہلے میری بات ہوگی، پھر سبق''۔

اتنا کہہ کر جابر نے قریب بیٹھی ایک بچّی کے سر پر مولوی صاحب والا ڈنڈا مار دیا۔وہ بیچاری 'سی' کہہ کر رہ گئی۔

''یہ تو آخرت والا سبق ہے۔قبر والا نکال''۔

جابر نے دوسری مرتبہ لڑکی کو پیٹ دیا۔ وہ مجبور اس بار بھی ''سی'' کہہ کر رہ گئی اور جلدی سے قبر والا سبق نکال لیا۔ جابر نے قہر آلود نگاہوں سے تمام بچوں کو دیکھا جن کی گردنیں جھکی ہوئیں تھیں اور نگاہیں کتاب پر مرکوز تھیں۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا ٹوپی ٹھیک کی اور کہنا شروع کیا۔

''تم آج نہیں تو کل مرو گے۔ پھر قبر تمہارا مسکن ہوگا۔ منکر نکیر سوال کریں گے جو ایمان والے ہوں گے وہ جواب صحیح دیں گے اور جو گنہ گار ہوں گے وہ گڑبڑا جائیں گے۔ کچھ کا کچھ کہہ جائیں گے۔ پھر وہ چلے جائیں گے تو گناہ گاروں کی قبریں سکڑنے لگیں گی اور سکڑتے سکڑتے وہ اتنی تنگ ہو جائیں گی کہ مردے کی ہڈیاں چٹخنے لگیں گی۔ چٹ، چٹ، چٹ''۔

جابر نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا اور انہیں مروڑنے لگا۔ انگلیاں ٹوٹنے لگیں۔

''اسی طرح تمہاری ہڈیاں ٹوٹیں گی۔ یعنی گنہ گاروں کی ہڈیاں ٹوٹیں گی۔ پھر قبریں اپنی اصلی حالت میں آجائیں گی اور یہ عمل جاری رہے گا قیامت کے دن تک''۔

جابر نے ہونٹ سکوڑ کر موت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے بچوں کو دیکھا جن کے بھولے بھالے چہروں پر آدھی رات کی سیاہی پھیل گئی تھی، چند سیکنڈ تک وہ فاتحانہ انداز میں سر ہلاتا رہا، پھر بولا۔

''وہاں بالکل اندھیرا ہوگا، روشنی کی ایک کرن بھی نہ ہوگی نہ ہوا کا دخل ہوگا نہ پانی کا گذر۔ دانا ہوگا نہ کھانا۔ دوست ہوں گے نہ عزیز، دنیا کی تمام آرائشوں اور مسرتوں سے بے بہرہ گنہ گار مردہ تنہا قبر کی کوٹھری میں پڑا مختلف الاقسام کیڑے مکوڑوں، سانپ بچھوؤں کی صحبت میں اپنے مقدر کو روتا ہوگا اور.....''۔

یکا یک جابر چپ ہوگیا۔ اس نے گھور کر ایک لڑکے کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ سارے بچوں کے چہروں سے رونق اڑ گئی تھی۔ سبھی دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ قبر کے عذاب کو سن کر سب کے سب اپنی زندگی سے بیزار لگنے لگے تھے۔ بہتوں کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے اور کئی ایک تو سسکنے بھی لگے تھے۔

مگر وہ لڑکا اطمینان سے بیٹھا رہا۔ جابر کو حیرت ہوئی۔ اس کی تقریر سے تو مولوی صاحب

تک استغفراللہ کہہ اٹھتے تھے اور بڑے بڑوں کے چہرے بے نور ہو جایا کرتے تھے۔ مگر یہ لڑکا تھا کہ بیٹھا ٹکر ٹکرا سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ حد ہو گئی تھی۔

جابر کندھوں سے جھک گیا اور چھڑی ٹیکتا ہوا اس لڑکے کی طرف اس انداز سے بڑھنے لگا جیسے شیر اپنے شکار پر حملہ آور ہونے والا ہو۔ لڑکے کے پاس پہنچ کر اس نے چھڑی کا آخری سرا اس کے کندھے پر رکھ کر دبا دیا اور پوچھا۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

''رحمت علی'' لڑکا جلدی سے بولا۔

''ہوں۔ تجھے ڈر نہیں لگتا مردود''

اس نے رحمت علی کے سر پر چھڑی ماردی۔ مگر رحمت علی کچھ نہ بولا ''سی'' بھی نہ کیا۔ جابر کا غصہ اور بڑھ گیا۔ اس نے گرج کر پوچھا۔

''بولتا کیوں نہیں''

''آج یہ پہلی بار مدرسے آیا ہے''۔ ایک لڑکے نے بتایا۔

''ہوں، تبھی آداب سے واقف نہیں''۔ مولوی صاحب بول پڑے۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے ورنہ ممکن ہی نہ تھا کہ ان کے مدرسے میں دو چار دن بھی جو ٹِک جاتا اس کے چہرے پر خوشی اور زندگی کا شائبہ تک باقی رہ جاتا۔

جابر علی نے رحمت علی کو دھکا دے دیا

''دفع ہو جا یہاں سے شیطان''۔

رحمت علی نے جلدی سے اپنا بستہ سنبھالا اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔

راستہ میں اسے بے تحاشہ دوڑتے ہوئے دیکھ کر کسی نے پوچھا۔ ''کیوں رحمتوا کہاں سے بھاگا ہوا آ رہا ہے؟''

''قبر سے''۔ رحمت علی نے بوکھلا کر کہا اور رفتار تیز کر دی۔

(اکتوبر ۱۹۸۱)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب : جب ایسا ہو (افسانے)

مصنف: سید ظفر ہاشمی

پتہ: ۳۱۔۳۰ حسن گارڈن کالونی، کمتا، چنہٹ، لکھنؤ۔227105

انتخاب و پیشکش: رشید افروز

پتہ: آمین سوسائٹی، باغ نشاط، سرکھیج روڈ، احمد آباد 380055 فون 26810927 (079)

تعداد: 400

قیمت: 100 روپے

اشاعت: مئی 2005

ناشر: العصر پبلی کیشنز، احمد آباد

طباعت: پارکھ آفسٹ پریس، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

کمپیوٹر کمپوزنگ : ایچ۔آئی۔کمپیوٹر، ندوا روڈ، ڈالی گنج لکھنؤ

تقسیم کار: دوماہی گلبن 31-30 حسن گارڈن کالونی، کمتا، چنہٹ، لکھنؤ-227105

JAB AISA HO
SELECTED SHORT STORIES OF SYED ZAFAR HASHMI
Selected and Presented by Rasheed Afroz

Edition May 2005

Price - Rs. 100/-

ہوئے آخر میں ایک اور افسانے کی بات کروں گا اور آپ سے اجازت چاہوں گا۔

ہاشمی نے ملوں اور کارخانوں میں مزدوروں کو پیش آنے والے حادثات اور اس پر انہیں ملنے والا معاوضہ کو جسے ہم Accident Claim یا Compensation کہتے ہیں، موضوع بناتے ہوئے ایک بے مثال افسانہ لکھا ہے اس افسانے کا عنوان ہے ''ادھورا کام''۔

اس افسانہ میں ہاشمی نے چند مِل مزدوروں کی زندگی، ان کی غربت، ان کی نجی ضروریات بیحد کم تنخواہ اور خوابوں کی دنیا کو بڑی فنکاری کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ مِل میں ایک گروہ ہے جس کا سرغنہ ''جما'' ہے۔ جو بظاہر تو مِل مزدور ہے مگر بے حد شاطر، عیار اور فریبی۔ اس نے مِل کے بابو، مِل کے ڈاکٹر، انشورنس ایجنٹ اور عضو کاٹنے والے سرجن کے ساتھ مل کر ایسا جال بچھایا ہے کہ مزدور معاوضہ کی لالچ میں آکر مشین میں اپنے اعضاء خود ڈال کر ایکسیڈنٹ کروانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مِل کا بابو غلط رپورٹ بناتا ہے۔ مِل کا ڈاکٹر اسے Certified کرتا ہے انشورنس ایجنٹ انشورنس کمپنی کے ڈاکٹر کے ذریعے مل کر Cliam Papers تیار کرتا ہے Claim کی بڑی رقم کا اچھا خاصا حصہ یہ سب آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور اس کا ایک قلیل حصہ اس مزدور کو ملتا ہے جس نے اپنے جسم کے ساتھ یہ ظلم صرف اس لئے گوارہ کیا کہ پرانا قرض ادا ہو جائے، جوان بیٹی کی شادی کا بوجھ اتر جائے رکشہ یا ٹریکٹر خرید لے، گاؤں میں دو چار بیگھا زمین خرید لے کنواں کھودوالے یا ٹیوب ویل لگوالے۔

افسانہ میں ایکسیڈنٹ کے لئے ورغلانے کا جما کا طریقہ دیکھئے۔

''کریم کو اتنا غصہ آیا کہ اس کا جی چاہا کہ وہ جتا کو ماں بہن کی گالی سنادے، مگر جتا معمولی گوشت پوست کا بنا ہوا تو نہیں تھا، نہ جانے کتنے ہاتھ پیر یہاں تک کہ گردن تک کٹوا چکا تھا۔ کریم کی کیا اوقات تھی۔ وہ اندر ہی اندر ابال کھا کر رہ گیا..... بولا

میں ہاتھ نہ کٹواؤں گا۔ مجھے نہیں چاہیئے کھیت کھلیان۔

''سالا''۔ جما نے اس کے پیٹ میں گھونسہ مار دیا۔ بڑا آیا ہاتھ والا۔ اکڑنا ایسے ہے جیسے برس لی کا ہاتھ لئے پھر رہا ہو۔ ابے زندگی بھر مل کی مزدوری

ادھورا کام

کریم نے ٹٹول کر کرتے کی ایک جیب سے بیڑی اور دوسری جیب سے ماچس نکالی لیکن بیڑی سلگانے کیلئے جب اس نے ماچس جلانی چاہی تو اسے یاد آیا کہ داہنے ہاتھ کا انگوٹھا تو اس نے کٹوا دیا ہے۔ اس نے ماں کی گالی دی۔ پتہ نہیں یہ گالی اس نے اپنی ماں کو دی تھی یا جتا کی ماں کو جس نے ورغلا کر اس کا انگوٹھا کٹوا دیا تھا اور مل سے معاوضہ کے طور پر سات ہزار روپے دلوائے تھے اور خود جتا نے بیچ میں کمیشن کے تین ہزار روپے مار دئے تھے۔ جس میں اس کے علاوہ بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر، مل کا بابو اور انگلی کاٹنے والا سرجن بھی شریک ہوئے تھے۔ اک ذرا سی تگڑم سے مل سے دس ہزار روپے مل گئے تھے جسے سب نے مل کر بانٹ لیا تھا۔ باقی دوسرے تو بغیر ڈکار لئے ہی ہضم کر گئے تھے کہ ان کا معمول یہی تھا مگر کریم کو انگوٹھا کھونے کا دکھ تھا۔ اس وقت اس نے نفرت سے جتا کو یاد کیا۔

یہ سب اس کمینے، گھوڑی کی اولاد کی وجہ سے ہوا۔ اس نے اسے پھانسا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جتا یہی دھندا کرتا ہے۔ کہنے کو تو وہ مل میں کاریگر ہے مگر اس کی کاری گری سانچہ چلانے، کپڑا رنگنے، یا اس پر پالش کرنے میں نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے مزدوروں کا ایکسیڈنٹ کرانے میں ہے۔ اس کے

پاس جسم کے ہر عضو کے ریٹ ہیں۔ مجھ سے کہتا تھا کہ بائیں ہاتھ کا انگوٹھا کٹوا دو سرکاری انگوٹھا ہے پندرہ ہزار مل جائیں گے۔ مگر وہ تو کہو میں اس کے چکر میں نہیں آیا۔ مگر آیا کیوں نہیں۔ آ ہی تو گیا تبھی تو داہنے ہاتھ کا انگوٹھا کٹوا بیٹھا۔ اب بیڑی جلانے کے لئے دیا سلائی کو انگلیوں میں پھنسا کر جلانا پڑتا ہے۔ سؤر کا بچہ جتنا۔

اس نے بھک سے ماچس جلائی اور بیڑی کے دو تین لمبے لمبے کش لے کر گزرے واقعات کو ذہن میں تازہ کرنے لگا۔ سات ہزار روپیوں سے اس نے اپنے گاؤں میں دو بیگھ کھیت خریدا تھا تو سب پر رعب پڑ گیا تھا۔ کیا مولوی کیا پنڈت کیا چمار کیا چھڑی سب ہی کھسیا کر رہ گئے تھے۔ لیکن یہ بھی تو ہوا تھا کہ تحصیل میں رجسٹرار کے سامنے جب بیعہ نامہ کے کاغذات پر دستخط کرنے کیلئے اسے قلم دی گئی تھی تو اس نے لپک کر قلم پکڑی تو تھی۔ مگر فوراً ہی پھس ہو کر رہ گیا تھا۔ جیسے بدن سے یکا یک ہوا نکل گئی ہو اور وہ پچک گیا ہو۔ اس نے اپنے ہاتھ کی اس جگہ کو دیکھا تھا جہاں کبھی اس کا انگوٹھا ہوا کرتا تھا۔ اور جہاں اب گوشت کا چھوٹا سا لوتھڑا تھا۔ اس نے شرمندہ ہو کر قلم رجسٹرار کی میز پر رکھدی تھی اور کہا تھا مجھے لکھنا نہیں آتا۔ میں انگوٹھا لگاؤں گا۔ اس نے اپنے سرکاری انگوٹھے کو دیکھا تھا۔ جس کی قیمت سالا جتنا پندرہ ہزار بتاتا تھا وہ صحیح سالم تھا اسے قدرے خوشی ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اس کا منہ پھر لٹک گیا تھا کہ اگر داہنے ہاتھ کا انگوٹھا کٹوانے کے بجائے اس نے سرکاری انگوٹھا کٹوایا ہوتا تو وہ پڑھا لکھا ہوتے ہوئے بھی خود کو جاہل کیوں کہتا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کاغذات پر انگوٹھا لگایا تھا۔

''گھوڑی کی اولاد''

کریم نے جتا کو پھر گالی دی۔

کمینہ اب بھی نہیں چھوڑتا۔ کہتا ہے انگوٹھا کٹوا دینے سے تو داہنا ہاتھ آدھے سے زیادہ بے کار ہو ہی گیا اب سارا کام تو تم بائیں ہاتھ سے کرنے لگے ہو۔ کیوں نہ داہنا ہاتھ پورا کٹوا دو پچاس ہزار مل جائیں گے اور اتنے روپیوں میں تم دس بیگھ کھیت اور خرید سکتے ہو۔ مگر اس مرتبہ میں اس کے منہ پر تھوک دوں گا۔

مِل جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کریم نے پریشان خیالات کو ذہن سے جھٹکا۔ بیڑی کے تین چار لمبے لمبے کش لئے پھر اسے دروازے کے باہر اچھال کر کھڑا ہو گیا۔ کھولی سے نکل کر وہ مل کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اسے جما مل گیا۔

''کیا بے کریموا کیا سوچا''۔ اس نے کریم کا راستہ روک کر پوچھا۔ کریم سٹپٹا گیا۔ اس نے جما کو دیکھا اس کے چہرے پر خبیث مسکراہٹ تھی۔ کریم کو اتنا غصہ آیا کہ اس کا جی چاہا کہ وہ جما کو ماں بہن کی گالی سنا دے مگر جما معمولی گوشت پوست کا بنا ہوا تو تھا نہیں نہ جانے کتنے ہاتھ پیر یہاں تک کہ گردن تک کٹوا چکا تھا۔ کریم کی کیا اوقات تھی۔ وہ اندر ہی اندر ابال کھا کر رہ گیا۔ بولا

''میں ہاتھ نہ کٹواؤں گا۔ مجھے نہیں چاہیئے کھیت کھلیان''۔

''سالا''۔ جما نے اس کے پیٹ میں گھونسہ مار دیا۔ ''بڑا آیا ہاتھ والا۔ اکڑتا ایسے ہے جیسے بُرس لی کا ہاتھ لئے پھر رہا ہو۔ ابے زندگی بھر مل کی مزدوری کرے گا۔ ہاتھ گھس گھسا کر گھڑیال کی پیٹھ بن جائے گا۔ ایسا موٹا، بھدا، کھردرا کہ جورو بھی دیکھ کر ڈرے گی۔ پچاس ہزار روپیوں سے تُو دس بیگھ کھیت خرید کر گاؤں کا زمیندار بن سکتا ہے۔ جن کھیتوں پر تیری سات پشتیں دوسروں کے لئے ہل چلاتی چلاتی مر کھپ گئیں وہ کھیت تیرے ہو سکتے ہیں اور تُو چودھری بن کر مینڈ پر کھڑا ہو کر مزدوروں کو گالیاں دے سکتا ہے۔ ایک ہاتھ دے کر ڈھیر سارے ہاتھ مل سکتے ہیں۔ کیا سمجھے؟''۔

کریم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بڑی خفگی سے بولا

''میں تیرے جھانسے میں نہیں آؤں گا جما میں ٹنڈا بن کر جینا نہیں چاہتا۔ میں جھولتی آستین سے یاری نہیں کروں گا۔ میں نے انگوٹھا کٹوا کر ہی بھول کی۔ اللہ نے مجھے ٹھیک ٹھاک بنایا تھا تو نے مجھے ناقص بناڈالا''۔

جما ہنس پڑا۔ ''دیکھ کریم اس معاملہ میں اللہ اور رسول کو بیچ میں نہ لا۔ یہ اپنا پرسنل معاملہ ہے اچھی طرح سوچ لے''۔

''سوچ لیا ہے''

اتنا کہہ کر کریم بڑی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور جما وہیں کھڑا اسے جاتے

ہوئے دیکھتا رہا۔

مل میں جیسے ہی کریم نے اپنا سانچہ چلایا کسی نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کریم نے مڑکر دیکھا تو وہاں رام دین کو پایا۔ رام دین بھی اسی کھاتے میں کام کرتا تھا۔ مگر اِدھر بہت دنوں سے غائب تھا۔ اسے دیکھتے ہی کریم نے پوچھا۔ ''کہاں تھا رام دین دیس گیا تھا؟''

''نہ یار''۔ رام دین بولا۔ ''سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے تو جاؤں''۔

''کیا ٹھیک ٹھاک''۔ کریم نے پوچھا۔

اس سوال پر رام دین حیرت سے کریم کا منھ تکنے لگا۔ ''تمھیں نہیں معلوم کریم بھیّا۔؟''

''نہیں''۔ کریم نے لاعلمی ظاہر کی۔ ''کیا ہوا کچھ بتاؤ''۔

جواب میں رام دین نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا اس کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ کریم کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی بولا۔ تو جمّا نے تمہارا بھی ایکسیڈنٹ کرا دیا۔''

میں نے خود کہا تھا

''کیوں؟''

پیسے کی ضرورت تھی۔ میرے حصے میں تیس ہزار روپے آئے ہیں۔

تیس ہزار؟ کریم کا منھ حیرت سے کھل گیا۔ ''ہاں بھیّا پورے تیس ہزار، چالس ہزار کا کلیم پاس ہوا ہے۔ دس ہزار روپے وہ لوگ لیں گے اور باقی مجھے ملیں گی''۔

''مگر تین انگلیوں کے چالیس ہزار؟ کریم کو یقین نہیں آ رہا تھا

''ہاں اور کیا۔ میری عمر ابھی پچیس برس کی ہے نہ میرا ٹکا زیادہ ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے ٹکا کم ہوتا جاتا ہے۔ تمہارا ٹکا مجھ سے کم ہوگا''

''مگر تمہارے ہاتھ میں اب دو ہی انگلی رہ گئی ہے۔ انگوٹھا اور سب سے چھوٹی جیسے ہتھیلی پر دو سینگ نکل آئی ہوں۔ ایک اِدھر ایک اُدھر''۔

''وہ تو ہے''۔رام دین کچھ رنجیدہ ہوگیا۔چند لمحے دونوں خاموش رہے پھر رام دین بولا۔

''کریم بھیّا ان انگلیوں نے مجھے کیا دیا تھا۔مہینے کے چار سو روپے ہی نہ۔وہ تو اب بھی ملیں گے۔یہ انگلیاں کام ہی کیا کرتی تھیں ان مشینوں پر تو سارا کام خود بخود ہوتا رہتا ہے۔بس آنکھیں ہونی چاہئے۔اس کے علاوہ میرا بایاں ہاتھ تو اب بھی سلامت ہے۔کچھ دن بعد پریکٹس سے سارا کام اس سے کرنے لگوں گا اور انگلیاں کھونے کا غم جاتا رہے گا۔مگر دوسری طرف دیکھو تو کتنا بڑا فائدہ ہے۔تیس ہزار روپیوں سے دو آٹو رکشہ خرید سکتا ہوں جن سے روزانہ سو روپے کی آمدنی ہوسکتی ہے۔

''وہ تو ہے۔مگر۔''

کریم نے کچھ کہنا چاہا مگر رام دین نے بات کاٹ ڈالی۔''اگر مگر کچھ کام نہیں دیتا کریم بھیّا۔کام پیسہ دیتا ہے۔روپے کیلئے آدمی کوئی بھی کام کرسکتا ہے۔میں نے تو صرف اپنی انگلیاں ہی دی ہیں۔لوگ تو عزت دے دیتے ہیں ایمان بیچ دیتے ہیں اور مندروں،مسجدوں اور مقبروں کو نیلام کردیتے ہیں۔میں نے کون سا جرم کیا ہے''۔

اتنا کہہ کر رام دین خاموش ہوگیا۔مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ شباب پر تھی دونوں مزدور اپنے اپنے خیالوں میں غلطاں،تھوڑی دیر بعد کریم بولا۔

''جما تو میرے پیچھے بھی پڑا ہے''۔

''اچھا!رام دین نے دلچسپی لی۔''مگر تمہارے انگوٹھے کا ایکسیڈنٹ تو ہوگیا ہے''۔

''ہاں۔مگر جما کہتا ہے کہ پورا ہاتھ کٹوادو''۔

''سالا۔حرامی ہے''۔رام دین ہنس پڑا۔''ہاتھ کے بعد کہے گا پیر کٹوادو۔اور آخر میں گردن تک آجائے گا۔وہ آدمی کو پیاز کی پوٹلی بنادینا چاہتا ہے اور مزا تو یہ ہے کہ لوگ بنتے بھی ہیں اور ہنسی خوشی بنتے ہیں۔اس کا دھندا خوب چل رہا ہے لوگ دھڑا دھڑ اپنے جسموں کا ایکسیڈنٹ کرارہے ہیں اور گاؤں دیس میں زمین خرید رہے ہیں،محلہ دو محلہ بنوا رہے ہیں،ٹیوب ویل لگوا رہے ہیں،ٹریکٹر خرید رہے ہیں،اولاد کی شادیاں دھوم دھام سے کررہے ہیں۔اب یہی

دیکھو اپنے رحیم چاچا ہیں نہ۔ ان کی لڑکی کی شادی تھی۔ لڑکے نے اسکوٹر مانگا، چاچا کے پاس اتنے روپئے کہاں تھے۔ اپنا انگوٹھا کٹوا دیا اور دس ہزار اینٹھ لئے۔ رمجو نے تو اپنی چار لڑکیوں کی شادی اپنی چار انگلیوں سے کر دی اور اب بائیں ہاتھ سے گندگی بھی دھوتا ہے اور کھانا بھی کھاتا ہے''

''اور تم؟'' یکا یک کریم نے پوچھ لیا۔

رام دین اس سوال کیلئے تیار نہ تھا۔ وہ بوکھلا گیا۔ پھر اپنی بوکھلاہٹ پر قدرے قابو پاتے ہوئے دانت نکال کر بولا۔ ''چلتا ہے یار''۔ اسی وقت ساتھ والے کاریگر نے رام دین کو آواز دی اور وہ اپنے لوم کی طرف چلا گیا۔

رام دین کے جانے کے بعد کریم نے اپنے سانچے پر دھیان دیا۔ اس پر ساڑی چڑھی ہوئی تھی۔ جسے دیکھ کر اسے اپنی بیوی یاد آ گئی۔ دو سال ہو گئے تھے اس سے ملے ہوئے۔ بیچاری ہر خط میں لکھتی تھی کہ منا کو تم نے نہیں دیکھا ہے۔ میرے لئے نہ سہی اس کے لئے آ جاؤ۔ جب سے کھیت خرید کر گئے ہو یہ بھی دیکھنے نہ آئے کہ ان کھیتوں میں کیسی لہلہاتی فصل اُگ رہی ہے۔ ایسی کہ نظر پڑتے ہی آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔

بیوی اور بیٹے کی یاد نے کریم کو بہت رنجیدہ کر دیا۔ وہ پورا وقت دل میں اُمڈتے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا اور جب مل کا سائرن بجا تو اس نے اپنا سانچا بند کیا اور بھاری بھاری قدم اٹھاتا مل سے باہر آ گیا۔

پھاٹک سے نکل کر وہ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے شبراتی مل گیا۔ شبراتی بھی اسی مل میں کاریگر تھا۔ مگر اِدھر بہت دنوں سے وہ کریم سے نہیں ملا تھا۔ کریم نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ بڑے ٹھاٹ تھے اس کے۔ پتلون اور شرٹ پہنے صاحب لگ رہا تھا۔ دھوپ کے چشمے نے تو اور بھی غضب ڈھا دیا تھا۔ بالکل اپٹوڈیٹ والی بات تھی۔ کریم نے اسے دلچسپی اور حیرت سے دیکھا۔ پوچھا۔

''تو شبراتی ہے؟''

''یس''۔ شبراتی نے اکڑ کر کہا۔

کریم کو ہنسی آ گئی۔ پوچھا ''تیرا جنم دوبارہ ہوا ہے''۔

شبراتی خفا ہو گیا۔ بولا۔ ''کریم لگتا ہے تیری کھوپڑی چل گئی ہے''

''پھر؟ یہ تیرا حلیہ یکا یک بدل کیسے گیا اور تُو اتنے دنوں تک غائب کہاں رہا''۔؟

''میں انڈر گراؤنڈ چلا گیا تھا''۔

''کیا مطلب؟'' کریم نے پوچھا۔

شبراتی کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی اس نے بڑے اسٹائل سے چشمہ اتارا۔ کریم نے اس کے چہرے کو دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔

''ارے تیری ایک آنکھ کو کیا ہوا''

شبراتی نے روشن آنکھ دبائی حالانکہ اس کا چہرہ اس حرکت سے اور بھی بھیانک ہو گیا۔ مگر کریم کی سمجھ میں بات آ گئی

''ایکسیڈنٹ.....؟''

شبراتی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''کتنا ملا''

''ساٹھ ہزار''۔

''ہائیں''۔ کریم کو جھٹکا لگا۔ ''کیا کیے اتنے سارے روپے''۔

گاؤں میں ایک ٹریکٹر خرید لیا ہے، کرائے پر دیتا ہوں روز کی آمدنی چالیس پچاس روپے کی ہو جاتی ہے۔ ہرّے نہ پھٹکری رنگ چوکھا۔ اپن اب سیاست میں کودنے والا ہے۔ اِس باجو پرانے ساتھیوں سے ملنے چلا آیا ہوں ورنہ اب اپن کو ٹائم کی شارٹج ہو گئی ہے۔ سیاست کے ہزار لفڑے ہوتے ہیں۔ ڈکیتی، قتل اغوا سارے فن سیکھ رہا ہوں''۔

''اور مل کی مزدوری؟''

''اس پر تو کب کی لات ماردی، کلیم پاس ہوتے ہی راضی نامہ داخل کر دیا تھا'' کریم نے شبراتی کے چہرے کو دلچسپی سے دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ویسے تو سب ٹھیک ہے مگر ایک بات

ہے شبراتی تُو یک چشمیہ ہو گیا''۔

شبراتی نے جلدی سے چشمہ چڑھالیا۔اور خفا ہوتے ہوئے بولا۔

''دیکھ کریم مجھے چھیڑ مت، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا''۔

''اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔کیا یہ حقیقت نہیں کہ اب تیرے ایک ہی آنکھ ہے''۔ کریم بدستور مسکراتا رہا۔

شبراتی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔اس کا ہاتھ اٹھنے ہی والا تھا کہ وہاں جماّ آ ٹپکا جسے دیکھ کر شبراتی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔وہ لپک کر جماّ سے لپٹ گیا۔

''بڑے ٹھاٹ ہیں بیٹے''۔جماّ نے شبراتی کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں استاد تمہارا کرشمہ ہے''۔

''سب ٹھیک ٹھاک ہے نہ''

''ہاں استاد۔میں تو الیکشن لڑنے والا ہوں''

جماّ نے قہقہہ لگاتے ہوئے ایک دھپ شبراتی کی پیٹھ پر لگائی۔بولا۔''لڑو ضرور لڑو۔اب تمہیں کون روک سکتا ہے''۔

اتنا کہہ کر جماّ کریم سے مخاطب ہوا۔''دیکھ لے کریم یہی وہ شبراتی ہے جو تجھ سے مانگ کر بیڑی پیتا تھا، پاؤ روٹی اور چائے پر گذارا کرتا تھا اور اب تُو ہی دیکھ لے میں کیا بولوں۔سامنے کھڑا ہے اور الیکشن لڑنے کی باتیں کر رہا ہے''۔

''استاد تم کریم کو بھی ٹرک بتاؤ''۔شبراتی نے جماّ کو مشورہ دیا۔وہ غالباً بھول گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کریم نے اسے یک چشمیہ کہا تھا۔

''یہ تو گدھا ہے''۔جماّ بولا۔''سسرے کو سمجھاتے سمجھاتے ہار گیا۔مگر مرغ کی ایک ہی ٹانگ رہی۔کہتا ہے مجھے ہاتھ چاہئے پیسہ نہیں۔کئی بار کہا کہ پچاس ہزار روپے سے تُو رئیس بن سکتا ہے مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات آوے جب نہ''۔

''کیوں کریم، سمجھتا کیوں نہیں''۔شبراتی نے پوچھا

مگر کریم نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے ہٹ گیا۔

راستہ میں دلبہار پان ہاؤس پر بیڑی سلگانے کیلئے رکا تو وہاں اُسے بیوی کا خط ملا۔ اسی پان کی دوکان کے پتے پر وہ خط منگوایا کرتا تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور وہیں کھڑے کھڑے خط پڑھنے لگا۔ بیوی نے گھر بھر کی خیریت دے کر اس کی خیریت اللہ سے نیک چاہ کر اور ڈھیر ساری دوسری باتیں لکھ کر آخر میں اطلاع دی تھی کہ رحیم چاچا نے داماد کو اسکوٹر بھی دے دیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ افسوس بھی ظاہر کیا تھا۔ بیچارے کا انگوٹھا مل میں مشین کے نیچے آگیا تھا اور سٹ سے کٹ گیا تھا۔ اسی طرح جسطرح تمہارا انگوٹھا تمہاری لاپرواہی سے کٹ گیا تھا۔

اتنا لکھنے کے بعد اس نے لکھا تھا کہ اب ہاتھ پیر سنبھال کر کام کرنا۔

اس رات کریم دستی میں کھانا کھانے نہیں گیا۔ بستر پر پڑا سوچتا رہا۔ اسے بیوی کی یاد نے سخت پریشان کیا۔ اسے اپنا بیٹا یاد آیا۔ انگوٹھا دے کر خریدے ہوئے کھیت یاد آئے جس میں فصل لہلہانے لگی تھی۔ پھر اس کے سامنے رام دین آگیا۔ ہنستا ہوا مسکراتا ہوا۔ رحیم چاچا آگئے جنھوں نے داماد کو اسکوٹر تک دے ڈالا تھا اور جوار میں اپنی طوطی بلوادی تھی۔ شبراتی آگیا جو چشمہ چڑھا کر صاحب بن گیا تھا اور الکشن کی باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔

ان میں سے کوئی بھی تو اپنی حرکت پر نادم نہ تھا۔ سبھی خوش وخرم تھے، سبھی زندہ وپائندہ تھے سبھی گھر بار بسائے اینٹھتے پھر رہے تھے۔ تو آخر وہ کیوں اتنا حساس ہے کہ ہاتھ کٹوانے کے تصوّر سے ہی بھڑک جاتا ہے۔ کیا جما کی بات میں وزن نہیں۔؟

اس کے ذہن میں یہ سوال بار بار گونجنے لگا۔ پھر جیسے جیسے رات بیتنے لگی وہ دھیرے دھیرے پگھلنے لگا۔ اس کا وجود بوند بوند بن کر ٹپکنے لگا اور جب مل کے سائرن نے بارہ بجنے کا اعلان کیا تو اس نے آخری کروٹ لی اور نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے اس نے اپنے وجود کو سمیٹا اور جھولتی آستین سے سمجھوتہ کر کے سو گیا۔

سارا کام بڑی تیزی خاموشی اور ہوشیاری سے ہوا۔ ڈاکٹر نے جھٹ پٹ آپریشن کر ڈالا،

مل کے بابو نے کاغذات تیار کر ڈالے، بیمہ کے ڈاکٹر نے یہاں وہاں جہاں کہیں بھی دستخط کی ضرورت تھی کر دی۔ اور اب اس بات کا انتظار تھا کہ کریم ٹھیک ہو کر اسپتال سے واپس آ جائے تو معاوضہ کی رقم ادا ہو۔

مگر جس دن کریم کو اسپتال سے چھٹی ملی اور وہ جھولتی آستین کے ساتھ جما کے کندھے پر اپنا بایاں ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ اسپتال کی سیڑھیاں اتر رہا تھا اسی وقت مل کا بابو دوڑا دوڑا آیا اور اِدھر اُدھر تاک کر بولا۔

''جما غضب ہو گیا''۔

''کیا ہوا''۔ جما کے پیر سیڑھیوں پر چپک گئے۔

مِل کے بابو نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ کوئی سن نہیں رہا ہے تو سرگوشی میں بولا۔

''ابھی ابھی سرکار کا حکم ہوا ہے کہ ایک ہاتھ کٹنے پر ایک مشت رقم نہیں دی جائے گی بلکہ ہر ماہ دو سو روپے معاوضہ کے طور پر دیئے جائیں گے''

جما نے گھبرا کر کریم کو چھوڑ دیا اور وہ دھڑام سے پختہ سیڑھیوں پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

مِل کے بابو نے کریم کو نظر انداز کر دیا اور جما کے کان کے پاس اپنا منھ کر کے بولا۔

''لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم ہوا ہے کہ اگر دونوں ہاتھ کٹ جائیں تو ایک لاکھ روپے ایک مشت دے دیئے جائیں''۔

جما کا دل قابو میں آ گیا۔ اس نے بیہوش کریم کو اپنے کندھے پر لاد لیا اور اسپتال کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا مل کے بابو سے بولا۔

''تو ٹھیک ہے۔ تم پرانے کاغذات پھاڑ ڈالو اور نئے کاغذات تیار کرو۔ میں ادھورا کام پورا کرواتا ہوں''۔

(جون ۱۹۸۳)

کرے گا ۔ ہاتھ گھِس گھِسا کر گھڑیال کی پیٹھ بن جائے گا۔ ایسا موٹا ،بھدا ، کھردرا کہ جورو بھی دیکھ کر ڈرے گی۔ پچاس ہزار روپیوں سے تو دس بیگھ کھیت خرید کر گاؤں کا زمیندار بن سکتا ہے۔جن کھیتوں پر تیری سات پشتیں دوسروں کے لئے ہل چلاتی مرکھپ گئیں وہ کھیت تیرے ہو سکتے ہیں اور تو چودھری بن کر مینڈھ پر کھڑا ہو کر مزدوروں کو گالیاں دے سکتا ہے۔ایک ہاتھ دے کر ڈھیر سارے ہاتھ مِل سکتے ہیں کیا سمجھے؟۔''

ایک اور مقام پر کریم کو اسی کی مِل کا دوسرا کاریگر اپنا یہ جواز پیش کرتے ہوئے ملتا ہے۔

''کریم نے کچھ کہنا چاہا،مگر رام دین نے بات کاٹ دی۔اگر مگر کچھ کام نہیں دیتا کریم بھیّا۔کام پیسہ دیتا ہے،روپئے کے لئے آدمی کوئی بھی کام کر سکتا ہے ۔میں نے تو صرف اپنی انگلیاں ہی دی ہیں لوگ تو عزت دیدیتے ہیں،ایمان بیچ دیتے ہیں اور مندروں ،مسجدوں اور مقبروں کو نیلام کر دیتے ہیں ، میں نے کون سا جرم کیا ہے؟''

افسانہ نگار نے اپنے آپ سے الجھتے ،لڑتے جھگڑتے کریم کی کشمکش کو کس خوبی سے بیان کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

''اس رات کریم بستی میں کھانا کھانے نہیں گیا۔بستر پر پڑا سوچتا رہا۔ اسے بیوی کی یاد نے سخت پریشان کیا۔اسے اپنا بیٹا یاد آیا۔انگوٹھا دے کر خریدے ہوئے کھیت یاد آئے جس میں فصل لہلہانے لگی تھی ۔پھر اس کے سامنے رام دین آ گیا۔ہنستا ہوا۔مسکراتا ہوا۔رحیم چاچا آ گئے جنہوں نے داماد کو اسکوٹر تک دے ڈالا تھا اور جوار میں اپنی طوطی بلوا دی تھی ۔شبراتی آ گیا جو چشمہ چڑھا کر صاحب بن گیا تھا اور الکشن کی باتیں کرنے لگا تھا۔وہ سوچنے لگا۔ان میں سے تو کوئی اپنی حرکت پہ نادم نہ تھا،سبھی خوش وخرم تھے،سبھی زندہ پائندہ تھے۔سبھی گھر بسائے اینٹھتے پھر رہے تھے ۔تو آخر وہ کیوں اتنا حساس ہے کہ ہاتھ کٹوانے کے تصوّر سے ہی بھڑک جاتا ہے ۔کیا جمّا کی بات میں وزن نہیں ؟۔اس کے ذہن میں یہ سوال

بلی

تانترک رنٹر بھومی راؤ پچھلے کئی دنوں سے اپنی لیبوریٹری میں پوتر آتما کو بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس آتما کی مدد سے وہ ایک عظیم کارنامہ انجام دینا چاہتا تھا اور ملک کا سب سے بڑا وفادار بن کر تاریخ میں اپنا نام سنہرے حرفوں میں لکھوانا چاہتا تھا۔ ان دنوں بھاتال اور پاتال ملکوں نے ایٹمی تجربے کئے تھے اور ان تجربوں کے بعد یہ بحث چھڑی تھی کہ کس ملک کا تجربہ زیادہ کامیاب رہا اور ان کے بنائے ایٹم بم کتنے مہلک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ پوری دنیا کے سائنس دانوں نے دونوں ملکوں کے ایٹم بموں کی ساخت، طاقت اور ہلاکت زدگی پر اپنی ایکسپرٹ رائیں دیں۔ اری ظونہ یونیورسٹی کے ایک ایکسپرٹ نے کہا کہ بھاتال کا ایٹمی تجربہ پاتال کے تجربہ کے مقابلہ میں بارہ گنا زیادہ طاقت ور تھا۔ سٹی بٹی کے عہدہ داروں کی رائے تھی کہ بھاتال کے تجربہ کی طاقت ۲۰ سے ۳۰ کلوٹن تھی جبکہ پاتال کے بموں کی طاقت صرف ۵ کلوٹن تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بھاتال کا ایک بم پاتال میں کم از کم پانچ گنا زیادہ تباہی لا سکتا تھا یعنی پاتال کا ایک بم ایک لاکھ آدمی مار سکتا تھا تو بھاتال کا بم ۵ لاکھ ''چیرس'' (Cheers)۔

رنٹر بھومی راؤ کی آنکھوں میں خوشیاں رقص کرنے لگیں۔لیکن یہ رقص دوسرے لمحے ہی ختم ہوگیا۔اس نے سوچا.....یہ بات تو ٹھیک ہے کہ بھاتال کا ایک بم پاتال کے پانچ لاکھ آدمی مار سکتا ہے لیکن پاتال بھی جواب میں بھاتال کے ایک لاکھ آدمی مار دے گا پھر جیت کس کی ہوگی؟

شِٹ.....بے کار کی بات، ہمیں کوئی ایسی صورت نکالنی ہوگی کہ پاتال میں تو ہلاکت اور تباہی ہو اور خوب ہو لیکن بھاتال میں نہ ہو۔ ہمارا بم تو اثر انداز ہو، لیکن ان کا نہ ہو۔ وہ ڈالیں تو بم پھس ہو کر رہ جائے۔ سائنس داں تو یہ کام کر نہیں سکتے اس لئے وہ آتما کی مدد لینا چاہتا تھا۔ ویسے بھی بھاتال ٹیلی ویژن پر ان دنوں آتمائیں چھائی ہوئی تھیں جتنے بھی سیریل پیش کئے جا رہے تھے ان میں آدھے سے زیادہ میں سب سے اہم اور دھانسو کردار آتما کا ہوتا تھا۔ یہ آئی وہ مارا اور گئی۔ گویا دھویا نچوڑا اور ہو گیا۔ لوگ اسی طاقت کے قائل ہوتے جا رہے تھے اور بہتوں کو یہ یقین ہونے لگا تھا کہ آئندہ چند برسوں میں بھاتال پر آتمائیں ہی حکومت کریں گی... یہ آئیں وہ پٹائی کی اور چل دیں .....اس لئے بمباری ان کے ذریعہ کی گئی یا روکی گئی تو یہ بات بھاتال تہذیب اور روایت کے عین مطابق ہوگی.....یہ بات رنٹر بھومی راؤ اچھی طرح جانتا تھا۔

آتما بلانے کے لئے وہ دن رات تپسیا میں جٹ گیا۔ مرگھٹ کی راکھ، شمشان کی ہڈی، انسانوں کی کھوپڑیاں، بچھوؤں کی مونچھیں، چھپکلیوں کی دُمیں، سانپوں کی کینچلیاں، سور کا خون، بکرے کی آنت، بھینسے کی سینگ، لال رنگ، دیسی شراب، اور نہ جانے کتنی دوسری ہیبتناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی چیزیں اس نے اکٹھا کر رکھی تھیں، اینٹک کا کاروبار کرنے والی ایک دوکان سے تانبے کی ایک بہت پرانی مورتی خرید لایا تھا اور اس میں آتما ڈالنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ کبھی پوری رات ایک ٹانگ پر ٹکا رہتا۔ کبھی آدھی رات کو سر کے بل الٹا کھڑا ہو جاتا اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ سیدھا ہوتا۔ لبوریٹری میں ۱۳ اناجوں کو انگیٹھی میں ڈال کر دھواں کرتا۔ انسانی کھوپڑی کو مورتی کے سر پر رکھ کر گھنٹوں ہو ہو ہو کرتا رہتا۔ کبھی برہنہ ہو کر مورتی کے چاروں طرف رقص کرتا کبھی گھنٹوں اس کے سامنے سجدہ میں پڑا رہتا اور کسی انجانی غیر مانوس آواز میں کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ اسی طرح انتیس راتیں گزر گئیں۔

تیسویں رات کو اس نے سر منڈوا ڈالا اور اپنی چکنی کھوپڑی میں لال اور کالے رنگوں کا مکسچر مل ڈالا۔ کہنیوں تک ہاتھوں میں سفید مٹی کا لیپ لگایا۔ شمشان سے لائی ہوئی نوکیلی ہڈی کو لئے وہ مورتی کے پاس آیا اور اسے مورتی کی بائیں آنکھ میں کونچتے ہوئے ہذیانی کیفیت میں چیخا۔

''جاگ جاگ۔ بول بول۔ جاگ جاگ آخری رات جاگ جاگ آخری رات بول ماتا بول''۔

وہ مسلسل چیختا رہا۔ ٹھیک بارہ بجے یکا یک کمرے میں تیز ہوا کا جھونکا آیا اور مورتی کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور پھر کسی کھنڈر کی بازگشت کی طرح اس کے منہ سے آواز پھوٹی۔

''بول کیا چاہئے۔''

رنٹر بھومی راؤ نے مورتی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ ''دھنیہ ہو پوتر آتما۔ دھنیہ ہو۔ آپ نے اس مورتی میں پرویش کر کے ہم پر کلیان کیا ہے۔ آپ کرپیا اس دیش پر کلیان کریں'' ''بول کیا مانگتا ہے'' مورتی نے شانت ہو کر پوچھا۔ رنٹر بھومی راؤ نے اپنا سر اٹھایا اور مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''پوتر آتما آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہم نے اور ہمارے پڑوسی ملک نے ایٹم بم بنالیا ہے''۔

''تو ہم کیا کریں۔ ہم تو آتما ہیں۔ بم ہمارا کیا بگاڑے گا''

''پوتر آتما۔ آپ کا نہیں ہمارا بگڑے گا۔ ہم بہت الجھن میں ہیں''۔

دفعتاً مورتی کی آواز تیز ہوگئی۔..... ''صاف صاف بول کیا چاہتا ہے۔''

رنٹر بھومی راؤ نے گھبرا کر اپنا سر مورتی کے کے قدموں پر رکھ دیا اور اسی حالت میں بولا۔

''بولتا ہوں ماں بولتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ یوں تو ہمارا بم زیادہ طاقت ور ہے۔ پڑوسی ملک کے بم سے پانچ گنا زیادہ۔ جیسا سنٹی بنٹی کے عہدہ داروں نے بتایا ہے اس لئے''

''چپ''۔ مورتی نے اُسے ڈانٹا اور آنکھوں سے شعلہ اگلنے لگی۔ شعلہ آگے بڑھ کر تانترک کی چکنی کھوپڑی کو جھلسانے لگا۔ گھبرا کر اس نے سر اوپر کر لیا۔ اس کے بعد مورتی نے شعلے سمیٹ لئے اور بولی۔ ''تو اپنی بات پوری کر''

رنٹر بھومی راؤ نے پھر مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ دئے۔

''پوتر آتما ہماری الجھن یہ ہے کہ ہم پڑوسی ملک پر بم ڈالنا چاہتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ایک بم سے ان کے پانچ لاکھ آدمی مر جائیں گے لیکن ہمیں اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ جواب میں وہ بھی بم ڈال دیں گے اور ایک لاکھ آدمی ہمارے بھی مر جائیں گے''۔

''تو''۔؟ مورتی نے اپنے محور پر ایک چکر لگایا اور ساکت ہوگئی۔

''تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بم کا اثر غائب ہو جائے۔ اور اگر وہ بم ڈالیں تو پھس ہو کر رہ جائے''۔

''وہ کیسے''؟

''وہ آپ جانیں''۔ رنٹر بھومی راؤ نے دانت نکوسے۔ ''آپ پوتر آتما ہیں بم گرنے سے پہلے اسے نگل جائیں یا اسے اڑا کر سمندر کی طرف لے جائیں اور وہاں گرا دیں۔ آپ کچھ بھی کر سکتی ہیں آپ آتما ہیں''

مورتی ساکت رہی۔ چند منٹوں تک تانترک اسے گھورتا رہا اور جب اس میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو اس نے شمشان کی نکیلی ہڈی کو دوبارہ اس کی آنکھوں میں چبھو دیا۔ اور چیخنے لگا۔

''جاگ۔ جاگ۔ بول۔ بول۔ جاگ جاگ۔ بول بول''

تھوڑی دیر کے بعد مورتی کی آنکھوں سے پھر شعلے نکلنے لگے۔ اس کی گردن ہلنے لگی۔ اور گھڑگھڑاتی ہوئی اس کے منہ سے آواز آئی..... ''ہم یہ نہیں کر سکتے''

رنٹر بھومی راؤ بے قابو ہو کر اپنی پیشانی مورتی کے قدموں میں پٹکنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ لہولہان ہوگئی۔ اس نے اپنی انگلیوں سے خون پونچھا اور اسے مورتی کے چہرے پر مل دیا۔

''تجھے کرنا ہوگا۔ میں نے تیس دن تیری تپسیا کی ہے۔ تجھے کرنا ہی ہوگا''

غضبناک حالت میں اس نے شمشان سے لائی ہوئی نکیلی ہڈی مورتی کی بائیں آنکھ میں پھر چبھو دیا۔

مورتی اپنے محور پر گھومی اور پھر اپنی اصلی پوزیشن میں آ کر ساکت ہوگئی۔ چند لمحوں بعد اس کے منہ سے آواز نکلی ..... ''ایک صورت نکل سکتی ہے''۔

''وہ کیا''۔ رنٹر بھومی راؤ خوش ہو کر بولا۔

''تجھے ایک ایسا منتری ڈھونڈھنا ہوگا جو اپنے پورے پریوار کی بلی دینے کو تیار ہو''

''یعنی؟'' رنٹر بھومی راؤ نے حیرت سے پوچھا۔

''یعنی جب بھاتال پاتال دیش پر بم مارے تو اس کے پانچ لاکھ آدمی تو مریں لیکن جب پاتال دیش جوابی کارروائی کرے تو صرف وہ منتری اور اس کے گھر کے لوگ ہی مریں۔ ایسا میں کر سکتی ہوں۔ وہاں پورا شہر تباہ ہو سکتا ہے اور تمہارے یہاں صرف ایک منتری کا گھر۔ ذرا سوچو تمہاری فتح کتنی زبردست ہوگی۔ بس ایک ایسا منتری ڈھونڈ لاؤ جو خوشی خوشی اپنی اور اپنے پریوار کی بلی دینے کو تیار ہو تو میں اپنی شکتی دکھا سکتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر مورتی خاموش اور ساکت ہوگئی۔

رنٹر بھومی راؤ جوش میں آ کر مورتی کے چاروں طرف ناچنے لگا اور مور کے پروں سے بنے مور چھل سے اپنا ہپ بجانے لگا۔ دھنیہ ہو۔ دھنیہ ہو آتما، میں صبح ہوتے ہی سوریہ سوامی سے ملوں گا۔ کئی منتری گنٹر ان کے چیلے ہیں اور سب کے سب دیش بھگت ہیں۔ وہ لوگ اپنی تقریروں سے، تحریروں سے، پارلیمنٹ میں، طرح طرح سے سجائے گئے منچوں سے دیش بھگتی کا نعرہ لگا چکے ہیں۔ بڑی سے بڑی قربانی دینے کیلئے عوام کو دن رات اکساتے رہتے ہیں۔ ایک کیا کئی ایک ایسے مل جائیں گے جو اپنے خاندان کا دشمن کے پانچ لاکھ انسانوں سے سودا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے کیوں کہ یہ دھرتی بلیدان کی ہے۔

''یہ دھرتی ہے بلیدان کی''۔ وہ زور زور سے گانے لگا اور مورتی کے چاروں طرف تیزی سے گھومنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے ہوش کر زمین پر الٹ گیا۔

سوریہ سوامی نے رنٹر بھومی راؤ کی بات سنی تو اس کی آنکھوں کی پتلیاں گول گول گھومنے لگیں اور اس کے سفید سفید دانت ہونٹوں سے باہر جھانکنے لگے بالکل ویسے ہی جیسے کوئی اسٹریٹ ڈاگ اپنی دُم کو ٹانگوں میں دبائے ہوئے غراتا ہوا کسی دوسرے کتے پر حملہ کرنے والا ہو۔ اسی حالت میں وہ بولا۔

''تو تمہیں ایک ایسا منتری چاہئے جو اپنے خاندان کی قربانی دینے کو تیار ہو۔''؟

''ہاں مہاراج''

''تم نے منتریوں کو بیوقوف سمجھ رکھا ہے؟''

''ہاں مہاراج''

''شٹ اپ''

''نا مہاراج یہ بات نہیں۔ بات دیش بھگتی کی ہے۔ ذرا سوچئے کہاں ایک گھر اور زیادہ سے زیادہ اس کے دس افراد اور کہاں پچاس ہزار گھر اور پانچ لاکھ انسان۔ کتنا سستا سودا ہے۔ آپ اپنے چیلوں سے بات کریں۔ میں تو کہتا ہوں کئی ایک تیار ہو جائیں گے۔ اور سر کے بل ہوں گے؟''

'' میں نہیں سمجھتا''

''کوشش تو کرئے مہاراج۔ رنٹر بھومی نے ہاتھ جوڑ لئے۔''

''خیر تم کہتے ہو تو بات کر لیتا ہوں ویسے میں ان منتریوں کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ یہ اپنی ایک انگلی بھی دیش کے لئے نہیں کٹا سکتے۔ پورے گھر کی قربانی دینا تو بہت بڑی بات ہے۔ خیر دیکھتے ہیں تم جاؤ''

رنٹر بھومی راؤ اپنی جگہ سے اٹھا اور الٹے قدموں سوریہ سوامی کے ایر کنڈیشنڈ کرم استھل سے باہر نکل آیا۔

ایک ہفتہ بعد وہ پھر سوریہ سوامی کے کرم استھل میں بیٹھا ہوا تھا۔

''مہاراج کچھ بات ہوئی۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا۔ سوریہ سوامی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس نے گردن ہلائی بولا۔

''بات ہوئی تو پر بنی نہیں''

''یعنی؟''

میں نے تمام منسٹر، ڈپٹی منسٹر، منسٹر آف اسٹیٹ سے بات کی سبھوں نے ایک ہی بات کہی۔

''ہم ابھی پاگل نہیں ہوئے ہیں''۔

رنٹر بھومی راؤ کے چہرہ پر اندھیرا چھا گیا۔ ''مطلب؟''

''مطلب صاف ہے کوئی بھی قربانی دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ کتنا سمجھایا کہ دشمن کے پانچ لاکھ آدمی یوں فٹافٹ مارے جاسکتے ہیں۔ انہیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ وہ اپنے گھر کے سارے افراد کی بلی دیدیں۔ یہ سن کر ان میں سے ہر ایک نے کہا معاف کرئے مہاراج آپ اپنے آپ کو کسی سائکرسٹ کو دکھائیں۔ ایسا لگتا ہے کہ طرح طرح کے اسکنڈل نے آپ کے دماغ کی چول ڈھیلی کردی ہے۔ ان مہاپرشوں میں سے کوئی بھی ایک قطرہ خون دینے کو تیار نہ ہوا۔''

یہ سن کر رنٹر بھومی راؤ بہت پریشان ہوا۔ اس کی نازک حالت دیکھ کر سوریہ سوامی نے ہمدردی جتاتے ہوئے ایک مشورہ دیا۔ اس نے کہا'' آتما سے پوچھو کہ کوئی ایم. پی یا ایم. ایل. اے چلے گا۔ اگر ہاں تو مجھے بولو میں کسی چھٹ بھیئے کو پکڑوں''۔

رنٹر بھومی راؤ کے نیم مردہ چہرہ پر تھوڑی رونق آئی۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ سے اٹھا اور الٹے قدموں کرم استھل سے باہر نکل آیا۔ اس نے اسی رات آتما کو پھر بلایا۔

'' کیوں بلایا'' مورتی نے آنکھوں سے شعلہ اگلتے ہوئے پوچھا۔

''پوتر آتما کوئی منتری تیار نہ ہوا۔ کوئی ایم. پی. یا ایم. ایل. اے چلے گا ؟''

مورتی نے شعلہ پھینکنا بند کردیا۔ پھر اس کے منھ سے وہی بھیانک آواز نکلی۔'' ٹھیک ہے جب تم نے بلایا ہی ہے تو کسی نہ کسی کی بلی لینی ہوگی''۔

رنٹر بھومی راؤ خوشی سے پھر ناچنے لگا اور وہی دیش بھگتی کا گیت زور زور سے گانے لگا۔

''یہ دھرتی ہے بلیدان کی۔'' وہ ناچتے ناچتے بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

دوسرے دن وہ سوریہ سوامی کے پاس پہنچا۔ سوریہ سوامی نے اسکی باتیں سنیں اور کہا۔''میں کوشش کروں گا۔ تم ایک ہفتہ بعد آنا''۔ ایک ہفتہ بعد رنٹر بھومی راؤ پھر سوریہ سوامی سے ملنے آگیا۔ سوریہ سوامی کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ کچھ زیادہ ہی سیاہ دکھائی دے رہے تھے۔ آنکھوں کی سرخی معمول سے زیادہ گہری تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے رنٹر بھومی راؤ کو بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھا تو سوریہ سوامی نے بڑے شکست خوردہ لہجہ میں بتایا کہ کوئی ایم. پی. یا ایم. ایل. اے بھی تیار نہ ہوا۔ کئی دیش بھگتوں نے تو یہاں تک کہدیا کہ دشمن کا پورا ملک بھی اگر نیست و نابود ہو جائے پھر بھی وہ اپنے

گھر کا ایک فرد بھی قربان نہ کریں گے۔

یہ سن کر رنٹر بھومی راؤ بہت پریشان ہوا۔ کراہتا ہوا بولا ''تو پھر کیا کیا جائے''۔ اس پر سوریہ سوامی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ آتما سے ہی پوچھے کہ اب کیا کیا جائے۔ وہی کوئی صورت نکالے گی۔ رنٹر بھومی راؤ کو بار بار ہاتھ جوڑنے کی عادت تھی سو اس بار بھی اس نے ویسا ہی کیا اور الٹے قدموں کرم استھل سے باہر نکل آیا۔ اسی رات اس نے آتما کو تیسری بار بلایا۔

''بول'' مورتی نے آنکھوں سے شعلہ نکالتے ہوئے پوچھا

رنٹر بھومی راؤ نے ہاتھ جوڑ دئے۔ ''پوتر آتما کوئی ایم. پی. یا ایم. ایل. اے بھی تیار نہ ہوا۔ پورا پریوار تو کیا ایک آدمی بھی دینے کو تیار نہ ہوا۔''

''تو پھر''؟ مورتی نے شعلہ نکالنا بند کر دیا اور ساکت ہو گئی۔

''پوتر آتما تو ہی بتا ہم کیا کریں''

مورتی اپنے محور پر گھومنے لگی۔ اور ایک چکر لگا کر اپنے اصل مقام پر آ کر رک گئی پھر بولی۔

''تم ایک کام کرو۔ تم اپنی ہی بلی دیدو میں صرف ایک بلی سے کام چلالوں گی''۔

''نہیں'' رنٹر بھومی راؤ چیخا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا''

'' مرنا نہیں چاہتے لیکن مارنا چاہتے ہو۔''

مورتی نے زبردست قہقہہ لگایا۔ لیبوریٹری میں دھری چیزیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ اس کے منہ سے ایک خونی زبان نکلی اور باہر لٹکنے لگی..... ''میں تمہاری بلی لوں گی''

''نہیں'' رنٹر بھومی راؤ رونے لگا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھ پر دیا کرو ماں''

مورتی نے پھر زبردست قہقہہ لگایا۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم نے مجھے بلایا ہے۔ میں بلی لے کر ہی جاؤں گی''۔

مورتی کی لٹکتی زبان سے خون ٹپکنے لگا۔ اور آنکھوں سے شعلے بھڑک کر آگے بڑھنے لگے۔ تانترک لیبوریٹری سے باہر بھاگنے لگا لیکن شعلوں نے اسے جا پکڑا اور منٹوں میں اسے جلا کر کوئلہ کر دیا

(نومبر ۱۹۹۸)

شکاری

خطاب کرنے کے بعد حاکم اعلیٰ نے تمام شرکاء مجلس شوریٰ پر طائرانہ نظر ڈالی اور کہا، ''اب آپ لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔''

تمام ارکین خاموشی کے ساتھ اناس کا جوس پی رہے تھے۔ ان کے صحت مند چہروں پر تفکرات کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں ایسا لگتا تھا کہ کھادی کے سفید کرتوں پر غلیظ پانی کی چھینٹیں پڑ گئی ہوں۔ باہر لو چل رہی تھی۔ صبح اخباروں میں ان لوگوں نے پڑھا تھا کہ پورا ملک قیامت خیز گرمی کی لپیٹ میں ہے اور سیکڑوں لوگ اس کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو چکے ہیں۔ اس تمازت کو زائل کرنے کیلئے ایرکنڈیشنر کے والیوم کو بڑھا دیا گیا تھا اور ایر فریشر میں فرانسیسی پرفیوم کی مقدار زیادہ کر دی گئی تھی۔ کانفرنس ہال ٹھنڈا تو تھا ہی معطر بھی ہو گیا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کی ڈیزائن کی ہوئی کرسیاں اتنی آرام دہ اور خواب آور تھیں کہ معزز رہنماؤں پر رہ رہ کر غنودگی طاری ہو رہی تھی لیکن اتنا س کا جوس اور حاکم اعلیٰ کی آواز انہیں جیسے تیسے بیدار کئے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر تک جب کوئی نہ بولا تو حاکم اعلیٰ نے قدرتیز آواز میں کہا۔ ''آپ لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں۔ آپ کہئے شہزاد صاحب

آخر مسلمانوں نے ہمیں ووٹ کیوں نہیں دیا؟''

غلام رسول شہزاد نے اپنے بند گلے کی کوٹ سے خیالی دھول جھاڑی۔

''ان کا مقدر خراب تھا سر۔ وہ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے، دوست دشمن کو پہچان نہ سکے''

''اس کا ذمہ دار کون ہے؟''

''وہی سر، اور کون ہوگا۔ آزاد ملک میں یہ قوم پچاس سالوں سے رہ رہی ہے بوڑھی ہو رہی ہے۔ اس کا ذہن کام نہیں کر رہا ہے''۔

شہزاد کی بات سن کر پاس بیٹھے جعفر ظریف ہنس پڑے۔ ''شہزاد صاحب بوڑھے ہم اور آپ ہو رہے ہیں قوم تو ہمیشہ جوان رہتی ہے''۔

''بوڑھے آپ ہو گئے ہوں گے''۔ شہزاد صاحب خفا ہو گئے، وہ ابھی پانچویں دہائی کے پیٹے میں تھے اس لئے بڑھاپے کی تہمت برداشت نہ کر سکے۔

حاکمِ اعلیٰ نے ناگواری سے دونوں کو دیکھا۔ ''یہاں موت و زندگی کا سوال ہے اور آپ لوگ بڑھاپے اور جوانی میں الجھ رہے ہیں''۔ اتنا کہہ کر وہ تیسرے معزز رکن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''آپ نے بھی اس مسئلے پر غور کیا ہے ونود شرما صاحب، آپ کے یہاں سے تو ہم اس طرح صاف ہو گئے جس طرح میرے سر سے بال''

تمام لوگ ہنسنے لگے۔

''نہیں سر۔ آپ کے سر میں اِکا دُکا بال اب بھی ہے، ونود شرما کے صوبے میں تو ہم اس طرح صاف ہوئے جیسے برف سے ڈھکی ہمالہ کی چوٹی'' ایک دوسرے رکن بال کرشن سوامی نے چٹکی لی۔ اس پر سب لوگ پھر ہنسے۔

''لیکن ایسا کیوں ہوا؟'' حاکمِ اعلیٰ نے زور سے میز پر مکا مارا، مکے کا اثر یہ ہوا کہ سب لوگ خاموش ہو کر اناناس کا جوس پینے لگے۔

''ایر کنڈیشنر کا والیوم کم کر دو، میں کانپ رہا ہوں'' حاکمِ اعلیٰ نے چپکے سے اپنے سکریٹری

بار بار گونجنے لگا۔ پھر جیسے جیسے رات بیتنے لگی۔ وہ دھیرے دھیرے پگھلنے لگا۔ اس کا وجود بوند بوند بن کر ٹپکنے لگا اور جب مل کے سائرن نے بارہ بجے کا اعلان کیا تو اس نے آخری کروٹ لی اور نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے اس نے اپنے وجود کو سمیٹا اور جھولتی آستین سے سمجھوتہ کر کے سو گیا۔''

اس کے بعد کہانی کیا موڑ لیتی ہے۔ تکمیل کے بعد بھی کام ادھورا کیوں رہ جاتا ہے اور ادھورا کام کیسے پورا کیا جاتا ہے۔ اسے جاننے کے لئے آپ کو یہ افسانہ پڑھنا ہوگا۔ افسانے کا ہر جملہ آپ کو بھی مجروح اور لہولہان کر دے گا۔ اس افسانے میں ہاشمی کا فن ایسی بلندی کو چھوتا ہوا دکھائی دے گا جہاں تک رسائی کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ مزدوروں کی گفتگو ان کی ذہنی کشمکش، ان کی نفسیات ہاشمی کی بے مثال کردار نگاری کا پتہ دیں گے 'ادھورا کام' صرف ہاشمی کا ہی نہیں اردو کا بھی ایک بہترین افسانہ ہے۔

ہاشمی کے افسانوں کا یہ انتخاب کہانی کا شائقین کے لئے تشکین کا باعث ہوگا۔ اب رہا سوال ہاشمی کے مقام و مرتبہ کا تو اس کے لئے ہاشمی نہ فکرمند ہیں نہ پریشان اور نہ بیتاب ..... کیا ہم نہیں جانتے کہ درویش سائل نہیں ہوتا۔

Rasheed Afroz
A/5-6 Aameen Society, Bagh-e-Nishat
Sarkhej Road, Ahmedabad-380055
Phone : (079) 26810927

سے کہا۔

سکریٹری جھکا جھکا باہر کی طرف بھاگا اور تھوڑی دیر بعد اسی طرح جھکا جھکا اندر آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ جب سردی ذرا کم ہوئی تو حاکمِ اعلیٰ نے کندھے پر رکھی شال کو ایڈجسٹ کرتے ہوئے کہا۔

''تو سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟''

''مسلمانوں نے ووٹ نہیں دیئے''۔ ایک معزز رکن کرتار سنگھ بولے، حاکمِ اعلیٰ نے انہیں خفگی سے دیکھا۔ آپ سے تو پوچھا نہیں تھا آپ کیوں بولے؟''

''سر میں بھی اس مجلس کا ایک رکن ہوں''۔

''شیور، شیور، لیکن آپ کے صوبے میں الیکشن نہیں ہوا تھا۔ وہاں مسلمان بھی تیل میں نمک.....''۔

''سر دال میں نمک'' سکریٹری نے گردن بڑھا کر حاکمِ اعلیٰ کے کان میں کہا۔

''ہاں! دال میں نمک کے برابر ہیں۔ وہ کس قطار شمار میں ہیں''۔

''سر! اگر دال میں نمک نہ ہو تو دال بیکار۔ ہمارے لئے وہ نمک ہی ہیں'' کرتار سنگھ نے جواب دیا۔ اس پر حاکمِ اعلیٰ اور غصہ ہو گئے۔

''بحث پھسل پھسل جاتی ہے کوئی ٹھوس وجہ آپ لوگ بتائیں گے یا یوں ہی وقت ضائع کریں گے''

جن لوگوں نے اتنا س کا جوس ختم کر لیا تھا وہ اب تلے بادام اور نمکین کا جو، کھانے لگے تھے باقی لوگ اب بھی دھیرے دھیرے اتنا س کا جوس سپ کر رہے تھے لیکن حاکمِ اعلیٰ کے لہجے کی ترشی سب نے محسوس کی۔ لمحہ بھر کے لئے انہوں نے اپنے اپنے شغل بند کر دیئے اور حاکمِ اعلیٰ کو دیکھنے لگے۔

''آپ بتایئے کن تمار یڈی''۔

''سر ہمارے یہاں حالت وہی ہے جو آپ کے سر کی ہے''۔

''شٹ آپ''

کن نمار یڈی سٹک گئے اور تلے بادام کھانے لگے۔

''میں پوچھتا ہوں کہ ہم ہر جگہ کیوں ہارے؟''

''سر مسلمانوں نے ووٹ نہیں دیا''

اے، آر تو تلے نے کرتے کے بٹن بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہی تو پوچھتا ہوں کہ کیوں نہیں دیا؟'' حاکمِ اعلیٰ نے پھر میز پر مُکّا مارا۔

سکریٹری اپنی کرسی میں بیٹھے بیٹھے حاکمِ اعلیٰ کی طرف لپکا اور ان کے کان کے پاس اپنا منہ کر کے پوچھا۔''میں بتاؤں سر''۔اس پر حاکمِ اعلیٰ نے سب کو مخاطب کیا۔

''سنئے ہمارا سکریٹری وجہ بتانا چاہتا ہے اس سے سنئے۔''بتاؤ'' انہوں نے سکریٹری سے کہا۔

سکریٹری پولیس سب انسپکٹر کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

''وجہ یہ ہے کہ مسلمان ناخوش ہیں''۔

''لیکن کیوں؟''

''یہ سیکرٹ ہے سر۔ میں سینئر سرکاری افسر ہوں، سب کے بیچ راز فاش نہیں کر سکتا''۔

اتنا کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔

پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ دروازہ کھول کر چپراسی نے مسکرا کر سب کو دیکھا، گردن ہلائی اور دروازہ دھیرے سے بند کر دیا۔''سرکس چالو ہے'' وہ دھیرے سے بدبدایا۔

حاکمِ اعلیٰ نے غصّے سے اپنے سکریٹری کو دیکھا، کندھے پر رکھی ہوئی شال غیر متوازن ہو گئی تھی ، دھوتی بھی کہیں پاؤں میں الجھ گئی تھی انہوں نے شال کا توازن اور دھوتی کا الجھاؤ درست کیا۔

''کوئی نہیں بتا سکتا''

ہال میں خاموشی رہی

''میں نے کہا تھا ایرکنڈیشنر کا والیوم کم کردو، بند کرنے کے لئے نہیں کہا تھا، ہال گرم ہو رہا ہے والیوم بڑھاؤ''۔ حاکمِ اعلیٰ نے دھیرے سے سکریٹری کو ڈانٹا، سکریٹری پہلے کی طرح جھکا جھکا باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد اُسی طرح جھکا جھکا واپس آکر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

''بولئے، بولئے، کچھ تو بولئے''

چند لمحے مزید خاموشی رہی، پھر رام دیال ترپاٹھی نے انگلی اونچی کی۔''سر''

''ہاں، ہاں، کہو''

''یہ تو سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں نے ووٹ کیوں نہیں دیا، آپ کے باغ کا مالی اور میرا دھوبی بھی جانتا ہے۔ اپنے آپ کو ننگا کرنے سے فائدہ؟ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ روٹھی قوم کو اپنے گھیرے میں کس طرح لایا جائے''۔

''ہاں ہاں یہ درست ہے یہی سوچنا چاہئے۔ رم دیال ترپاٹھی زندہ باد''

کرپاناتھ پانڈے نے وہیں نعرہ لگا دیا، اس پر حاکمِ اعلیٰ نے انہیں ڈانٹا۔

''یہ مجلسِ شوریٰ کانفرنس ہال ہے کوئی دینا ناتھ بھاردواج کا چوراہا نہیں کہ نعرہ بازی شروع کردی۔ آخر عوام کا نمائندہ بننے کی کچھ تو صلاحیت یہاں آنے سے پہلے حاصل کرلی ہوتی۔ کچھ نہ سہی تو بے عمل رہنے اور چپ سادھنے کی ہی صلاحیت''۔

''یا ہوائی جہاز اغوا کرنے کا تجربہ''

''یہ کون بولا''۔ حاکمِ اعلیٰ نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن ہر رکن آنکھیں چرائے اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ اس وقت کانفرنس ہال کسی کالج کے فرسٹ ایر کا ایسا کلاس لگا جس میں کسی لڑکے نے ماسٹر صاحب کی ہونگ چپکے سے کردی ہو اور ماسٹر صاحب سُرخ سُرخ آنکھوں سے سب کو گھور رہے ہوں۔ کرپاناتھ پانڈے پر طنز رام اوتار یادو نے کیا تھا۔ یہ کرپاناتھ پانڈے کو معلوم ہو گیا تھا۔ انہوں نے دانت پیس کر یادو کو دیکھا اور تیزی سے نمکین کا جو کھانے لگے۔

''آپ لوگ کم از کم یہاں تو شرافت اور ذہنی پختگی کا مظاہرہ کریں۔ کانفرنس ہال کے باہر جو چاہیں کریں میں روکنے آتا ہوں کیا؟'' حاکم اعلیٰ نے سب کی سرزنش کی پھر رام دیال ترپاٹھی

سے مخاطب ہوئے۔

''تو ترپاٹھی جی آپ کے پتا تو مہمان نیتا تھے اس نسبت سے آپ کا مشورہ قابلِ غور ہوگا۔ ہاں تو بتایئے کہ روٹھی قوم کو گھیرے میں کیسے لایا جائے؟

''دانہ ڈال کر''

''دانہ؟'' حاکمِ اعلیٰ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں دانہ'' ترپاٹھی نے وضاحت کی۔ ''بچپن میں ہم چڑیوں کو دانہ ڈال کر پھنساتے تھے کسی ٹوکری کو ایک چھوٹی پتلی لکڑی کے سہارے ایک طرف سے اٹھا دیتے تھے اور اندر دانہ ڈال دیتے تھے لکڑی میں پتلی رسّی لگی رہتی تھی جیسے ہی چڑیا دانہ چگنے اندر جاتی تھی ہم رسّی کھینچ لیا کرتے تھے اور ٹوکری گر جاتی تھی اور چڑیا پھنس جاتی تھی''۔

رام دیال ترپاٹھی کی بات سن کر جیسور تیلی، جو اناناس کا جوس پی چکے تھے اور بادام اور کاجو سے بھی نمٹ چکے تھے اس لئے فرصت میں تھے، بولے۔

''ایک دوسرا طریقہ بھی ہے، جو ہم اختیار کرتے تھے''

''وہ کیا؟'' حاکمِ اعلیٰ نے انہیں دلچسپی سے دیکھا۔

''لاسا''

''یعنی''

''ہم چڑیا پھنسانے کیلئے کپاس کا استعمال کرتے تھے۔ چڑیا کھانا کھانے کے لئے مونڈی نیچے کرتی ہی تھی کہ اس کے پرلاسے کی لپیٹ میں آجاتے تھے اور وہ پھنس جاتی تھی''

جیسور تیلی نے اپنی بات پوری ہی کی تھی کہ ایک طرف سے آواز آئی ''سر'' حاکمِ اعلیٰ نے اُدھر دیکھا بھوشن ورما انگلی اونچی کئے ہوئے تھے۔

''ہاں ورما جی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' حاکمِ اعلیٰ نے ان سے پوچھا۔

''ہم ای کہت رہن ہجور کہ اس سے اچھا تو گھاس ڈالنا ہوا، بس نرم نرم اور ہری ہری گھاس دکھائی اور جناور بھاگ کر آیا۔ ہم اپنی بھینسوں کو بلانے کیلئے گھاس دکھاتے تھے اپنے لڑکپن

ماں ۔کا مجھن''۔

ورما جی کی بات پر ڈاکٹر چٹر جی زور سے ہنس پڑے ، اس پر حاکمِ اعلیٰ نے انہیں پھٹکار دیا۔'' کیوں ہنسے؟''

''سر لگتا ہے سیاست میں آنے سے پہلے یہ لوگ چڑی مار اور چرواہے تھے۔''

ڈاکٹر چٹر جی کی اس گستاخی پر تمام اراکین چراغ پا ہو گئے ۔انہوں نے زور شور سے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ چٹر جی کو اگلے الیکشن تک سسپنڈ کر دیا جائے۔ انہوں نے غیر شائستہ حرکت کر کے پارٹی ڈسپلن کو توڑا ہے۔ حاکمِ اعلیٰ کو بھی غصہ تو بہت آیا لیکن انہیں خطرہ تھا کہ اگر چٹر جی کو سسپنڈ کر دیا گیا تو وہ پارٹی کے ٹوٹے انگ سے مل جائیں گے اور حریف بنواری کی ٹکڑی مضبوط ہو جائے گی اس لئے انہوں نے کمالِ ہوشیاری سے آگ پر پانی ڈالا۔

''یہاں سب کی جڑیں چرواہوں اور چڑی ماروں سے کہیں نہ کہیں جا کر مل جاتی ہیں۔ آپ لوگ اپنے اندر گہرائی میں جھانک ڈالیں سب کچھ صاف دکھائی دے جائے گا۔اس کے علاوہ کیا چرواہا ہونا جرم ہے میں تو کہتا ہوں کہ چڑی مار ہونا بھی قانوناً جرم نہیں بشرطیکہ چڑیا چڑیا گھر کی یا دوسرے کے پنجرے کی نہ ہو''۔

سب چپ ہو گئے ۔حاکمِ اعلیٰ نے طائرانہ نظر ان پر ڈالی ، پھر بولے۔

''ہاں تو ترپاٹھی جی دانہ سے آپ کا کیا مطلب تھا''

ترپاٹھی کو بولنے میں تھوڑا وقت لگا اس لئے کہ انہوں نے منہ میں تلے بادام بھر لئے تھے جلدی جلدی اسے چبایا پھر نگلتے ہوئے بولے۔

''سر کوئی ایسا وعدہ کیا جائے جو مسلمانوں کی دُکھتی رگ ہو''

''مسلمانوں کی تو کئی رگیں دکھتی ہیں''۔غلام رسول شہزاد اس لئے بولے کہ وہ مسلمان تھے اور مسلمانوں کی نمائندگی کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

ترپاٹھی اپنی نشست میں کسمسائے۔''شہزاد جی یہ مانا کہ مسلمانوں کی کئی رگیں دکھتی ہیں بلکہ یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ان کا پورا جسم دکھتا ہے ہم اب تک ان کی بہت ساری دکھتی رگوں کو دباتے

رہے ہیں۔ گذشتہ پچاس سالوں میں ان کے پورے جسم کو دباڈالا ہے یہ سب درست، لیکن ایک اہم رگ باقی رہ گئی ہے اس بار اُسے دبا کر دیکھیں گے''۔

حاکم اعلیٰ نے دلچسپی سے ترپاٹھی کو دیکھا۔ ''کونسی رگ؟''

ترپاٹھی نے جے رام بانسری کو ٹھوکا دیا وہ ہڑبڑا کر کھڑے ہوگئے۔ ''میں بتاؤں گا سر، یہ میری اسکیم ہے''

''آپ بیٹھ کر بتایئے بانسری جی''۔ حاکمِ اعلیٰ نے انہیں مشورہ دیا، بانسری بیٹھ گئے بولے۔ اس بار ہم یوں کریں گے کہ نوکریوں میں مسلمانوں کیلئے رزرویشن کا مطالبہ کریں گے''

''کس سے کریں گے'' حاکمِ اعلیٰ نے پوچھا

''سرکار سے''

''کونسی سرکار''

بانسری کے منہ میں ٹھیٹھی گھس گئی۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہ تھا کہ یہاں کوئی اور نہیں سرکار ہی بیٹھی ہے اور سرکار مطالبہ نہیں کرتی، حکم دیتی ہے۔ عمل کرتی ہے اور اس معاملہ میں حکم دینا یا عمل کرنا چغد پن ہے۔ انہوں نے سر سے سفید ٹوپی اتاری، تھوڑی دیر کھوپڑی سہلاتے رہے پھر بولے ''تو یوں کرتے ہیں کہ میں سرکار سے اپنی ذاتی پوزیشن میں مطالبہ کروں۔ ایک ہوا اڑاؤں۔ حاکمِ اعلیٰ پھر بیان دیں کہ معاملہ پر غور کیا جائے گا اور اس طرح پوری قوم کو دانہ ڈال دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قوم ایک بار پھر پھنسے گی''

''اور اگر نہ پھنسی تو'' حاکمِ اعلیٰ نے شبہ ظاہر کیا۔

بانسری نے ٹوپی سر پر رکھ لی۔ ''میرا نصف صدی کا تجربہ کہہ رہا ہے کہ وہ پھنسے گی۔ ہم نے اب تک یہی کیا ہے اور ہمیشہ کامیاب ہوئے ہیں''۔

حاکم اعلیٰ نے تھوڑی دیر غور کیا پھر بولے، ''بندھوؤ! آپ سب کی کیا رائے ہے؟''

سب نے ایک زبان ہو کر کہا بانسری جی ٹھیک کہتے ہیں۔

حاکمِ اعلیٰ نے شال کو پھر درست کیا اور اٹھ گئے۔

''ٹھیک ہے بانسری جی آپ سرکاری خرچ پر پورے ملک کا دورہ کریں اور ہر جگہ دانہ ڈالتے جائیں۔ مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں استعفیٰ کی دھمکی دیں۔ یاد رہے صرف دھمکی۔ استعفیٰ بھول کر بھی نہ دیں ورنہ پھنسانے کے بجائے آپ خود پھنس جائیں گے۔ آخر میں ہم اعلان کردیں گے کہ معاملہ سرکار کے زیرغور ہے۔ اتنے میں الیکشن آجائے گا۔ ہمیں وہیں تک تو سنبھالنا ہے۔ نمسکار''

''تو کیا الیکشن کے بعد ہم اپنا وعدہ بھول جائیں گے؟'' جعفر ظریف نے اپنی خشخشی داڑھی کھجاتے ہوئے پوچھا کیونکہ وہ مسلمان تھے اور مسلمانوں کے لئے پریشان ہونا اپنا حق سمجھتے تھے۔

حاکمِ اعلیٰ مہین مہین مسکرائے۔ ''ظریف جی آپ سیاست میں کچے کے کچے ہی رہے، بات مطالبہ پورا کرنے کی نہیں ہے صرف دانہ ڈالنے اور پھنسانے کی ہے۔ سمجھنے کی کوشش کریئے ظریف جی۔ اور ہاں یہ باتیں ٹاپ سیکرٹ ہیں کسی نے اندر کی بات باہر کی تو سسپنڈ کردوں گا سمجھے؟''۔

''یس سر'' کہنے والوں میں شہزاد اور ظریف کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ حاکمِ اعلیٰ نے ہاتھ جوڑے اور دھوتی کے لٹکتے سرے کو پکڑے پکڑے ہال سے باہر نکل گئے۔

(نومبر ۱۹۹۵)

مراجعت

شاہ زمانی کی درگاہ شریف کے دوسرے دروازے کے سامنے سے ہنڈولہ تالاب کی طرف چلتے ہوئے روحیلہ نے فقیروں کی ایک ٹولی دیکھی تو گھبرا کر اپنی ماں کو پکڑ لیا۔

''بڑی! بھاگو۔ یہ لوگ ابھی لپٹ جائیں گے تو ہمارے جسم پر ایک بھی بوٹی نہ بچے گی''۔

روحیلہ اپنی ماں کو ''بڑی'' کہتی تھی۔ شاید اس لئے کہ دونوں ماں بیٹی کم اور بہنیں زیادہ دکھائی دیتی تھیں۔ فرق صرف بڑی اور چھوٹی کا تھا۔ ماں بھنویں نوچ کر ابرو خم دار رنگتی تھی، چہرے پر فیس بلیچ لیپ لگا کر چٹیل بناتی تھی بالوں کو براؤن خضاب سے رنگتی تھی آنکھوں کے نیچے کمبخت ذرا ذرا حلقے پڑنے لگے تھے۔ ان کو نچ کرتی تھی اور بڑے گلے کا سیلولیس بلاوز پہنتی تھی۔ پہنتی خیر کیا تھی چار گرہ کپڑا بدن سے چپکا رہتا تھا جیسے تیسے اور چلتے وقت قدم یوں اٹھاتی تھی کی شعر

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے
نشہ کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے

صادق آجاتا تھا۔

یہ تھی بڑی اور روحیلہ کی تو خیر عمر ہی ایسی تھی کہ خواہ مخواہ ہر چیز کچلنے کا جی چاہتا تھا چاہے زمین پر رینگتا ہوا کیڑا ہو یا اندرون ستر کلبلاتی ہوئی کوئی شے۔ دونوں ساتھ چلتے تو تجربہ کار دیدہ ور بھی فیصلہ نہیں کر پاتے کہ پروانہ اِدھر جائے گا یا اُدھر۔

بڑی ''اوئی'' کہہ کر جو اچھلی تو انور صاحب سے ٹکرا گئی۔ وہ اُس وقت ناک پر رومال رکھے اپنی سیدھ میں چل رہے تھے۔ رومال تو جیب سے انہوں نے اسی وقت نکال لیا تھا جب وہ درگاہ شاہ زمانی کے پہلے دروازے پر ٹیکسی سے اترتے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ درگاہ شاہ زمانی کے دو دروازے ہیں اور انہیں دوسرے دروازے پر اترنا ہے۔ اور پھر وہاں سے منزل کی تلاش شروع کرنی ہے۔ پہلا دروازہ آیا تو انہوں نے سمجھا کہ یہی ٹیکسی چھوڑنے کی جگہ ہے اور انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ ٹیکسی سے اترے تو انہیں فوراً احساس ہو گیا کہ جیب سے رومال نکالنے کی اشد ضرورت ہے۔ انہوں نے رومال نکالا اسے ناک پر رکھا اور آگے بڑھنے لگے۔ شاہ زمانی کی آبادی پہلے دروازے سے شروع ہو گئی تھی۔ وہ گھبرا گھبرا کر دائیں بائیں دیکھتے پھر تیز تیز چلنے لگتے۔ ویسے دایاں کیا اور بایاں کیا دونوں ہی طرف غلیظ دوکانیں بے ڈھنگی دوکانیں، بے ترتیب اور غیر معیاری مکانات، گندے ہوٹل ان میں کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھے پھسڈی لوگ جو بات بات پر قہقہہ لگاتے تھے۔ اتنی زور سے ہنستے تھے کہ انور صاحب کی پوری زندگی کی ہنسی کو جوڑا جاتا تو بھی ان لوگوں کا ایک قہقہہ نہ بنتا۔ نہ معلوم ان پست لوگوں میں اتنے سارے قہقہے کیسے سما گئے ہیں۔ انور صاحب سوچ سوچ کر حیرت زدہ ہوتے۔ انہوں نے صرف مسکراہٹ دیکھی تھی۔ ایسی کہ اِدھر جگنو چمکا اُدھر بجھا۔ حد سے حد ہنسی دیکھی تھی۔ مگر وہ بھی زکامی کھانسی کے ایک جھٹکے کی طرح کہ آداب محفل کا خیال رکھتے ہوئے فوراً دبا دی جائے اور یہاں دیکھو تو لوگ قہقہہ اس طرح لگاتے ہیں جیسے پٹاخے چھوٹ رہے ہوں اور وہ بھی ایک آواز ایک ترنگ میں نہیں بلکہ کئی کھنکوں کے ساتھ اوپر سے نان بائی کی پھٹا پھٹ اور تنور میں جلتی ہوئی لکڑیوں کی چٹا چٹ۔

''او مائی گاڈ''

انور صاحب گرتے گرتے بچے۔ اسی وقت شاہ زمانی کی مسجد سے مغرب کی اذان گونجی

اللہ اکبر اللہ اکبر

تینوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ ''جلدی چلو اندھیرا ہو جائے گا تو اس گندی بستی میں ہم کھو جائیں گے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ دیسی شراب کی بھٹیاں سَن سیٹ کے بعد گرم کی جاتی ہیں''۔ روحیلہ نے گھبرا کر کہا۔ اس پر بڑی بولی۔ ''سن سیٹ ابھی کہاں ہوا ہے ابھی میری گھڑی کے ڈائل میں روشنی نہیں آئی''۔

''لیکن یہ اذان؟''

انور صاحب کی یادوں کے دریچے سے ان کے بچپن کا کوئی واقعہ گزرنے لگا۔

''ایک بار ایسا ہوا''۔ انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''تب میں بہت چھوٹا تھا روزے بارش میں پڑے۔ ایک دن بادل اتنے گہرے تھے کہ دن میں شام کا گمان ہونے لگا۔ ہمارے گاؤں کی مسجد کے امام نے سمجھا کہ سورج غروب ہوگیا۔ انہوں نے اذان دے دی۔ لوگوں نے روزہ افطار کر ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد بادل ذرا چھٹا تو دھوپ نکل آئی۔ سب نے امام صاحب کو خوب لتاڑا''۔

اتنا کہہ کر انور صاحب ہنس پڑے۔ ویسے تو ان کی ہنسی کافی محتاط تھی۔ پھر بھی بڑی خفا ہوگئی۔

''یہ قبل از تاریخ کی باتیں ہیں، اب ان کا ذکر کرنا حماقت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ آج بھی اذانوں کو دِن ڈوبنے کا اعلانیہ سمجھتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو سورج اگر ڈوبا نہیں ہے تو ڈوب جائے گا۔ دھوپ تو کہیں دکھائی نہیں دے رہی ہے اس لئے اندھیرا ہو سکتا ہے۔ لیکن راستہ بڑا خراب ہے گرنے کا خطرہ ہے بیٹی روحیلہ ذرا سنبھلنا تمہارے سینڈل کی ایڑی کچھ زیادہ ہی اونچی ہے۔

''ڈیڈ کی ناک کی طرح''

روحیلہ نے انور صاحب کی طرف دیکھا جو اپنی ناک کو مسلسل رومال سے دبائے ہوئے تھے۔ دونوں ماں بیٹی ہنس پڑیں۔ مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی سننے نہ پائے۔

روحیلہ اپنے باپ کو ڈیڈ کہتی تھی۔ املا میں فرق ہو سکتا ہے لیکن تلفظ تو بس موت ہی سے

غٹرغوں

باہر پھر شور سنائی دیا۔ وہی نعروں کا غلغلہ جسے سن کر آشا کی روح فنا ہونے لگتی تھی۔ اس کے بدن کے تمام رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ منھ کھلا کا کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ اس کا جی چاہتا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس کے اندر سما جائے کہ اس جگر خراش آواز سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے۔

اس نے اپنی ماں کو جھنجھوڑا۔ ''ممی''

شکنتلا کے سر میں صبح سے درد تھا۔ اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے دن بھر کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ مضمحل اداس، افتاں وخیزاں ڈگمگ گھر میں اِدھر سے اُدھر پھرتی رہی تھی اور تھوڑی دیر قبل اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ رام سنگھ چار روز قبل کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا اور اسی درمیان یہ فساد پھوٹ پڑا تھا اور بات صرف یہ تھی کہ دو لڑکوں میں کھیل کھیل میں جھگڑا ہو گیا تھا اور اتفاق سے ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان۔ پھر کیا تھا ہندوؤں کی اکثریت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی انفرادیت ختم ہونے لگی تھی اور وہ دونوں اپنے پسندیدہ کھیل کھیلنے لگے تھے۔ کشت وخون کا کھیل

قریب تھا۔ ویسے انور صاحب پوری طرح زندہ ہی کہاں تھے۔ زندہ تو ان کی بیوی تھی۔ وہ تو بس اس طوطے کی طرح تھے جو پنجرے میں بند تھا اور سمندر کی تہہ میں جن کے قبضے میں تھا۔

بیٹی کے طنز پر انہوں نے رومال ناک سے ہٹایا مگر دوسرے لمحے ہی انھیں متلی آنے لگی۔ اور وہ واوا کرنے لگے۔

بڑی نے جلدی سے پرس کھولا۔ الائچی نکالی۔ ایک الائچی انور صاحب کی طرف بڑھائی دوسری اپنے منھ میں رکھی اور تیسری روحیلہ کو دینے لگی تو وہ بولی''۔ مجھے شوگر کوٹیڈ پلز دو۔ الائچی آؤٹ ڈیٹیڈ ہوگئی ہے''۔

بڑی نے مسکرا کر اس کے کمر کو دبایا۔''اسٹوپڈ''

انور صاحب الائچی چباتے ہوئے بولے۔''مجھے یاد آتا ہے جب میں بہت چھوٹا تھا۔ ان دنوں اپنے آبائی گاؤں میں رہتا تھا۔ میرے دادا روزانہ شام کے وقت تکیہ شاہ کے مزار تک ٹہلنے جایا کرتے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن واپسی پر مجھے زمین پر پڑی ہوئی ایک الائچی دکھائی دی جو عام الائچی سے کم از کم چار گنا بڑی تھی اور سفید ایسی جیسے دودھ۔ میں نے اٹھانا چاہا تو دادا نے روک دیا۔ کہا اسے مت اٹھانا یہ جنوں کی الائچی ہے۔ پھر اوپر منھ کر کے زور سے سانس لی اور کہا سونگھو کیسی خوشبو آرہی ہے ابھی ابھی ادھر سے جن گزرے ہیں''۔

انور صاحب کی باتیں سن کر روحیلہ نے تو مزہ لیا لیکن بڑی خفا ہوگئی۔ نان سینس آپ نے جنوں کی خوشبو سونگھی ہوگی لیکن اس وقت تو میری ناک میں اتنی قسم کی بدبو گھسی جارہی ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہورہا ہے کہ کس چیز کی بدبو ہے۔ سڑے ہوئے گوشت کی یا پکی ہوئی مچھلی کی، لیٹرن کی یا اگربتی کی مختلف قسم کی بدبو دھوئیں کے ساتھ گڈمڈ ہوگئی ہے''۔

''بڑی؟''

'یس بیٹی'

''اگربتی مہکتی ہے، بدبو نہیں کرتی''۔ روحیلہ نے اپنے علم کا اظہار کیا۔ اس پر بڑی نے اسے جھڑک لیا۔

''کوئی اگربتی وگربتی مہکتی نہیں۔مہکتا تو صرف فرانسیسی سینٹ ہے لیکن کمبخت یہاں کی گھٹن اور سرانڈھ ہمارے کپڑوں پر اسپرے کئے ہوئے پرفیوم پر حاوی ہوگئی ہے'' اتنا کہہ کر اس نے کرختگی سے اپنے شوہر انور صاحب سے پوچھا۔

''فارگاڈ سیک یہ بتایئے کہ آپ ہمیں کہاں لئے جارہے ہیں''۔

انور صاحب کو یہ سوال بے تکا لگا۔جز بز ہوکر بولے۔

''کمال کرتی ہو۔جانتی ہو کہ شاہ زمانی سوسائٹی میں کرایہ پر مکان لیا ہے وہیں جارہے ہیں، پھر بھی پوچھتی ہو کہاں جارہے ہیں''۔

''لیکن یہ آپ کی سوسائٹی ہے کہاں۔ہم اس پل صراط سے صحیح سالم نکل جائیں گے۔کیا آپ کو یقین ہے؟''

روحیلہ نے دفعتاً منہ سے سیٹی بجائی۔بولی فنٹاسٹک

''کیا فنٹاسٹک'' بڑی نے اسے ڈانٹا۔

''پل صراط'' روحیلہ نے پھر سیٹی بجائی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی سننے نہ پائے۔

''کیسا پل صراط؟'' بڑی کا غصہ بڑھ گیا۔اس پر روحیلہ نے اطمینان سے کہا۔

''بڑی تم پر اس آبادی کا اثر ہونے لگا ہے۔تم مسلمان ہورہی ہو۔پل صراط لفظ کا استعمال شاید تم نے زندگی میں پہلی بار کیا ہے۔کسی انگریزی ناول میں پڑھا ہوگا''۔

''شٹ اپ''

''اوکے''

انور صاحب نے جلدی سے مداخلت کی۔''بھئی تم دونوں چخ چخ مت کرو۔پل صراط پر مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا ہے۔بقراعید کے دن ہمارے یہاں بکرے کی قربانی ہوتی تھی۔ایک بکرا تھا ہمارے یہاں بڑا غصور۔دادا جان اپنے ہاتھوں میں ایک تختی لے لیا کرتے تھے اور اسے للکارتے تھے۔وہ دوڑ کر آتا تھا اور کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ اس تختی پر سر مارنے لگتا تھا۔جب تھک ہار جاتا تو بھاگ جاتا۔ایک سال اس کی قربانی ہونے لگی تو میں نے دادا جان سے کہا کہ اس بکرے کی

قربانی اپنے نام سے نہ کرائیں۔انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا، وہ آپ کو پل صراط سے نیچے گرادیگا اور آپ نے جتنا اس کو ستایا ہے اس کا بدلہ لے لے گا۔میری اس بات پر دادا جان بہت ہنسے تھے''۔

انور صاحب کی بات سن کر روحیلہ ہنس پڑی۔لیکن بڑی خفا ہوگئی۔

''آپ کی بات پر صرف بے وقوف ہی ہنس سکتا ہے۔آخر آپ کو اپنے بچپن کی ساری حماقتیں کیوں یاد ہیں، کیا آپ میں بھولنے کی صلاحیت مفقود ہے؟''۔

انور صاحب سٹک گئے۔روحیلہ بھی چپ ہوگئی۔اس کے بعد تینوں خاموشی سے چلنے لگے۔سڑک کے دونوں طرف جھگی جھونپڑیوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔گھاس پھوس کی جھونپڑیاں، کچی دیواروں کی جھونپڑیاں، ادھ پکی جھونپڑیاں اور ان سے نکلتے ہوئے لکڑیوں اور کوئلوں کے دھوئیں، اندر سے جھانکتی ہوئی ٹمٹماتے دیے کی روشنی، دروازے پر پڑا ٹاٹ کا پردہ، سامنے بہتی ہوئی نالیاں اور ٹھہرے ہوئے پانی کے گڈھے، بچوں کی چیخ وپکار، عورتوں کی ڈانٹ وڈپٹ، مردوں کی گھن گرج، ریڈیو کا شور وغل اور رہ رہ کر ٹھنکارتا ہوا قہقہہ۔

''یہ لوگ اتنا ہنستے کیوں ہیں؟''۔بڑی کوان کی ہنسی سخت ناگوار تھی۔''جانور سے بدتر ان کی زندگی۔اس طرح سوارخوں میں رہتے ہیں جیسے چوہے ہوں پھر بھی اتنی زور سے ہنستے ہیں کہ مہذب آدمی کا دل بند ہوجائے''۔چند لمحوں کے وقفہ کے بعد بڑی نے انور صاحب سے کہا۔''کسی سے پوچھو کہ شاہ جی والی سوسائٹی کہاں ہے۔''

''شاہ جی والی نہیں۔شاہ زمانی''۔انور صاحب بولے۔

''کچھ بھی ہو لیکن ہے کہاں۔یہ مسلمان لوگ کیسے کیسے نام رکھ لیتے ہیں۔، ہماری دلّی میں تو ایسے خوبصورت خوبصورت نام نئی بستیوں کے رکھے جاتے ہیں کہ طبیعت باغ باغ ہوجاتی ہے۔فلورنس گارڈن، ڈاؤن دی ہل، بلیک ہارس، وہائٹ جیسمین اور یہ لوگ نام رکھتے ہیں شاہ زمانی۔خلیفہ فتیلے شاہ۔دائرہ پیر دستگیر۔ہوں۔''

اس پر روحیلہ نے اپنی ماں کو چھیڑا۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

''لیکن بڑی دہلی میں تم نے پوش لوکلٹی دیکھی ہے۔بلی ماران اور چتلی قبر کا نام کبھی سنا ہے؟''

'سنا ہے اسی کا تو رونا ہے'۔

''تو اب رونا بند کرو''۔انور صاحب کو بھی مذاق سوجھا۔لیکن بڑی کو یہ مذاق ناگوار گزرا،تلخی سے بولی۔

''بند تو کروں مگر اس کاکروچ اسٹریٹ سے مجھے نکالو تب نہ۔کسی سے پوچھتے کیوں نہیں کہ شاہ والی سوسائٹی کہاں ہے''۔

انور صاحب رکے،جھجکے اِدھر اُدھر دیکھا اور ڈرے سہمے ایک جھونپڑے کی طرف بڑھے اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہونچتے اندر سے تین آدمی ایک ساتھ نکلے ایک عورت ایک مرد اور ایک دس بارہ سال کی لڑکی۔تینوں نے ایک ساتھ ان تینوں کو دیکھا۔پھر مرد بولا۔

''کیا ہے صاحب''

''ہمیں شاہ زمانی سوسائٹی میں جانا ہے۔کیا تم بتا سکتے ہو وہ کہاں ہے''؟

''ہاں صاحب آپ سیدھے چلے جائیں۔تھوڑی دور پر دا ہنی طرف ایک کباڑ خانہ ملے گا۔وہیں سے ڈھلوان شروع ہو جاتی ہے۔ڈھلوان کے قدموں میں یہ سوسائٹی ہے۔نئی سوسائٹی ہے۔ابھی تھوڑے ہی لوگ رہنے کیلئے آئے ہیں کیا آپ بھی یہاں رہنے کے لئے آئے ہیں''؟۔

'ہاں'

''چلو اچھا ہوا۔ہمارے بیچ بھلے لوگ رہیں گے تو ہمارا بھی بھلا ہوگا۔ہم تو یہاں پڑھے لکھے لوگوں کی صورتوں تک کو ترستے ہیں۔آپ لوگوں کی وجہ سے یہاں کا ماحول بدلے گا۔ہمارا مقدر بھی جاگے گا''۔

اس بیچ لڑکی روحیلہ اور بڑی کے پاس پہنچ گئی۔اس نے انہیں غور سے دیکھا پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔''آپ سنیما میں کام کرتی ہیں؟''

''ہٹ یہاں سے''بڑی نے اتنی زور سے اُسے ڈانٹا کہ وہ بے چاری سہم کر گھر کے

اندر بھاگ گئی۔

تینوں پھر چلے۔ جب تک یہ لوگ سیدھے سیدھے چل رہے تھے کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ کوئی کوئی اچٹتی نظر ڈال لیتا تو ڈال لیتا ورنہ راہ گیروں کو دھیان سے دیکھنے کی ضرورت کس کو تھی۔ لیکن جب ان لوگوں کو پوچھ گچھ کرتے دیکھا تو وہاں کے لوگوں کو دلچسپی ہوئی اور کئی لوگ انہیں غور سے دیکھنے لگے اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

''باہر سے آئے ہوئے لگتے ہیں''۔

''کسی کا مکان ڈھونڈ رہے ہیں''

''شاید نئی سوسائٹی میں جانا چاہتے ہیں''۔

''بڑے آدمی دکھائی دیتے ہیں''۔

وہ لوگ آپس میں قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا چلو معلوم کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے وہی لوگ ہوں، مارفتیا صاحب نے کہا تھا کہ وہ لوگ آئیں گے۔

چار پانچ آدمی لنگیاں پہنے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ بڑی نے جلدی سے گلے سے زنجیر اور کلائی سے چوڑی اتاری اور انہیں پرس میں ڈال لیا۔ روحیلہ کا ہاتھ ناک، کان، گلا سب خالی تھا۔ اس لئے اسے کسی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے پاس صرف جسم تھا اور بلاشبہ وہ بہت خوبصورت اور بے حد قیمتی تھا۔ لیکن اسے چھپاتی کہاں اور کس طرح۔ وہ لوگ قریب آئے۔ ان میں سے ایک نے بڑے ادب سے پوچھا

''کیا ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں''

بڑی کو ریلوے اسٹیشن پر لگا بورڈ یاد آ گیا۔ جہاں پولیس کا ایک آدمی بیٹھا اونگھا کرتا ہے اور محض اس ڈر سے کہ کہیں وہ سامان کی تلاشی نہ لینے لگے اور ایک آدھ سامان مار نہ دے کوئی مسافر اس کے پاس پھٹکتا تک نہیں۔

اس نے غور سے اس شخص کو دیکھا۔ لنگی اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ چھوٹی سی داڑھی بھی تھی سر چکنا تھا۔ یہ بات بڑی کو معلوم نہ ہو سکی کہ اس کا سر گھٹا ہوا تھا یا وہ گنجا تھا۔ قد ٹھنگنا تھا وہ ٹیڑھا

کھڑا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ چھوٹی ہے۔ بڑی کو کالج کے زمانے کا ایک ڈرامہ یاد آ گیا 'فردوس بریں' اس میں ایک کردار تھا شیخ للو، بالکل اس شخص سے ملتا جلتا۔ پہلا انعام اسی کردار کو ملا تھا۔ کیا ایکٹنگ کی تھی۔ غضب کر دیا تھا۔ بچہ بچہ اس سے متنفر ہو گیا تھا اور پہلا انعام وہ مار لے گیا تھا۔

اس نے نفرت سے منھ دوسری طرف موڑ لیا۔

''ہم شاہ زمانی سوسائٹی تلاش کر رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے وہ کہاں ہے''۔ انور صاحب نے پوچھا۔ اس شخص کی آنکھوں میں خوشی تیرنے لگی۔

''کیا آپ انور صاحب ہیں؟''

''جی ہاں''

کیا آپ بدرالدین نورالدین مارفتیا کے مکان میں رہنے کے لئے آئے ہیں؟''

''جی ہاں۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا''

''مجھے مارفتیا صاحب نے بتایا تھا کہ آپ لوگ آج آنے والے ہیں۔ ہم انتظار ہی کر رہے تھے۔ چلئے آپ کو مکان دکھا دیں''۔

وہ آگے بڑھنے لگا تو بڑی بولی۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو''۔ اس نے اس عرصہ میں کان کی بالی بھی نکال کر پرس میں ڈال لیا تھا۔ بڑی کے سوال پر وہ شخص چند لمحے کے لئے ٹھٹھکا پھر بولا۔

''میرا نام حامد علی ہے۔ میں ہنڈولا تالاب کی سرسبیل کمیٹی کا سکریٹری ہوں''۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بتاؤ کہ یہاں دنگا فساد تو روز ہوتا ہوگا۔ دوسرے تیسرے دن قتل بھی ہوتا ہوگا۔ جوئے بھی رات بھر کھیلے جاتے ہوں گے اور شراب کی بھٹی تو ہر گھر میں ہوگی۔ ہے نا؟''۔

بڑی نے اس طرح پوچھا۔ جیسے ان سب کی خیریت پوچھ رہی ہو۔ بڑی کی بات سن کر سبھوں کے چہرے اتر گئے۔ چند لمحوں تک کوئی کچھ نہ بولا پھر حامد علی نے ہمت کی۔

''بیگم صاحبہ یہ غریبوں محتاجوں کی بستی ضرور ہے۔لیکن یہاں بھی محنت کش لوگ رہتے ہیں۔ہم جھونپڑوں والوں کے بارے میں لوگوں کو بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ہم لوگ بُرے نہیں ہوتے، شرابی اور جوئے باز نہیں ہوتے ہمارے پاس رہنے کے لئے اچھا مکان نہیں۔محض اس وجہ سے ہم پر تمام تہمتیں لگائی جاتی ہیں۔آپ یہاں رہیں گی تو پتہ چل جائے گا کہ، ہم لوگ کیسے ہیں''۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے'' بڑی کو حامد سے وحشت ہونے لگی۔''وہ شاہ والی سوسائٹی کہاں ہے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''چلئے دکھاتے ہیں''۔

اتنا کہہ کر حامد علی چلنے لگا۔وہ واقعی بھچک رہا تھا۔پیچھے پیچھے یہ لوگ بھی چلنے لگے۔

حامد علی نے کہا۔

''کچھ لوگ یہاں بھی بُرے ضرور ہیں۔لیکن ایسے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔اونچی سوسائٹی میں برائی بھی اونچی ہوتی ہے۔فرق اتنا ہے کہ انہیں قانون اپنے سائے میں لئے رہتا ہے اور ہم غریبوں کو اپنے شکنجے میں دابے رہتا ہے، اس لئے ہم ہر جگہ برے ثابت ہو جاتے ہیں''۔

چلتے چلتے وہ ایک طرف مڑ گیا۔

''آیئے اس ڈھلوان کے بعد وہ سوسائٹی شروع ہو جاتی ہے'' اس نے کہا۔

یہاں زمین اوبر کھابڑ تھی۔روحیلہ کی اونچی ایڑی کی سینڈل ابھری ہوئی دو اینٹوں کے درمیان پھنس گئی۔اس نے زور لگایا تو ایڑی دونوں اینٹوں کی درمیان جوں کی توں پھنسی رہ گئی۔البتہ سینڈل باہر نکل آئی۔اور اب وہ بھی اُسی طرح بھچک بھچک کر چل رہی تھی جس طرح حامد علی چل رہا تھا۔

ڈھلوان کے قدموں میں شاہ زمانی سوسائٹی تھی۔حامد علی نے ان لوگوں کی رہنمائی مکان تک کی۔بڑی نے اپنا پرس کھول کر اطمینان کر لیا تھا کہ اس میں چھوٹی نوٹیں موجود ہیں۔وہ حامد علی کی خدمات کے صلے میں اسے کچھ دینے کا ارادہ کر چکی تھی۔حامد علی کی باتوں سے اسے بڑی الجھن ہوئی تھی وہ چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد دفع ہو جائے اور اس کی بک بک سے اسے نجات ملے۔وہ تھک گئی

تھی۔اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔اس گھر میں تو کچھ تھا نہیں اور اس پچھڑے علاقے میں کوئی ڈھنگ کی چیز ملنے کے امکانات بھی نہ تھے۔اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔

انور صاحب نے دروازہ کھولا۔حامد علی باہر کھڑا رہا۔بڑی نے اپنا پرس کھولا اور پانچ روپے کی ایک نوٹ نکال کر حامد کی طرف بڑھایا۔

''یہ لو تمہارا نذرانہ''

حامد سکتہ میں آ گیا۔لیکن اس نے فوراً اپنے کو سنبھال لیا۔اس نے روپیہ لے لیا اور کچھ بولے بغیر چلا گیا۔انور صاحب، بڑی اور روحیلہ اندر داخل ہوئے تین کمروں کا آراستہ مکان تھا۔سب کو پسند آیا، وہ تینوں ڈرائنگ روم میں پھیل کر بیٹھ گئے۔انور صاحب صوفہ پر لیٹتے ہوئے بولے'' حامد علی کو دیکھ کر مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔تب میں بہت چھوٹا تھا۔ایک بار ہم کہیں باہر جا رہے تھے۔اسٹیشن پر چھوڑنے ابا حضور کے ایک دوست بھی آئے تھے۔وہ ہمیں رہ رہ کر لپٹا رہے تھے اور بار بار دعائیں دے رہے تھے۔گاڑی چلی تو وہ بڑی حسرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔میرے دل میں ایک ہُوک سی اٹھی۔سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے لئے کیا کروں کچھ اور نہ سوجھا تو جیب سے ایک روپیہ نکالا اور ان کی طرف پھینکتے ہوئے بولا۔

''چچا جان حلوہ کھا لیجئے گا''۔

اس کے بعد چچا جان جب بھی ہمارے گھر آتے مجھ سے کہتے بیٹے حلوہ نہیں کھلاؤ گے۔اور میں شرم سے کٹ کٹ جاتا۔یہ تو مجھے اُسی دن ابا حضور نے بتا دیا تھا کہ وہ شہر کے بہت بڑے رئیس تھے۔

روحیلہ زور سے ہنس پڑی لیکن بڑی کا چہرہ غصّہ سے سرخ ہو گیا۔بولی۔

''آپ کو اِس علاقہ میں آ کر بار بار اپنا بچپن کیوں یاد آ رہا ہے اپنی مٹی کی بو سونگھ لی ہے کیا۔کچھ کھانے پینے کا بندوبست کریئے گا یا آج کی رات فاقے ہی ہوں گے''۔

تھوڑی دیر بعد حامد علی دوبارہ حاضر ہوا۔اِس بار اس کے ساتھ کچھ دوسرے نوجوان تھے اور چند عورتیں بھی جن کے ہاتھوں میں کھانے کے تھال اور پانی کے گھڑے تھے۔

حامد علی نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا۔ آپ لوگ نہادھو کر تازہ دم ہولیں۔ ہماری عورتوں نے آپ لوگوں کے لیے کھانا تیار کیا تھا وہ لے کر حاضر ہوئی ہیں۔ آپ لوگ کھانا کھالیں۔ اس کے بعد ضرورت کی ساری چیزیں ہم لادیں گے۔ ہماری کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ کم از کم ایک ہفتہ تک آپ ہمارے مہمان رہیں گے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے پانچ روپے دئے تھے میں نے ان سے درگاہ شریف پر آپ لوگوں کی نیاز اتار دی ہے''۔

بڑی نے گھبرا کر کہا۔ ''لیکن وہ روپیہ تو میں نے تمہیں دیا تھا''۔

اس سے پہلے کہ حامد علی کچھ کہتا انور صاحب کھڑے ہوگئے۔ وہ اپنی بیگم کے پاس گئے اور بولے۔

''تمہاری اس ذلیل حرکت سے مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا''۔

'شٹ اپ'۔ بڑی نے انہیں زور سے ڈانٹا۔

اس پر روحیلہ جھٹکے سے اٹھی اور اپنے باپ سے آ کر لپٹ گئی۔

''ابا حضور مجھے سنایئے۔ میں سب کچھ سننا چاہتی ہوں''۔

''کیا کہا تم نے مجھے؟ ابا حضور؟''

''ہاں اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ میں آپ کے بچپن میں لوٹنا چاہتی ہوں ابا حضور۔ بڑی تو بہت آگے نکل گئی ہیں''۔

اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(جنوری ۱۹۸۸)

چاردنوں سے قتل وغارت گری، آتش زنی، لوٹ مار، اغوا کا بازار گرم تھا اور گرم بھی ایسا کہ آگ کہیں بھی لگی ہوتی دھواں پورے شہر پر پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ کرفیو تو حسب معمول لگا ہی تھا اور یہی وجہ تھی کہ لوگ بے خطر اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جب چاروں طرف خاموشی ہو تو کسی مکان یا دوکان میں آگ لگا کر کھسک جانا کتنا آسان ہے یا کسی کے گھر میں گھس کر لوٹ مار کر کے بھاگ جانا، یا کسی لڑکی کا اغوا کر لینا، بائیں ہاتھ کا کھیل ہو جاتا ہے اور اسی لئے محافظ قانون پہلے کرفیو لگاتے ہیں پھر بات آگے بڑھتی ہے۔

تو بات اتنی آگے بڑھ گئی تھی کہ لوگ دن دہاڑے گھروں میں آگ لگا رہے تھے، املاک لوٹ رہے تھے، لڑکیوں اور عورتوں کی بے عزتی کر رہے تھے اور یہاں وہاں خون میں لتھڑی لاشیں چھوڑ کر آگے بڑھ رہے تھے کہ بات تو پہلے ہی آگے بڑھ گئی تھی۔

شگفتلا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ''کیا ہوا''۔

''ممی باہر غنڈے آگئے ہیں۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے''۔

شگفتلا نے اسے اپنے سینے سے نہیں لگایا۔ بس اسے دیکھنے لگی۔ کھوئی کھوئی سی۔ اسے دلاسہ بھی نہیں دیا، ہمت بھی نہیں بندھائی، منہ سے کچھ بولی ہی نہیں۔ بس اس پر اپنی نگاہیں جمائے رہی۔ آشا نے اس سے لپٹنا چاہا تو اس نے اسے پرے ہٹا دیا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت باہر نعرہ پھر بلند ہوا۔ اس بار آواز ان کے گھر کے پاس تھی۔ آشا گھبرا کر رونے لگی لیکن شگفتلا یوں ہی بیٹھی رہی جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو، جیسے کوئی عفریت اس کے دل پر بیٹھ گئی ہو۔ آواز سے نہ تو وہ ڈری اور نہ گھبرائی، نہ بھاگی نہ روئی، بس کسی مجسمے کی طرح خاموش رہی اور اپنے گھر کی منڈیر پر بیٹھے اس کبوتر کو دیکھنے لگی، جو ساکت اور جامد تھا اور اپنے سر کو اپنی گردن میں دبائے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔

''یہ کبوتر ایسے موقعوں پر اس طرح کیوں نظر آتا ہے'' اس نے سوچا

وہ کبوتر کو دیکھ رہی تھی جو ساکت و جامد تھا اور اپنے سر کو اپنی گردن میں دبائے ہوئے

نام : سید ظفر الحسن ہاشمی

قلمی نام : سید ظفر ہاشمی

پیدائش : یکم جولائی ۱۹۴۰ء

آبائی وطن : موضع بہروز پور، ڈاکخانہ سوراپور، تحصیل ٹانڈہ، ضلع فیض آباد (امبیڈکر نگر) یو. پی.

ملازمت : اکاؤنٹنٹ جنرل آفس گجرات احمد آباد سے سینئر آڈٹ آفیسر کے عہدہ سے ریٹائرڈ۔

موجودہ مصروفیات : کل وقتی مصنف وایڈیٹر گلبن، لکھنؤ۔

موجودہ پتہ : 31-30، حسن گارڈن کالونی، کمتا، چہٹ، لکھنؤ 227105 یو. پی.

تصنیفات : منزل تک (ناول) ۱۹۸۱ء ● عجیب بات ہے (افسانے) ۱۹۹۰ء ● منتخب افسانے (انتخاب) ۱۹۹۰ء ● حاجی معلّق (طنزیہ ومزاحیہ خاکے) ۱۹۹۴ء ● جب ایسا ہو (منتخب افسانے) ۲۰۰۵ء ● حاجی معلّق حصہ دوم (زیر ترتیب)

Printed at : Parekh Offset Printing Press Lko. Ph : 3943484

خاموش منڈیر پر بیٹھا تھا۔ گھر میں وہ اپنی ماں کے ساتھ اکیلی تھی۔ اُس وقت باہر شور بلند ہوا۔ وہ چیخ مار کر اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ ماں نے اسے چھاتی سے لگالیا اور گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگنے لگی۔ یا اللہ میری بچی کی عزت و آبرو تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو ہی مدد کرنے والا ہے۔ کرم فرما رحیم و کریم۔

لیکن وہ جو چاہتی تھی وہ نہ ہوا۔ بلکہ ہوا یوں کہ دروازہ توڑ کر بلوائی اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے اسے ماں کی گرفت سے چھینا، کندھے پر لادا اور بھاگ نکلا۔

پھر رام سنگھ اسے اپنے دیس لے آیا اور شکیلہ سے شکنتلا بنا دیا۔ کتنا آسان تھا شکیلہ سے شکنتلا بنا دینا۔ حرفوں کی بس ذرا سی تبدیلی ہی تو ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ کیا ہوا تھا۔

اس نے حالات سے سمجھوتہ تو کیا، کرنا ہی پڑا، مجبوری تھی۔ لیکن حرفوں کی اس معمولی سی تبدیلی سے ۱۹ سال گزر جانے پر بھی وہ مصالحت نہ کر سکی تھی اور اندر ہی اندر سینے کے کہیں بہت ہی اندر وہ اپنے نام کو صحیح ترتیب و تلفظ کے ساتھ دبائے بیٹھی تھی اور اس کے اظہار کے لیے وقت اور موقع کا انتظار کر رہی تھی۔

''وقت آ گیا''۔ وہ بڑبڑائی

اس کی بڑبڑاہٹ پر آشا نے اسے کندھے سے جھنجھوڑا۔ ''ممی کیا بک رہی ہو۔ باہر بلوائی شور کر رہے ہیں۔ دروازہ توڑ رہے ہیں۔ وہ اندر آ جائیں گے ممی کچھ کرو مجھے بچاؤ ممی''۔

وہ زور زور سے رونے لگی۔

لیکن شکنتلا منڈیر پر بیٹھے اُس کبوتر کو دیکھتی رہی جو پتھر کا تراشا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کا انہماک اس وقت ٹوٹا جب دروازہ ٹوٹ کر صحن میں گرا اور دس بارہ نوجوان لڑکے ان کی طرف لپکے۔

''حنیف لڑکی کو اٹھاؤ''۔ ان میں ایک چلایا۔

آشا چیخ مار کر ماں سے لپٹ گئی۔

لیکن شکنتلا ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے مضبوطی سے آشا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے

تقریباً گھسیٹتی ہوئی حملہ آوروں تک لائی اوران کی طرف اُسے ڈھکیلتے ہوئے کسی بدروح کی طرح چیخی۔

''میں نے ۱۹ سال تک انتظار کیا۔اب لے جاؤ عائشہ کو''

حنیف نے لپک کر آشا کو اپنے کندھے پر لا دلیا اور پھرتی سے باہر نکل گیا۔اسی کے ساتھ جب دوسرے بلوائی بھی بھاگ گئے تو شکنتلا کو دفعتاً احساس ہوا کہ منڈیر پر بیٹھا ہوا کبوتر اس کے سینے میں اتر آیا ہے اور وہاں گردن پھلا پھلا کر ''غٹرغوں غٹرغوں'' کرنے لگا ہے۔

(مارچ ۱۹۸۹)

تلافی

اس نے جیسے ہی میری جیب میں ہاتھ ڈالا میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منھ پر مار دیا۔

''بدمعاش جیب کاٹتا ہے۔''

بس کے مسافر چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ ''مارو سالے کو'' کچھ لوگ چیخے۔ دو ایک تو مارنے کے لئے لپکے بھی۔ یہ دیکھ کر کنڈکٹر دہاڑا'' آپ لوگ اپنی اپنی جگہ پر رہیں، ہنگامہ نہ کریں۔ بس کہیں رکے گی نہیں سیدھے پولس اسٹیشن جائے گی۔ اس کو اندر کرنا ہے۔'' اس نے پاکٹ مار کو ایک موٹی سی گالی دی۔

میں ایک ہاتھ سے بس کی چھڑ اور دوسرے ہاتھ سے پاکٹ مار کی کلائی پکڑے کھڑا تھا۔ وہ ۱۸/۱۹ سال کا دبلا پتلا لڑکا تھا۔ بل باٹم اور فل شرٹ پہنے تھا، بال بڑھے ہوئے تھے، ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ دیکھنے میں کوئی طالب علم لگ رہا تھا۔ وہ بغیر کسی مزاحمت کے گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا اس کے چہرے پر شرمندگی عود کر آئی تھی، وہ جھینپا جھینپا سا لگنے لگا تھا۔ بہت ممکن ہے ایکٹنگ کر رہا ہو

میں نے سوچا شاطر گرہ کٹ پکڑے جانے پر ایسا ہی کرتے ہیں۔

پھر بھی اس کی بھولی بھالی شکل، پُرخجالت چہرہ، شرمندہ آنکھیں اور جھکی گردن دیکھی تو فوراً پسیج گیا۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی۔ دراصل اس لڑکے کی کتاب میرے پہلو میں چُبھی تو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ میری جیب تلاش کر رہا ہے۔ کچھ دن پہلے اسی بس میں میری جیب کٹ گئی تھی۔ تب سے احتیاط برتتا ہوں ضرورت سے زیادہ محتاط آدمی بڑی ہوتا ہی ہے''۔..... میں سراسر جھوٹ بول گیا اور گرہ کٹ کی کلائی چھوڑ دی۔

''سالا پاگل ہے، بے فجول میں ہڑبونگ کر دی۔''

ایک کونے سے آواز آئی اور سب ہنس پڑے۔ اتنے میں میرا اسٹاپ آ گیا۔ میں بس سے اترا تو وہ لڑکا بھی میرے ساتھ اتر گیا۔ میں اسے نظر انداز کر کے آفس کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا تو اس نے پکارا..... ''سنئے'' میں رک گیا۔ وہ میرے قریب آیا جیب سے ایک پرس نکالا۔ اُسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔''

''آپ کا پرس''

میں نے جلدی سے اپنی جیب ٹٹولی۔ وہ خالی تھی۔ ''تم نے یہ حرکت کب کی'' اپنا پرس لیتے ہوئے میں نے سختی سے پوچھا۔

''جب آپ بس سے اتر رہے تھے'' وہ مسکرایا۔

بہت ہی تیز چبھتی ہوئی مسکراہٹ،

''عجیب آدمی ہو میں نے تمہیں پٹنے سے بچایا، تمہاری خاطر جھوٹ بولا، گالی سنی اور تم نے پھر وہی حرکت کی اور وہ بھی میرے ہی ساتھ۔''

''کیا کروں سر، آپ کا بٹوہ صاف دکھائی پڑ رہا تھا۔ میری انگلیوں میں کھجلی ہونے لگی تھی۔ کنٹرول تو بہت کیا مگر.....'' وہ پھر مسکرانے لگا۔

''شرم نہیں آتی تم کو۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''رشید احمد''

''تم یہ نگرا ہوا دھندہ کیوں کرتے ہو؟

''پیٹ کے لئے''

''پیٹ بھرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں''

''ہے۔ پہلے وہی کرتا تھا''

''کیا کرتے تھے؟''

''صاحب لوگوں کو شراب سپلائی کرتا تھا۔ بابو کے اڈے سے'' وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور میں جل گیا۔

''تم کمینے ہو، تمہاری خصلت ہی ایسی ہے۔ تم لوگ سدھر نہیں سکتے۔ میں اور بہت کچھ کہتا مگر اسی وقت ایک بس آ کر بس اسٹاپ پر رک گئی۔ رشید نے منہ سے سیٹی بجائی۔ مجھے ٹاٹا کہا اور دوڑ کر اُس بس میں گھس گیا۔

''مردود''

میں نے نفرت سے کہا اور آفس کمپاونڈ میں داخل ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد تین سال تک میں اُس شہر میں رہا اور اُسی بس سے مستقل آفس جاتا رہا مگر رشید پھر نہ ملا۔ میرا ڈپوٹیشن پیریڈ ختم ہوا تو احمد آباد واپس آ گیا اور اس جیب کترے کو بالکل بھول گیا۔

مجھے احمد آباد آئے ہوئے کوئی ایک ماہ ہوئے تھے۔ میں ایک دن تین دروازہ سے گذر رہا تھا کہ ''سر'' کی آواز سے چونکا۔ مڑ کر دیکھا ۲۱/۲۲ رسال کا ایک لڑکا میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ قریب آ کر وہ بولا،

''سر آپ نے مجھے پہچانا''۔ اور مسکرانے لگا۔ میرے ذہن میں اس کی مسکراہٹ بجلی کی طرح کوندی۔

''رشید'' میرے منہ سے نکلا۔

میری نظروں میں اس انتخاب میں شامل تمام افسانوں کا معیار اعلیٰ ہے۔ مجھے سب پسند ہیں۔ آپ ان کے بارے میں جو چاہیں رائے قائم کر سکتے ہیں آپ کو اختیار ہے۔ ان ۲۸/افسانوں میں ۲۰/افسانے ایسے ہیں جن کے انجام پر میں کہیں غم، کہیں غصہ، کہیں عبرت، کہیں نفرت اور کہیں عقیدت کے احساس سے بوجھل ہو جاتا ہوں اور دیر تک خود فراموشی کے عالم میں رہتا ہوں۔ باقی ۸/افسانوں کے بارے میں ایک عجیب بات آپ کو بتاتا ہوں اور بالکل سچ بتاتا ہوں آپ یقین کریں کہ جب بھی میں انہیں پڑھتا ہوں تو میری آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اِن افسانوں کو ان کی تخلیق سے لے کر اب تک میں بیسوں بار پڑھ چکا ہوں اور ہر بار مجھ پر یہی کیفیت طاری ہوئی ہے۔

جب ایسا ہو.....تو میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔

سید ظفر ہاشمی
لکھنؤ
۱۰/مئی ۲۰۰۵ء

''جی سر''

''بھئی تم خوب ملے''۔اچانک اس سے یہاں مل کر مجھے خوشی ہوئی۔

''آپ یہاں کیسے آئے سر''۔اس نے پوچھا۔

''میرا تبادلہ ہوگیا۔مگر تم؟ تمہارے دھندے کا کیا حال ہے احمد آباد تو بڑا شہر ہے خوب چلتا ہوگا۔''اتنا کہہ کر میں مسکرانے لگا۔

''میں نے وہ کام چھوڑ دیا ہے۔اب دوسرا کرتا ہوں''

''شراب سپلائی کرتے ہو؟'' مجھے اس کی کہی ہوئی بات یاد آگئی۔وہ ہنس پڑا۔''نہیں سر۔پھل کی لاری لگاتا ہوں۔''اس نے فٹ پاتھ پر کھڑی ایک لاری کی طرف اشارہ کیا۔

''گڈ'' رہتے کہاں ہو؟''

''یہیں خاص بازار میں چلئے آپ کو اپنی کھولی دکھاؤں۔''

میرے پاس موقعہ تھا۔تیار ہوگیا۔اس نے لاری اپنے ساتھی کے سپرد کی اور مجھے لئے ہوئے مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا ایک دومنزلہ مکان کے پاس پہنچ کر بولا۔''اسی میں دوسرے مالے پر میرا کمرہ ہے آیئے''

ہم دونوں اوپر گئے۔ایک کمرے کے سامنے پہونچ کر وہ رک گیا اور دروازہ پر دستک دی۔

''اور کون رہتا ہے تمہارے ساتھ'' میں نے پوچھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا دروازہ کھل گیا۔سامنے نہایت خوبصورت ۱۷/۱۸ سال کی ایک لڑکی کھڑی تھی۔شباب کی تازگی اور بالیدگی اس کے روئے گل گوں پر مچل رہی تھی۔اس نے سفید ساری اور پیلے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔اس کا رنگ شہابی اور مکھڑا کتابی تھا۔سنہرے بال شانے پر بکھرے تھے وہ ہرنی جیسی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''یہ تمہاری بیوی ہے۔میں نے رشید سے پوچھا۔

''نہ نہ نہ یہ میری بہن ہے۔''وہ جلدی سے بول پڑا۔

اور میں شرمندہ ہو گیا۔ لڑکی مسکرائی۔ بڑی دلفریب مسکراہٹ۔ موتی جیسے چمکدار دانت، پتلے پتلے نازک ہونٹوں سے جھانکنے لگے۔ رشید نے اس سے میرا تعارف کرانا چاہا۔

''آپ ہیں جناب.....''

عظیم عثمانی ''میں نے اس کی مشکل دور کر دی۔

''تسلیم'' لڑکی نے سر تھوڑا خم کیا اور ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

''تشریف لائیے''

ہم اندر داخل ہوئے چھوٹا سا کمرہ تھا۔ بہت معمولی سامان تھے اس میں۔ ایک طرف فرش پر بستر لگا تھا وہیں دیوار کے قریب لکڑی کی ایک میز اور ٹن کی کرسی رکھی تھی۔ دوسری طرف اسٹو اور پکانے کھانے کے سامان تھے۔ رشید نے مجھے کرسی پیش کی اور خود فرش پر لگے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کی بہن فوراً گلاس میں پانی لائی۔ پانی پینے کے بعد میں رشید سے مخاطب ہوا۔

''تم یہاں کب آئے؟''

اس نے اچٹتی ہوئی نظر اپنی بہن پر ڈالی جو اسٹو کے پاس بیٹھ کر اپنے ناخن کریدنے لگی تھی۔ پھر بولا۔ ''ہمیں ایک حادثہ یہاں لے آیا۔ جس دن آپ سے ملاقات ہوئی تھی اسی دن شام کو تین نمبر والی بس میں مجھے ایک کمزور دبلا پتلا ادھیڑ عمر کا آدمی مل گیا۔ کپڑوں سے وہ کسی پرائیویٹ آفس کا چپراسی لگ رہا تھا۔ مہینہ کی پہلی تاریخ تھی تنخواہ کے روپے اس کی جیب میں تھے۔ یہ مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اپنی زد میں لے لیا۔ اور جب وہ دوسرے بس اسٹاپ پر اترا تو اس کا پرس میرے پاس تھا۔

اتنا کہہ کر رشید چپ ہو گیا۔ لڑکی گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر اس کی آواز آئی۔

''کاش کہ مجھ سے یہ حرکت نہ ہوئی ہوتی تو آج وہ زندہ ہوتا۔''

''کیا وہ مر گیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں! مجھے دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ اپنے بس اسٹاپ پر اترا اور جب اسے پتہ چلا کہ

اس کی جیب کٹ گئی ہے تو وہ وہیں گرا اور مر گیا''۔

''اوہ'' میرے منہ سے نکلا۔ پھر؟

''اس کی موت کی خبر سن کر میرے دل کو شدید دھچکا لگا۔ میں نے پولیس اسٹیشن سے اس کے گھر کا پتہ لیا اور وہاں پہونچ گیا۔ کھپریل کا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا۔ اس کے شکستہ در و دیوار سے مفلسی ٹپک رہی تھی۔ ماحول پر بے بسی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں اندر داخل ہوا۔ وہاں کچھ عورتوں کے گھیرے میں ایک لڑکی نیم بے ہوشی کے عالم میں بستر پر پڑی تھی۔ اُسی چپراسی کی لڑکی۔ باپ کے ساتھ اس کا سب کچھ چلا گیا تھا۔ اِس دنیا میں وہ اکیلی بے یار و مددگار رہ گئی تھی۔ میں تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا پھر جانے کیا ہوا میری گنہ گار آنکھوں سے جھر جھر آنسو گرنے لگے۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ نیم بے ہوش لڑکی اٹھ بیٹھی اور پوچھا میں کون ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں وہی گرہ کٹ ہوں جس نے اس کے باپ کی جیب کاٹی تھی''۔

''میں نے چاہا کہ وہ دوڑ کر آئے میرے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر زور زور سے کھینچے چیخے۔ چلائے اور دانت کاٹ کاٹ کر مجھے لہولہان کر دے۔ مگر سر۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ اُس نے نہ مجھے گالی دی نہ مارا نہ میرے منہ پر تھوکا نہ چیخی نہ چلائی۔ خاموشی سے اٹھی میرے پاس آئی اور میرے کندھے پر اپنا سر رکھ کر رو پڑی۔''

اتنا کہہ کر رشید خاموش ہو گیا۔ مگر اس کی خاموشی مجھے سخت گراں گزری میں پوری کہانی سننے کے لئے بے چین تھا۔ جلدی سے پوچھا۔ ''پھر؟''

''پھر مجھے اُس شہر سے وحشت ہو گئی اور اس دھندے سے نفرت ہو گئی۔ دونوں چھوڑ دیا۔ اُس یتیم کو لے کر یہاں چلا آیا''۔ اس نے بات یکا یک ختم کر دی۔

میں نے چونک کر اسٹو کے پاس بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ کتنا بڑا کام کیا تھا اِس جیب کترے نے۔ اس کے کردار کی بے مثال نجابت نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے اس مینارہ انسانیت سے آنکھیں ملانے میں شرم آنے لگی اور میں اپنے کو ایسا اونٹ سمجھنے لگا جو پہاڑ کے نیچے آ کر بلبلانا بھول گیا ہو۔

اسی وقت ایک لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ رشید ہی کی عمر کا رہا ہوگا۔ اچھی شکل وصورت کا مالک تھا۔ خوش پوش، صحت منداور دراز قد تھا۔ اسے دیکھتے ہی رشید کھڑا ہو گیا۔

''آؤ۔ ان سے ملو۔ عظیم صاحب۔ سرکاری افسر ہیں۔''

لڑکا مسکرا کر میری طرف بڑھا۔ میں کرسی سے اٹھ گیا۔

''اور یہ سریندر ہے۔ میرا دوست۔ اے، جی آفس میں آڈیٹر ہے۔'' رشید نے مجھے بتایا۔ ہم گرم جوشی سے ہاتھ ملانے لگے۔ تو رشید بولا ''سر آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے اپنی منھ بولی بہن کی شادی اس سے کر دی ہے۔

ارے یہ کیا ہوا۔ میرا تعصبی ذہن چیخا اتنی پیاری لڑکی کو رشید نے کیوں؟ آخر کیوں؟ کیا اسے اپنوں میں کوئی نہ مل سکا تھا۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ خود ہی یا پھر میں۔ مگر میں کہاں تھا۔ پھر بھی کمبخت آخر کار جیب کترے کا جیب کترا ہی نکلا۔

میں نے سریندر کا ہاتھ نفرت سے جھٹک دیا۔

رشید میری بوکھلاہٹ بھانپ گیا۔ اس کے لبوں پر وہی مخصوص تیز چبھتی ہوئی مسکراہٹ رینگ گئی۔ بولا۔

''سر۔ اس لڑکی کا نام شیلا ہے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے رشید نے میرے منھ پر تھوک دیا ہو۔

میں گھٹ کر مزید چھوٹا ہو گیا۔

(مارچ ۱۹۷۸)

سچ کیا ہے

قدرت النساء کو سال میں دو بار میکہ کی یاد بہت ستاتی تھی۔ ایک تو سردیوں میں جب گنے کی پلائی ہوتی اور گاؤں کے کولہار میں پکتے ہوئے گُڑ کی خوشبو سے رات دن مہکنے لگتے اور مٹر پھلی دور دور تک کھیتوں میں جھولنے لگتی اور ان کے سرخ سفید اور کاسنی رنگ کے پھولوں سے زمین کی چھاتی ڈھک جاتی اور چنے کا ساگ اور جوار کے گچھے میٹھے اور لذیذ لگنے لگتے۔ کڑکڑاتی سردیوں کے دن ہوتے۔ بڑے سے صحن میں دھوپ جلد اتر آتی اور شام دیر تک بچھی رہتی۔ اسی دھوپ میں پلنگ ڈالے قدرت النساء دن کے بیشتر اوقات بیٹھی رہتیں۔ جانوروں کے لئے مٹر کے پودے آتے تو وہ ان سے مٹر پھلی توڑتیں۔ اس کام میں انہیں بڑا مزہ آتا۔ چنے کے پودوں کو لہلہاتی آگ میں بھون کر ہولا تیار کرتیں اور اپنے ہی کھیت کی ہری مرچ اور دھنیے کی پتی سے چٹنی بناتیں اور مزہ لے لے کر کھاتیں۔ مرچ زیادہ لگتی تو رات کو کولہار سے آیا ہوا گُڑ تھوڑا سا کھا لیتیں۔ چٹنی کی تیزی کو تازہ گُڑ سے مٹانے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ احاطہ میں پپیتے، شریفے اور امرود کے پیڑ بھی تھے۔ بانس کی ایک لگی ہمیشہ وہیں موجود رہتی اس کی مدد سے من چاہے پھل توڑتیں اور دل چاہے اتنا کھاتیں۔ ان کے تینوں بچے، جن کی عمریں بارہ، نو، اور چھ سال کی تھیں۔ ان کی تمام حرکتوں، کاموں اور مہموں میں شریک رہتے۔ وہ سب شہر کے پروردہ تھے اس لئے گاؤں میں انہیں بڑا مزہ آتا۔ وہ دن بھر ڈگر ڈگر

کھیت کھلیان گھوما کرتے۔ گرگٹ مارتے۔ کھیت میں لہلہاتے سرسوں کے پھولوں کو ڈنڈے سے سڑا سڑ چھانٹ ڈالتے اور کسی بھی کھیت میں گھس کر گنا توڑ لیتے، مٹر پھلی نوچ لیتے اور تالاب میں بچھی سنگھاڑے کی چادر کو الٹ پلٹ ڈالتے۔ لیکن ان کے مالکان ان کی حرکتوں کو نظر انداز کر دیتے۔ بچے تھے۔ اپنی قدرت النساء کے بچے۔ کیا ہوا۔ اگر انہوں نے تھوڑی بہت اتھل پتھل کر دی یہ سوچ کر وہ رہ جاتے ننھیال میں یوں بھی بچے ددھیال سے زیادہ لاڈ و پیار پاتے ہیں۔ کوئی قدرت النساء سے شکایت نہ کرتا اور اگر کوئی دبے دبے لفظوں میں کچھ کہتا بھی تو قدرت النساء دھمک کر بول اٹھتیں۔ بھیا کیا تمہاری فصلوں میں میرا حق نہیں۔ میں تمہاری بہن نہیں ہوں۔ یہ بچے تمہارے بھانجے نہیں۔ شکایت کرنے والا شرمندہ ہو جاتا۔ نہیں قدرت النساء تمہارا اور تمہارے بچوں کا حق تو پورے گاؤں پر ہے۔ میں نے تو بس یوں ہی کہہ دیا تھا۔ مزید شرمندگی مٹانے کے لئے وہ کہتا آج رات میں تمہارے لئے گڑ بھیجوں گا۔ بڑے اہتمام سے بن رہا ہے۔ سونٹھ، ناریل اور دودھ ڈال کر۔ بچپن میں تمہیں پسند تھا نہ؟

گرمیاں آتیں تو قدرت النساء کے دل میں پھر لہک اٹھنے لگتی، اور گاؤں کی یاد تڑپانے لگتی۔ مکان کے پچھواڑے مالدہ آم کا باغ تھا۔ یہ بڑے بڑے آم آتے تھے۔ ان کی لذت عجیب ہوتی تھی۔ کچھ لنگڑا کچھ الفانسو کچھ کیسر۔ آدھ آدھ کلو کے آم ہوتے تھے۔ پورا گاؤں سیر ہو کر کھاتا تھا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اِدھر آموں کا موسم آتا اُدھر قدرت النساء کو ہوکا لگتا اور وہ دندناتی ہوئی آ پہنچتیں۔ گاؤں میں جامن کھنّی اور املی کے بھی پیڑ تھے۔ جو یوں تو کسی نہ کسی کی ملکیت تھے لیکن ان کے پھلوں پر حق پورے گاؤں کا تھا اور ہر کوئی آزادی کے ساتھ ان کے پھل توڑ کر کھا سکتا تھا۔ قدرت النساء یوں تو سخت پردہ کرتی تھیں لیکن گاؤں آتیں تو برقعہ کس کونے میں پڑا ہوتا انہیں خبر بھی نہ ہوتی۔ دن دہاڑے نکل پڑتیں اور جس گھر میں چاہتیں گھس جاتیں۔ گاؤں کے لوگوں میں کوئی ان کا چچا تھا کوئی بھائی اور کوئی بڑے ابا۔ کسی سے پردہ کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ ان چچاؤں بھائیوں اور بڑے اباؤں نے تو انہیں اس وقت سے دیکھ رکھا تھا جب انکی ناک سُڑ سُڑ بہتی تھی۔ اب وہ بڑی ہو گئیں تھیں، شادی ہو گئی تھی، بال بچے ہو گئے تھے تو کیا ہوا۔ آخر کو قدرت النساء ہی تھیں اپنے مولوی

صاحب کی بٹیا۔

مولوی ضمیر الحسن جب تک زندہ رہے گاؤں میں کیا قرب وجوار میں بھی ان کی شرافت نجابت حسن اخلاق اور رواداری کی مثالیں دی جاتی رہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں زمینداری کی آن بان دیکھی تھی۔ اپنی عمر کا زیادہ حصہ انہوں نے سفید کھدر کے بے داغ کرتے پائجامے اور ٹوپی میں کھیت کی مینڈوں پر کھڑے ہو کر مزدوروں سے کام لینے میں گذارا تھا اور دور دور تک لہلہاتی فصلوں سے آنکھوں کی روشنی دل کا سرور اور زندگی کا سکھ حاصل کیا تھا۔ بیوی کے انتقال کے بعد دونوں بچوں کو انہوں نے بڑے لاڈ و پیار سے پالا تھا۔ قدرت النساء کی شادی انہوں نے شہر کے ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں کی تھی۔ بیٹا قمر الحسن گھر ہی پر رہا اور کھیتوں اور زمینوں کے انتظام میں ان کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ مولوی ضمیر الحسن کا انتقال ہوا تو گھر کا نظام قمر الحسن کی وراثت میں آیا اور وہ خاندانی روایت کا ترکہ سنبھالے ہوئے زندگی کی گاڑی بحسن خوبی چلانے لگا۔ باپ کی زندگی میں قدرت النساء تو جیسے اس گھر کی مالک ہی تھیں لیکن ان کے انتقال کے بعد بھی ان کا آؤ بھاؤ اسی طرح قائم رہا قمر الحسن اپنی بہن پر جان چھڑکتا تھا۔ سردیوں گرمیوں میں جب ان کا آنا ہوتا تو وہ ان کے آگے پیچھے گھومتا رہتا ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتا۔ ان کی ہر فرمائش پوری کرتا۔ ان کے آنے پر گھر میں رکھی اناج کی کوٹھیاں کھیتوں میں کھڑی فصلیں، احاطہ کے پیڑوں میں لگے پھل، باغوں کے آم گائے بھینسوں کے دودھ دہی گھی، مرغیوں کے چوزے سب کچھ ان کے تصرّف میں آجاتا۔ قمر الحسن کی بیوی بھی قدرت النساء کو کھلی چھوٹ دے دیتی۔ ''آپ کا گھر ہے جس طرح چاہیں رہیں'' وہ انہیں جتاتی رہتی۔ قدرت النساء پورے وقت گھر کی ہر چیز کو اپنے قبضہ میں اور ہر فرد کو اپنے تابع رکھتیں اور جب وہ واپس شہر جانے لگتیں تو کپڑے، لتے، اناج، پھل، گھی، اچار اور طرح طرح کی دوسری چیزیں ساتھ لے جاتیں۔ اگلے موسم میں پھر وہ سب کچھ ہوتا اور یہ سلسلہ کم از کم انکی حیات تک تو قائم ہی رہتا اگر ان کے شوہر بیٹھے بٹھائے حقوق کو درمیان میں نہ لاتے۔

قدرت النساء کے شوہر کرامت علی شریعت کے بڑے پابند تھے۔ کم از کم ان کا اپنا خیال تو یہی تھا۔ اس لئے ایک دن انہیں خیال آیا کہ مولوی ضمیر الحسن کی جائداد میں قدرت النساء کا بھی حق

ہے اور یہ حق ابھی تک نہیں ملا ہے۔ حق تو اسی وقت مل جانا چاہئے تھا جب مولوی ضمیر الحسن کا انتقال ہوا تھا لیکن کئی سال گزرنے کے بعد بھی ان کی جائداد کا واحد وارث اُن کا بیٹا قمر الحسن بنا بیٹھا تھا اور یہ بات ان کے مطابق شرعی احکام کے خلاف تھی۔ کرامت علی کو کوئی مالی دشواری نہ تھی وہ سرکاری ملازم تھے وراثت میں بھی ان کو بہت کچھ ملا تھا۔ مکان بھی جائداد بھی۔ اللہ نے انہیں اتنا دیا تھا کہ کہیں تاک جھانک کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن معاملہ چوں کی حق کا تھا اس لئے انہوں نے ایک دن قدرت النساء کو دنیا سے لے کر آخرت تک کی باتیں سمجھائیں۔ دنیا کی بات اپنے لئے کہ اگر انہیں حصہ مل جاتا ہے تو وہ اس روپئے سے اپنے مکان میں تیسری منزل چڑھا سکتے ہیں یا کوئی بچت سرٹیفکٹ بچوں کے نام لے سکتے ہیں ان کی تعلیم اور شادی بیاہ کے لئے کچھ رقم فکس ڈپازٹ میں رکھ سکتے ہیں اور آخرت کی باتیں قمر الحسن کے لئے کہ اگر وہ پوری جائداد کو اپنے مصرف میں رکھتا ہے تو اللہ میاں کے وہاں اسے حساب دینا ہوگا اور وہ حساب بڑا سخت ہوگا اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ وہ بہن کا حق دے دے۔

قدرت النساء کو اپنے شوہر کی بات سن کر جھٹکا لگا۔ انہوں نے اس خیال کی سخت مخالفت کی۔

''مجھے حق وق نہیں چاہئے۔''

کرامت علی نے ناگواری سے کہا..... ''کیا تم شرع کی خلاف ورزی کرنا چاہتی ہو۔''؟

''شرع کی خلاف ورزی؟''.... قدرت النساء شوہر کے چہرے پر اپنی نگاہیں گاڑتی ہوئی بولیں ..... ''حق فرض نہیں ہوا کرتا کہ نہ لینے پر کوئی گنہ گار ہو اس کے علاوہ کچھ قوانین ایسے بھی ہیں جو کسی خاص موقع یا حالت میں عمل میں لانے کے لئے بنائے گئے ہیں انہیں عام کر دینے سے انسانی رشتوں میں اتھل پتھل ہو سکتی ہے اور سماج میں انتشار اور آپسی تعلقات میں دراڑ پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی سمجھ لو کہ اسلامی قانون کے تحت ایک مرد ایک ساتھ چار بیویاں رکھ سکتا ہے اب اگر ہر شخص اس حق پر عمل کرنے لگے تو کیسی افراتفری پیدا ہو جائیگی خود ہی سوچئے۔ یہی معاملہ دختری کے ساتھ بھی ہے عام حالات میں اس حق کا استعمال نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس سے بھائی بہن کے رشتوں کا توازن بگڑ سکتا ہے اور اس رشتے کے ساتھ جو حرمت اور محبت وابستہ ہے وہ بھی مجروح ہو سکتی ہے۔''

قدرت النساء کی بات سن کر کرامت علی کی پیشانی پر بل پڑ گئے، بڑی کرختگی سے بولے ..... ''لیکن تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اس رقم سے ہمارے بہت سارے کام ہو جائیں گے اچھی خاصی رقم مل جائیگی۔ تمہارا حصہ دے دینے پر بھی قمر الحسن کے پاس اتنا بچے گا کہ وہ بہت اچھی زندگی گزار سکے گا اچھی خاصی جائداد ہے۔''

قدرت النساء غصہ میں کھڑی ہو گئیں۔

''تو کیا تمہارے پاس جائداد نہیں ہے۔ آخر کیوں میرے میکہ کی جائداد پر دانت گاڑے بیٹھے ہو تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟''

کرامت علی نے اس وقت خاموشی اختیار کر لینے میں ہی عافیت سمجھی لیکن انہوں نے ہتھیار نہ ڈالا۔ موقع بے موقع قدرت النساء کو اونچ نیچ سمجھاتے رہے۔ آخر کار تھک ہار کر بادل نا خواستہ ایک دن قدرت انساء نے بھائی کو خط لکھ ہی دیا کہ باپ کی ملکیت میں ان کا جو حصہ نکلتا ہے وہ انہیں بھیج دے۔

یہ بات الگ ہے کہ جس قلم سے انہوں نے یہ خط لکھا تھا اسے توڑ ڈالا تھا اس جج کی طرح جو کسی مجرم کو موت کی سزا دینے کے بعد اپنی قلم توڑ دیتا ہے۔ کچھ دنوں بعد انہیں ایک ڈرافٹ ملا۔ قمر الحسن نے ان کا حصہ بھیج دیا تھا۔ انہوں نے ڈرافٹ دیکھا تو ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہوں نے سوچا تھا خط پا کر قمر الحسن خفا ہو جائے گا سخت سست لکھے گا یہاں آ کر جھگڑا کرے گا وہ حصہ دینے سے انکار کر دیگا لیکن اس نے تو بلا چوں چرا پوری رقم کا ڈرافٹ بھیج دیا تھا ساتھ میں ایک مختصر خط بھی تھا۔ ''آپ کی حسب خواہش ابا مرحوم کی جائداد میں آپ کا جتنا حق نکلتا ہے اسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں''۔

قدرت النساء کبھی اس مختصر خط کو دیکھتیں کبھی اس ڈرافٹ کو جو گاؤں سے رشتہ توڑنے کا ایک پروانہ تھا..... اب وہ کس منہ سے گاؤں جائیں گی..... انہوں نے سوچا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

سردیاں آئیں تو حسب معمول میکہ کی یاد قدرت النساء کو آنے لگی۔ انہوں نے

سوچا..... مٹر پھلی نرم و نازک ہرے ہرے پودوں میں جھولنے لگی ہوگی، احاطے کے پیڑوں پر شریفے امرود اور پپیتے پکنے لگے ہوں گے اور گنے کے کولھوؤں کی چرمر رشروع ہوگئی ہوگی۔ وہ اپنی آمد کی اطلاع قمرالحسن کو کبھی نہ دیتی تھیں۔ ''اپنے گھر جانے کی اطلاع کیسی'' وہ اپنے شوہر سے فخریہ کہتیں اور بچوں کو لے کر چل پڑتیں۔ گاؤں کے ریلوے اسٹیشن سے لیکر گھر کی چوکھٹ تک بکھرے ذرے ذرے پر ان کے پاؤں کا نقش موجود تھا۔ راستہ کی دھول ان کے قدموں کو بوسہ دینے کے لئے گویا بے تاب رہتی تھی۔ ٹرین سے اترتیں تو کوئی نہ کوئی شناسا ''ارے باجی'' ''ارے بٹیا'' ''ارے قدرت النساء'' کہہ کر لپک پڑتا۔ اور ان کے سامان اور بچوں کو اپنے سروں کندھوں اور ہاتھوں میں ٹانگ لیتا۔ اور وہ اپنائیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر جانے پہچانے راستے پر تیز تیز چلنے لگتیں۔

''یہ گنے کا کھیت عبدل چچا کا ہے نہ یہ مٹر کا کھیت تو رحمان بھیا کا ہے نہ۔ یہ چنے کا کھیت تو پردھان کا ہے نہ اور یہ..... یہ..... یہ تو ہمارا ہے نہ چچا؟''

''ہاں بیٹا تمہارا ہے۔''

''میں جانتی ہوں خوب پہچانتی ہوں۔ ہمارے بچپن میں اس میں صرف جوار ہوتی تھی۔ اب دیکھو تو سہی کیسی مٹر لہلہا رہی ہے۔''

''ہاں بیٹا کھیتی کا رنگ ہی اب کچھ اور ہے''۔

''اور گاؤں کا کیا حال ہے چچا''

اور باتیں کرتے کرتے گھر کی چوکھٹ آجاتی ایک ہی کلومیٹر کا تو فاصلہ تھا منٹوں میں ختم ہو جاتا۔

جنوری کا مہینہ ختم ہونے لگا تھا لیکن قدرت النساء میں گاؤں جانے کے کوئی آثار پیدا نہیں ہو رہے تھے۔ کرامت علی کو کھد بد ہوئی۔ آخر انہیں بھی تو ان چیزوں کا انتظار رہتا تھا جو قدرت النساء اپنے میکہ سے لاتی تھیں۔ ایسی تازہ اور لذیذ چیزیں شہروں میں کس کو نصیب ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک دن انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

''بھئی تم لوگ گاؤں کب جا رہے ہو۔''

ترتیب

- سید ظفر ہاشمی اور ان کی ادبی خانقاہ ۔ رشید افروز 9

افسانے

- غٹرغوں ۲۵
- تلافی ۲۹
- سچ کیا ہے ۳۶
- کارگل کا تحفہ ۴۵
- مزدورنی ۵۳
- گاؤں کہاں گیا ۶۴
- اڈیا پرشاد ۸۱
- اصحاب فیل ۸۷
- ستی ۹۴
- جوٹھن ۹۹
- بابلا ۱۰۳
- نئے سورج کا نوحہ ۱۱۱

قدرت النساء نے اپنے شوہر کو اس طرح دیکھا جیسے وہ ان کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ برا مانتے ہوئے بولیں

''اب کون سا منھ لے کر وہاں جاؤں۔ آپ نے تو سب ختم کر دیا۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟''۔ کرامت علی نے اسطرح پوچھا جیسے انہیں کچھ پتا ہی نہ ہو، اس پر قدرت النساء بولیں۔

''اب وہاں میرے لئے کیا رکھا ہے۔ مجھے کون پوچھے گا۔ میں تو اسی حق کے بل بوتے پر وہاں جاتی تھی۔ میرے وہاں جانے پر جس طرح کا برتاؤ وہ لوگ کرتے تھے، جس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، جس طرح میں وہاں کے چپے چپے پر اپنی ملکیت محسوس کرتی تھی اب وہ ساری باتیں ختم ہو گئی ہیں۔ اپنا حق لے کر میں نے ان مقدس جذبوں کو مار ڈالا ہے اور میں اپنی ہی نگاہوں میں مجرم ہو گئی ہوں۔''

کرامت علی نے قدرت النساء کو سمجھانے کی کوشش کی۔''ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم نے اپنا حق لیا ہے۔ کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ یہ تو دستور ہے جس میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا بھی شامل ہے۔''

قدرت النساء کا چہرہ سخت ہو گیا۔ بڑی تلخی سے بولیں۔

''وہ تحفے جو ملتے تھے وہ کیا تھے؟ پٹاریوں اور تھیلیوں میں بھر بھر کر جو چیزیں میں وہاں سے لاتی تھی وہ کیا تھیں؟ خیرات؟ ارے وہی تو آپ کا وہ شرعی حق تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ حق قسطوں میں ادا ہوتا تھا اور اس ادائیگی میں بھائی بہن کا پیار بندھا ہوا تھا۔ وہ حق ایک رواں دواں چشمے کی طرح مجھے مسلسل سیراب کر رہا تھا اور اسی طرح ہمیشہ کرتا رہتا۔ اس کی کوئی حد نہ تھی اور اس کا کچھ حساب نہ تھا۔ اسے تولنے کی کوئی ترازو نہ تھی۔ محض خلوص محبت اور اعتماد کی ایک خوبصورت ڈور تھی جو ہمیں باندھے ہوئی تھی۔ اس طرح غیر شعوری طور پر میرا حق ادا ہو رہا تھا اور شعوری طور پر وہ ڈور بھی قائم تھی۔ لیکن آپ نے اس بہتے ہوئے چشمے کے پانی کو ایک گڈھے میں اکٹھا کر لیا حق تو ادا ہو گیا لیکن افسوس کہ وہ رواں دواں چشمہ خشک ہو گیا اور بھائی بہن کے رشتے کی ڈور بھی ٹوٹ گئی۔ اب میں وہاں کیسے جاؤں۔''

قدرت النساء بلک بلک کر رونے لگیں۔ جب وہ جی بھر کر رو چکیں تو اٹھیں منہ دھویا اور بھرے بھرے دل سے گھر کے کام کاج میں لگ گئیں۔

سردیاں اختتام پر تھیں۔ گاؤں جانے کی ہڑک صرف قدرت النساء کو ہی نہ تھی ان کے تینوں بچے بھی عادی ہو چکے تھے۔ انہیں بھی گاؤں یاد آنے لگا اور وہ اپنی ماں سے بار بار پوچھنے لگے کہ ہم گاؤں کب چلیں گے۔ ان کے پوچھنے پر قدرت النساء نے ہر بار انہیں رکھائی سے جواب دیا کہ اب وہ گاؤں کبھی نہ جا سکیں گے۔ کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ جاتیں لیکن ان کے اندر زبردست ٹوٹ پھوٹ ہونے لگتی اور انہیں ایسا لگتا جیسے دل اچھل کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ رات کو سوتیں تو کولھار میں پکتے گڑ کی خوشبو ان کے نتھنوں میں گھسنے لگتی اور پھلیوں سے لدی مٹر کی ٹہنیاں ان کے جسم سے لپٹنے لگتیں۔ پکے ہوئے امرود اور پپیتے کی خوشبو ان کے حواس پر چھانے لگتی۔ اور وہ بے چین ہو جاتیں۔ انہیں وہ پگڈنڈی بھی یاد آنے لگتی جس پر چل کر وہ گاؤں میں داخل ہوتیں اور جس کے دونوں طرف مٹر کے کھیت لہلہاتے ہوتے۔ گنے کے وہ کھیت یاد آتے جن سے لومڑیاں نکل کر دفعتاً راستے میں آ جاتیں اور وہ چیخ مار کر اچھل پڑتیں۔ یہاں تک کہ وہ کتے بھی یاد آتے جو انہیں دیکھ کر پہلے تو بھونکتے پھر ہوا میں اپنے پن کی خوشبو پا کر دُم ہلانے لگتے۔ وہ سارے چھوٹے بڑے لوگ یاد آتے جو ریلوے اسٹیشن سے لے کر گھر کی دہلیز تک ملتے اور دعا اور سلام کے کلمات سے انہیں سرشار کر جاتے یہ سب رات کی خاموشی ہی میں نہیں دن کے ہنگاموں بھی ان کے جگر کو لخت لخت کرتے رہتے۔

اس رات وہ دیر تک جاگتی رہیں اور آنکھوں کی نمی دوپٹے سے خشک کرتی رہیں۔ صبح اٹھیں تو آنکھیں سرخ اور چہرہ پھولا ہوا تھا۔ جیسے تیسے کر کے ناشتہ تیار کیا اور چائے پی کر فارغ ہوئی تھیں کہ دروازہ کی گھنٹی بجی۔ بچے اندر کمرہ میں تھے اور کرامت علی آفس جا چکے تھے۔ بڑی بے دلی سے اٹھیں اور دروازہ کی طرف بڑھیں۔ اسے کھولا تو بھک سے اڑ گئیں۔

باہر ان کا بھائی قمرالحسن کھڑا تھا۔

''تم؟'' قدرت النساء بوکھلا گئیں۔

''یہ کیا مذاق ہے۔ موسم ختم ہونے کو آرہا ہے اور آپ ہیں کہ ابھی یہیں ڈٹی ہیں۔ گھر کیوں

نہیں آئیں۔ کہاں ہیں سب چھٹکے''

آواز سن کر تینوں بچے بھربھراتے ہوئے آئے اور قمرالحسن سے لپٹ گئے۔

''تم لوگ ابھی تک گاؤں کیوں نہیں آئے۔ میں تم لوگوں سے بہت خفا ہوں''۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ اس پر منجھلی لڑکی نے وجہ بتائی۔

''ماموں بتائیں وہ یوں کہ امی کہتی ہیں کہ اب ہم گاؤں نہیں جاسکتے۔''

''کیوں کیوں؟''

''ہم بتائیں گے بڑا لڑکا جلدی سے بولا۔'' کیوں کہ انھوں نے گاؤں کی جائیداد میں اپنا حصہ لے لیا ہے نہ اس لئے وہ کہتی ہیں کہ اب وہاں ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہ ہوگا''

قمرالحسن نے مسکرا کر اپنی بہن کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ نگاہیں چار ہوئیں تو بند ٹوٹ گیا اور وہ زور زور سے رونے لگیں۔ قمرالحسن نے انہیں انکے حال پر چھوڑ دیا اور بچوں سے مخاطب ہوا۔

''تم لوگ تیاری کرو میں تم سب کو لینے آیا ہوں۔ شام کی ٹرین سے ہم واپس گاؤں جارہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے وہاں سفید بلّی نے بہت سارے بچے دئے ہیں اور آم کے درختوں میں طوطوں نے گھونسلے بنائے ہیں ان میں بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

اس نے چھوٹی بچی کو گود میں اٹھالیا اور اسے پیار کرتے ہوئے بولا۔''اور بتائیں پتہ نہیں کہاں سے دو مور احاطہ میں آگئے ہیں۔ وہ دونوں شام کے وقت گھر کی منڈیر پر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو آنگن میں بھی اتر آتے ہیں اور ان میں سے ایک پر کھول کر ناچنے بھی لگتا ہے''۔

''سچ ماموں'' تینوں بچوں نے خوشی سے بے قابو ہو کر قمرالحسن کو پھر دبوچ لیا۔

''ایک دم سچ''

وہ صوفہ پر آرام سے بیٹھ گیا اور جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔

(نومبر ۱۹۹۹)

کارِ گل کا تحفہ

کارِ گل کی جنگ زوروں پر تھی۔ توپیں یوں تو سرحد پر چل رہی تھیں لیکن ان کی دھمک ملک کے گوشے گوشے میں محسوس کی جا رہی تھی۔ مارشل نغموں سے کوچے و بازار ہی نہیں کھیت کھلیان بھی گونج رہے تھے اور ہر شہری بلا امتیاز مذہب وملت فوجیوں کی دامے درمے سخنے مدد کر رہا تھا۔ جذبۂ وطنیت سے ہر فرد سرشار تھا۔ مقابل کی طاقت ٹوٹ رہی تھی لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ہو رہا تھا کہ صوبائی دارالحکومتوں کے ہوائی اڈوں پر شہید ہونے والے فوجیوں کی پھولوں اور قومی جھنڈوں سے ڈھکی ہوئی ارتھیاں وقفے وقفے سے اتر رہی تھیں جنہیں دیکھ کر نوجوانوں کے دلوں میں شوق شہادت امڈ رہا تھا۔

احمد آباد ہوائی اڈے پر ڈفنس ایر کرافٹ سے بریگیڈئر کمار کی پھولوں اور قومی جھنڈوں سے ڈھکی ہوئی ارتھی اترنے لگی تو مکیش مہتا بستر میں اپنی بیوی کی گرفت سے ایک جھٹکے کے ساتھ الگ ہو گیا اور اس منظر کو ٹی وی اسکرین پر بڑے انہماک اور عقیدت سے دیکھنے لگا۔ اس پر اس کی بیوی شوبھا نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''دیکھ شوبھا۔ دیکھ بریگیڈیئر کمار کی ارتھی آرہی ہے۔ ہاؤ لکی''

شوہر کا اسطرح اس سے الگ ہوجانا شوبھا کو اچھا نہ لگا۔ وہ بُرا مان گئی اس نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کردیا۔

''ہروقت کا رگل۔ اب ایسی حالت میں ارتھی دیکھنے کی کیا ضرورت تھی''

''نہیں شوبھا بستر کی اس حالت سے ہم بارہا گزرے ہیں لیکن شہیدوں کی ارتھی کا ایرکرافٹ سے اتارا جانا اور کمانڈروں کے کندھوں پر اٹھایا جانا اور اس کے احترام میں بندوقوں کی سلامی دینا یہ منظر تم نے کبھی پہلے دیکھا ہے؟ پہلی بار ہمیں ملک کے لئے مرنے والوں کی عظمت کا اندازہ ہورہا ہے۔ پہلی بار ہم ان کی بہادری کا قصہ پڑھ رہے ہیں اور پہلی بار ہی ان کی قربانی کو اس طرح سراہا جارہا ہے۔ ورنہ اس سے قبل کون کب اور کہاں مرتا تھا گھر والوں کے علاوہ کسی کو خبر نہ ہوتی تھی اور گھر والوں کو بھی نہ اس کا جنازہ ملتا تھا نہ راکھ کا پتا چلتا تھا۔ بس جانے والا چلا جاتا تھا۔ نہ دیار یار کی شام اداس ہوتی تھی نہ دیدار کے لئے قطاریں لگتی تھیں نہ ہاروں کا تحفہ دیا جاتا تھا۔ نہ عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے تھے نہ کوئی قبر بنتی تھی نہ پتلے کھڑے کئے جاتے تھے۔ شہیدوں کو سرحدوں کی زمینیں نگل جاتی تھیں یا انہیں وہیں جلادیا جاتا تھا اور ان کی راکھ خود اِدھر اُدھر بکھر جاتی تھی اور اب دیکھو لگتا ہے پوری قوم اس شہید کی ارتھی اٹھائے ہوئے ہے۔ اب اسے اس کے گاؤں لے جایا جائے گا جہاں اس کی سادھی بنے گی۔ گاؤں کے بیچوں بیچ اس کا اسٹیچو کھڑا کیا جائے گا اور رہتی دنیا تک اس سادھی اور اس اسٹیچو پر لوگ پھولوں کی مالائیں چڑھاتے رہیں گے۔ ہاؤ لکی''

شوبھا اپنے شوہر سے سٹ کر بیٹھ گئی اور بڑی نرمی سے بولی۔ ''کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو ڈیر۔ مجھے تو اس منظر سے ہی وحشت ہوتی ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ارتھیوں کا اس طرح ایک کے بعد ایک لایا جانا اور ان کی کھلے عام تشہیر کرنا غلط ہے۔ کتنا بھیانک منظر ہوتا ہے۔ گاؤں کا گاؤں تھرتھر کانپنے لگتا ہے۔ جنگ کے انجام سے ہر شخص کو اتنی شدت سے احساس دلانا میرے خیال سے بزدلی کو تقویت دینا ہے۔ ارتھیوں کو دیکھکر بھلا کون اپنے بیٹوں، بھائیوں اور شوہروں کو

فوج میں جانے دے گا ہاؤ ڈسگسٹنگ (How disgusting)۔ پہلے لڑائی میں کوئی مرتا تھا تو دوسروں کو خبر تک نہ ہوتی تھی اور اب ہر موت کا عالمی سطح پر اعلان ہو رہا ہے اور ملک کے کونے کونے میں لوگ جنگ کے خونیں ہاتھوں کو صاف دیکھ رہے ہیں کتنا demoralising ہے یہ تماشا۔''

مکیش مہتا نے مایوسی سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ ''تم اس منظر کو تماشا کہتی ہو۔ افسوس صد افسوس شوبھا! تم میں جذبۂ حب الوطنی ہے ہی نہیں۔ تم دوسرے کمرے میں جا کر سو جاؤ میں گیارہ بجے کی نیوز دیکھ کر ہی سوؤں گا۔

''ضرور دیکھو، شاید اس وقت تک کوئی اور ارتھی آ جائے''۔ شوبھا غصّے میں اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسری صبح اخبار دیکھتے دیکھتے مکیش مہتا نے اعلان کیا کہ وہ محاذ جنگ پر جائے گا۔

''کیا کہا''۔ شوبھا کو شدید جھٹکا لگا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ جنگ میں شامل ہو جاؤں۔ آج کے اخبار میں ایک اعلان ہے دیکھو میں پڑھتا ہوں''۔

''تیس سال سے کم عمر کے لوگ جنہیں پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں اور وادیوں کی مہم جوئی کا کوئی تجربہ ہو اور وہ کارگل، بٹالک اور مشکوہ وغیرہ محاذوں پر اپنی خدمات انجام دینا چاہتے ہوں وہ اپنا نام پتہ معہ تفصیلات ڈفنس ہیلپ آرگنائزیشن (defence help organisation) کو دے دیں اور محاذ جنگ پر جانے کیلئے تیار ہو جائیں''۔

اعلان پڑھنے کے بعد مکیش مہتا نے شوبھا سے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے میں پہاڑوں کی مہم جوئی پر جا چکا ہوں، مجھے تجربہ ہے میں اپنا نام دے سکتا ہوں، میں محاذ جنگ کے لئے کوالی فائڈ (qualified) ہوں''۔

شوبھا زور زور سے رونے لگی۔ اس کی آواز سن کر مکیش کے والدین بھائی بہن سبھی وہاں آ گئے اور گھبرا کر شوبھا کے رونے کی وجہ پوچھنے لگے۔ اس پر مکیش نے انہیں بتایا کہ وہ جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہے اس لئے شوبھا رو رہی ہے۔

مکیش کی بات سن کر اس کے پتا نے اسے ڈانٹا

''تم ایسا نہیں کر سکتے''

''کیوں''؟

''وہاں لڑنے والے بہت ہیں۔تمہارے جانے یا نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا''

''اگر سب لوگ ایسا کرنے لگیں تو مادرِ وطن کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہوگا''۔

''کیوں نہیں ہوگا''۔مکیش کی بہن وملا بولی ۔''لاکھوں سپاہی جو ہیں انہیں اپنا فرض ادا کرنے کا موقع کبھی کبھی ہی ملتا ہے، ورنہ وہ لوگ بیٹھے ہی تو رہتے ہیں اور مفت کی تنخواہ لیتے رہتے ہیں۔جنگیں تو کبھی کبھی ہی ہوتی ہیں۔پھر انہیں لڑنے دیجئے آپ کیوں جائیں گے مرنے۔''

مکیش نے اپنی بہن کو دیکھا۔بولا۔''کیوں کہ مجھے شہید ہونے کا شوق ہے''۔

اس کی بات سن کر شوبھا پھٹ پڑی۔اس نے رونا بند کر دیا تھا۔

''شہید ہوں تمہارے دشمن''

اپنی بیوی کی جھلاہٹ دیکھ کر مکیش مسکرا اٹھا''وہ بھی شہید ہی ہوتے ہیں۔وہ جب اپنے ملک کیلئے لڑتے ہوئے مرتے ہیں تو ان کی قوم بھی انہیں شہید ہی کہتی ہے''۔

''کچھ بھی ہو میں تمہیں جنگ میں شامل ہونے کے لئے نہیں جانے دوں گی اپنی جان دے دوں گی''۔

شوبھا نے پھر سسکنا شروع کر دیا۔مکیش مہتا چپ رہا۔دوسرے لوگ بھی خاموش رہے، چند منٹوں کے بعد اس کی ماں نے سکوت توڑا۔

''بیٹا اگر تُو جانا چاہتا ہے تو جا''۔

ماں کی بات سن کر مکیش کے بھائی رمیش نے اسے گھڑک لیا۔

''ماں تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ارتھیوں پر ارتھیاں چلی آرہی ہیں۔بڑی خونخوار جنگ ہو رہی ہے، پلٹن کی پلٹن صاف ہو رہی ہے۔بھائی وہاں جا کر کیا کریں گے۔کیا تم ان کی ارتھی دیکھنا چاہتی ہو؟''۔

رمیش کی بات سن کر شوبھا زخمی شیرنی کی طرح اس کی طرف بڑھی اور دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''ارتھی تو اپنی اٹھوا، میرے پتی کے بارے میں اگر کوئی ایسی ویسی بات کہی تو منہ پر کارگل کا نقشہ بنادوں گی اپنی چپل سے''۔

اس کے بعد وہاں سناٹا چھا گیا۔ فضا پوری طرح سے ناخوشگوار ہوگئی تھی۔ ایک ایک کر کے سارے لوگ وہاں سے کھسک گئے۔ شوبھا اپنے کمرے میں جا کر تکیہ میں منہ گھسا کر آنسو گرانے لگی۔ پیچھے پیچھے مکیش بھی آیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھو شوبھا کوئی ضروری نہیں کہ میں مر ہی جاؤں۔ زندہ بھی واپس آسکتا ہوں اور مجھے ایک دم فرنٹ پر تھوڑی لگایا جائے گا، وہاں تو وہی لوگ جاتے ہیں جو فائٹر ہوتے ہیں اور جنہیں جنگ کے تمام ہتھیار استعمال کرنے کا ڈھنگ معلوم ہوتا ہے۔ توپ میزائل بارودی سرنگیں مشین گن۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ جہاں یہ سب ہوتا ہے اسے فرنٹ لائن کہتے ہیں۔ موتیں وہیں ہوتی ہیں لیکن مجھے وہاں نہیں بھیجا جائے گا۔ اطمینان رکھو''

مکیش کی بات سن کر شوبھا پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوا۔ اسی طرح بکھری ہوئی بولی ''پھر بھی میں جانے نہ دوں گی، دوسری جگہوں پر بھی تو خطرہ ہے جان کا نہ سہی ہاتھ پیر کا تو خطرہ ہے۔ لنگڑے لولے ہو سکتے ہو۔ اندھے بہرے ہو سکتے ہو۔ بدن جل سکتا ہے، چہرہ جھلس سکتا ہے۔ نہیں میں تمہیں نہیں جانے دوں گی''۔

وہ لمحہ بھر کے لئے رکی پھر اس کا جی بھر آیا، اور وہ مکیش سے لپٹ کر سسکیوں کے درمیان کہنے لگی۔

''مکیش میں تم کو نہیں جانے دوں گی، میں تمہیں بہت چاہتی ہوں، تمہارے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی، میں تمہیں نہیں کھو سکتی، محاذ پر جانے کا خیال دل سے نکال دو، ورنہ پھر کہتی ہوں جان دے دوں گی''۔

مکیش مہتا کو اپنی بیوی پر پیار آ گیا۔ وہ بڑی دیر تک اسے چمکارتا رہا، بہلاتا رہا لیکن اپنے ہیجان پر قابو پانے سے وہ قاصر رہا۔ ایک طرف وہ وطن کی محبت میں سرشار تھا، دوسری طرف

گھر والوں کا پیار اور بیوی کے آنسو اسے متزلزل کر رہے تھے ۔ دو طرفہ کھینچاؤ سے اس کا وجود دو حصّوں میں بٹ گیا تھا۔ وہ انتہائی کشمکش میں پورے ہفتہ مبتلا رہا اور بلا ناغہ روز یہ موضوع چھڑتا رہا، کبھی کبھی تو کئی بار چھڑتا اور ہر بار ہر شخص پوری شدت سے اس کی مخالفت کرتا، البتہ ماں اکثر خاموش رہتی ۔ کبھی کبھی اس کے منہ سے نکل جاتا کہ اگر وہ جانا چاہتا ہے تو جانے دو۔ اس پر گھر کے دوسرے افراد اس کے پیچھے پڑ جاتے اور ہر فرد اس کی بے حسی کا رونا رونے لگتا۔ شوبھا غضب میں آ کر اس کو ڈائن تک کہہ دیتی جو اپنے ہی بیٹے کو مارنے پر تلی ہو۔

پھر ایک دن ایک اہم بات ہوگئی ۔ وہ اہم بات یہ تھی کہ اسی قصبہ کا ایک جوان گردھاری لال جو کارگل کے محاذ پر جنگ کر رہا تھا شہید ہو گیا تھا اور اس کی ارتھی قصبہ میں آنے والی تھی ۔ بات چاروں طرف پھیل گئی تھی ۔ ارتھی کو رسیو کرنے کی سرکاری تیاریاں ہونے لگیں ۔ لوگ وقت مقرّرہ سے پہلے ہی ہیلی پیڈ پر اکٹھا ہونے لگے ۔ ملٹری کے جوانوں کا دستہ سلامی دینے کے لئے مستعد ہو گیا سرکاری افسروں کا عملہ آ گیا، چتا کی تیاریاں ہونے لگیں ۔ ٹی ، وی کے وڈیو گرافر، پریس کے فوٹو گرافر، ریڈیو کے ٹیپ ریکارڈر اور مختلف نیوز ایجنسیوں کے رپورٹر اکٹھا ہو گئے اور سبھوں نے اپنی اپنی پوزیشن لے لی ۔ نیتاؤں کے غول کے غول نمودار ہونے لگے ۔ زعفرانی دوپٹا، ترنگا دوپٹا، لال ٹوپی ہری پگڑی، سفید لنگی بند گلے کا کوٹ کھلے سینے کا کرتا خاکی نیکر لمبی ٹوپی طرح طرح کے عجائبات سے ہیلی پیڈ بھر گیا۔ ان خصوصی واردان کے علاوہ قصبہ کی جنتا بھی ارتھی کو دیکھنے ٹوٹ پڑی ۔ انہیں میں مکیش مہتا اور اس کے گھر والے بھی تھے ۔

وقت مقررہ پر ہیلی کوپٹر اترا تو بھارت ماتا کی جے سے فضا گونج اٹھی ۔ ارتھی باہر نکالی گئی تو شہید وطن امر رہے کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ نیتاؤں نے تقریریں کیں مرنے والے کو خوب خوب سراہا گیا اور آخر میں کلکٹر نے اعلان کیا۔

''حالانکہ ہمارے عظیم شہید وطن کی قربانی کا کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی شہید کی بیوہ اور بچوں اور گھر والوں کو آگے کوئی تکلیف نہ ہو اس غرض سے سرکار کی طرف سے شہید وطن کی بیوہ کو ۲۳ر لاکھ روپے دیئے جائیں گے ان میں چھ لاکھ روپے بچوں کی تعلیم کے لئے ۸ لاکھ روپے

مکان بنانے کے لئے ،ایک لاکھ روپئے والدین کے لئے اور باقی ۸ لاکھ بیوی کے ذاتی خرچ کیلئے ہوں گے''۔

کلکٹر کے اعلان کے بعد مارشل دھن بجنے لگی اور ارتھی کو ملٹری کمانڈروں نے اپنے کاندھوں پر اٹھالیا اور چتا کی طرف بڑھ گئے جہاں جے جے کار کے ساتھ اسے نذر آتش کر دیا گیا۔

دوسرے تمام لوگوں کی طرح مکیش مہتا اور اس کے گھر والے بھی بوجھل قدموں سے واپس آ گئے۔

واپسی پر مکیش مہتا تو کسی کام سے باہر چلا گیا باقی گھر کے دوسرے لوگ ایک کمرہ میں بیٹھ گئے جہاں شہید ہونے والے کی قربانی کا کوئی ذکر نہ چھڑا۔ ذکر چھڑا تو ۲۳ لاکھ روپئے کا جو گردھاری لال کی بیوہ کو ملنے والا تھا۔

''بہت بڑی رقم ہے، ہمیں پتہ ہی نہ تھا کہ اتنے روپئے ملتے ہیں'' مکیش کے پتا رمن بھائی بولے۔

شوبھا کی آنکھیں بھی چمکیں۔ ''پورے گھر کے وارے نیارے ہو جائیں گے اتنے روپیوں سے۔ اتنی بڑی رقم تو گردھاری لال کے گھر والے گن بھی نہ پائیں گے۔''

''دیکھ لینا مار پیٹ بھی ہو جائے گی، قتل بھی ہو سکتا ہے''۔ وملا بولی اس پر رمیش مہتا نے کہا۔

''کچھ نہ ہوگا پیسہ ملتے ہی وہ عورت چپکے سے گھر سے بھاگ جائے گی اور دوسری شادی کر لے گی''۔

اپنے چھوٹے بیٹے کی بات سن کر رمن بھائی کڑکے

''ارے ایسے کوئی چھوڑتا ہے۔ گردھاری لال کا باپ اتنا بدھو نہیں۔ وہ بیوہ کی شادی اپنے دوسرے بیٹے سے کر دے گا۔ بیوہ بھی گھر میں روپیہ بھی گھر میں۔ ارے بھیا ۲۳ لاکھ روپئے کم نہیں ہوتے۔ ایک بیٹا مرا تو کیا ہوا، اس کے دوسرے بیٹے بھی ہیں۔ دیکھنا یہی ہوگا۔ گھر میں لکشمی اتر آئی ہے سالے کے''۔

رات اتری تو مکیش مہتا کھویا کھویا اپنے کمرے میں آیا، کپڑے تبدیل کئے اور غم اور تھکن

- بھاتال اور پاتال ۱۱۸
- دھماکہ ۱۲۳
- وزیر جنگلات ۱۲۹
- ریغمال ۱۳۵
- فیصلہ ۱۴۲
- واپسی ۱۵۰
- کلجگ کا آشرم ۱۵۸
- شناخت ۱۶۷
- حج اکبر ۱۷۴
- رُکا ہوا فیصلہ ۱۸۴
- بارش کا نزول ۱۹۰
- مدرسے سے قبر تک ۱۹۸
- ادھورا کام ۲۰۲
- بلی ۲۱۲
- شکاری ۲۲۰
- مراجعت ۲۲۹

سے نڈھال جسم کو بستر پر ڈال دیا۔ اس کی بیوی شوبھا بھی پیچھے پیچھے آئی اور اس کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں کرتے ہوئے پیار سے بولی۔

''ڈیر مایوس مت ہو۔ اگر تمہاری خواہش محاذ پر جانے کی ہے تو چلو یہی سہی، آج کا پورا منظر دیکھ کر اور ہر بات کو اچھی طرح سمجھ کر میرا خیال ہے کہ اب تمہیں کوئی نہ روکے گا''۔

''سچ''۔ مکیش مہتا نے خوش ہو کر اپنی بیوی کو باہوں میں بھر لیا۔ وہ کسمساتے ہوئے بولی۔

''لیکن ڈیر ایک بات ہے''

وہ کیا''؟ مکیش مہتا نے اسے چومتے ہوئے پوچھا

اس نے اپنی گول اور گداز باہوں کو مکیش مہتا کی گردن میں بڑے پیار سے حمائل کر دیں اور بولی۔

''کیا واقعی تمہیں فرنٹ پر نہ بھیجا جائے گا''

(جولائی ۲۰۰۰)

مزدورنی

عذرا نے بڑی مایوسی سے چاروں طرف دیکھا۔ ہوا تیز ہوگئی تھی۔ گھٹا گھنگھور ہوتی جارہی تھی۔ کسی وقت بھی بارش شروع ہوسکتی تھی۔ ایسے کالے کالے ڈراؤنے تہہ در تہہ بادل گھرے چلے آرہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ طوفان نوح آجائے گا۔ چاروں طرف سمندر ابل پڑے گا۔

بارش شروع ہوگی تو گھنٹوں بند ہونے کا نام نہ لے گی۔ اس نے سوچا مگر کروں تو کیا کروں کوئی مزدور ملتا ہی نہیں۔ کیا ہندوستان کے سارے غریب مرکھپ گئے۔ اس نے دور کھڑی اپنی فیاٹ کار کو دیکھا۔ وہاں تک کیسے پہونچوں۔ انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ڈرائیور کو لیتی جانا مگر کمبخت ڈرائیونگ کا شوق لے ڈوبا۔ اب یہ سامان کس سے اٹھوا کر کار تک لے جاؤں۔ وہ بڑبڑائی

اس نے زمین پر رکھے بیگ کو دیکھا۔ جھکی، اٹھایا۔ مگر فوراً ہی اسے پھر رکھ دیا۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں خود اٹھا کر کار تک لے جاؤں۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ کوئی تک بھی ہے۔ مگر مزدور؟۔ ہاں یاد آیا اسٹور والے سے کہوں کہ وہ بیگ گاڑی تک بھجوادے۔ اس نے سوچا اور تیزی سے اسٹور میں داخل ہوگئی۔

''یس میڈم''، سیلس گرل اس کی طرف لپکی۔

''کوئی میرا سامان اٹھا کر میری کار تک چھوڑ سکتا ہے؟''۔ اس نے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت تو کوئی نہیں ہے۔ ویسے آپ کو مزدور باہر مل جائینگے۔ کئی ایک''۔

''کئی ایک؟ وہاں تو ایک بھی نہیں ہے''۔

''سوری میڈم'' کہہ کر سیلس گرل دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''گھمنڈی ہے۔ منہ جلی کو اپنی خوبصورتی پر ناز ہے''

وہ بڑبڑائی اور باہر نکل کر اپنے بیگ کے پاس پھر کھڑی ہوگئی۔

اب بجلی بھی چمکنے لگی تھی اور بوندا باندی بھی شروع ہوگئی تھی۔

''کیا کروں''

وہ بالوں کو درست کرنے لگی۔ مگر وہ طوفانی ہواؤں سے الجھتے ہی رہے۔ ساڑی کو سنبھالنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ کبھی آنچل اڑ جاتا، کبھی وہ جسم سے چپک جاتی اور اسے گھوم گھوم کر ٹھیک کرنا پڑتا۔ لٹو کی طرح گھومنے میں اسے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ گھر میں آئینہ کے سامنے ساڑی پہنتے وقت تو وہ گھنٹوں گھومتی رہتی تھی۔ بڑا مزہ آتا تھا جسم کو ہر زاویئے سے دیکھنے میں۔ مگر گھر میں بند کھڑکیوں کے پیچھے، آئینہ کے سامنے والی بات اور ہوتی ہے اور بازار میں کھڑے ہو کر گھومنے والی بات اور۔

یہاں تو کوفت ہی کوفت تھی۔

کس مصیبت میں پھنس گئی۔ اسے سخت غصہ آیا۔

''اے''

اُس نے اُدھر سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو پکارا۔

''کہئے'' وہ آدمی پاس آ کر بولا۔

''یہ سامان میری گاڑی تک، یعنی میری کار تک پہونچا دو گے؟''

''سامان؟''

''ہاں پیسے دوں گی۔ جو کہو گے''

''کہاں لے جانا ہے؟''

وہ فیاٹ کھڑی ہے نا، وہاں تک۔ ایک روپیہ دوں گی۔

اس آدمی نے کار کو دیکھا۔

''ہنھ۔ میرے پاس چھ فیاٹ اور چار شیورلیٹ ہیں۔ گڈ بائی''۔ اس نے کہا اور چل دیا

کیا مصیبت ہے وہ بڑبڑائی۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کون، پیسہ والا ہے اور کون مزدور۔ آخر جن کے پاس دولت ہے وہ اپنی شکل الّو وں جیسی کیوں بنائے رہتے ہیں کہ شریف آدمی دھوکا کھا جائے۔ چھ فیاٹ اور چار شیورلٹ۔ ہوں۔ اس نے نفرت سے کہا۔

اب کیا کروں؟ اس نے خود سے پوچھا، پانی کی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگی تھیں، ہوا کا زور بھی بڑھ گیا تھا، بجلی پورے آسمان پر تڑتڑانے لگی تھی، لوگ جلدی جلدی دوکانیں بند کرنے لگے تھے، بھاگ رہے تھے، سڑک ویران ہونے لگی تھی، سرِ شام ہی آدھی رات اترنے والی تھی۔

''سنو''

اس نے گھبرا کر ایک دوسرے آدمی کو پکارا۔

وہ شخص ٹھٹھکا، مڑ کر اسے دیکھا، پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔

''آپ نے مجھے آواز دی؟'' اس نے پوچھا

''جی ہاں''

''فرمایئے''

''میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ کوئی آدمی مل سکتا ہے جو اس بیگ کو میری کار تک پہونچا دے، میں بیس روپے تک دے دوں گی''

اس آدمی نے جھک کر بیگ اٹھایا، پھر اسے زمین پر رکھ دیا اور سیدھا کھڑا ہو کر عذرا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

پانچ کلو سے زیادہ وزن نہیں ہے محترمہ۔ اگر اتنا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتیں تو بیگ کو یہیں چھوڑ یئے، خراماں خراماں اپنی کار تک جایئے اس میں بیٹھ کر ملبار ہل جایئے اور خود کو مع کار بحرِ عرب کی لہروں کو سونپ دیجئے۔ خس کم جہاں پاک''۔

''کیا بکتے ہو'' وہ گرجی۔

''آداب عرض ہے''

وہ چلا گیا تو اس نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کو موتی کی طرح چمکتے دانتوں تلے لا کر زور سے دبا دیا۔

کوئی کمیونسٹ لگتا ہے۔ نانجار، کسی کو یہ لوگ خوش دیکھ ہی نہیں سکتے۔ کار کا نام سنتے ہی جل بھن گیا۔ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مزدور ہو جائے۔ ہاں مزدور۔ مگر کمبخت مزدور ایک بھی نہیں ہے، کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا۔

''او، بھائی''

اس نے تقریباً رونی آواز میں ایک تیسرے آدمی کو پکارا۔ وہ شخص چلتے چلتے رک گیا، اور گھور کر اُسے دیکھنے لگا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

''بولو بہن کیا خدمت کروں'' اس نے قریب آ کر پوچھا

''یہ بیگ میری کار تک چھوڑ دو۔ پندرہ روپے دوں گی''۔

اس شخص نے بڑی للچائی نگاہوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ ''ہائے کیا قیامت کا حسن ہے۔ چلو میری جان''

اس نے بیگ اٹھانا چاہا مگر عذرا نے گھبرا کر بیگ چھین لیا۔

'نہیں تم جاؤ'

''قتل کر ڈالا، ظالم نے''

''شٹ اپ''

وہ شخص ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

''جان من۔ کار تک کیا، گھر تک لے چلوں گا۔ سر کے بل اور قسم تمہاری ادا کی ایک پائی نہ لوں گا''۔

''تم جاتے ہو کہ شور مچاؤں''

اس نے دھمکی دی تو وہ شخص کھسک گیا۔

مر جاؤں گی

اب وہ رونے کے قریب ہوگئی تھی،

بارش میں تیزی آنے لگی تھی، ہواؤں کے زور سے درخت رکوع میں جانے لگے تھے۔ دوکانوں کے بورڈ ٹوٹ ٹوٹ کر دھڑا دھڑ نیچے گرنے لگے تھے۔ بازار آدھا بند ہو چکا تھا۔ بجلی کی کڑک سے محسوس ہوتا تھا کہ آسمان پھٹ کر زمین پر آگرے گا۔

''طوفان آکر رہے گا''

اس نے کہا اور گھبرا کر بیگ اٹھالیا۔ چند قدم چلی، ٹھٹھکی، اِدھر اُدھر دیکھا کہ اب بھی کوئی مزدور مل جاتا تو اس کی عزت رہ جاتی۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ ایک دوکان کے سائبان میں ایک عورت کھڑی اُسے گھور رہی تھی۔ وہ معمولی سی سفید ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ شکل وصورت بھی بس واجبی واجبی تھی، قد لانبا تھا، عمر یہی کوئی بیالیس پینتالیس سال کی ہوگی۔

اس نے جلدی سے بیگ زمین پر رکھ دیا

شاید یہ لے جائے، مزدوری لگتی ہے اور اگر نہ بھی ہو تو پیسہ کس کو کاٹتا ہے دے دوں گی بیس پچیس روپئے۔ ذرا سی دور تو لے جانا ہے اور پھر بیگ بھی ہلکا پھلکا ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کے لئے مگر کہیں یہ اُس غنڈے کی ساتھی نہ ہو۔ کسی جال میں پھنس نہ جاؤں بیگ ہی لے کر بھاگ کھڑی ہو۔ ایسے موسم میں کون مدد کو دوڑے گا۔ نہ بابا۔ نہ۔ اسے نہ بلاؤ۔ پھر؟

دفعتاً اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوگئی۔ وہ عورت اس کی طرف آرہی تھی۔ اس نے بیگ اپنے پیروں کے درمیان کرلیا۔

''او مائی گاڈ کہیں وہ غنڈا بھی نہ آجائے''۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دھک، دھک، دھک۔ اس نے سوچا کوئی دعا پڑھے مگر کوئی دعا یاد ہی نہیں آ رہی تھی۔

اس نے ذہن پر زور ڈالا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ بچپن میں دادی اماں نے چوکیوں پر بٹھا کر، دوپٹہ اڑھا اڑھا کر نہ جانے کیا کیا پڑھایا تھا۔ مگر وہ سب بھول گیا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ زندگی مزے میں کٹ رہی تھی۔ سب کچھ تھا عیش کرنے کو ایسی حالت میں بچپن میں رٹی ہوئی آیۃ الکرسی دعائے قنوت، دعائے گنج العرش، اور پتہ نہیں کیا کیا بڑی تیزی سے ذہن سے کود کر بھاگی تھیں اور پھر کبھی نہ لوٹی تھیں، بلایا بھی نہ تھا، ضرورت ہی کب پڑی تھی۔ اور اب ضرورت پڑی تو۔ یعنی بہت ممکن ہے کام ہی آ جاتیں۔ ویسے یہ بارش نہ ہوتی، طوفان نہ آتا یا اگر کوئی مزدور ہی مل جاتا تو پھر ضرورت ہی کیا تھی

''میڈم آپ کچھ پریشان ہیں؟''

آواز پر وہ چونکی۔

وہی عورت قریب کھڑی پوچھ رہی تھی

''ای۔ای۔ای''۔ عذرا کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔

''گھبرائیے نہیں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

عذرا نے بیگ کو قدموں کی گرفت میں لے لیا، ''میں۔ میں، میری گاڑی۔ وہ ہکلائی''۔

''کیا ہوا آپ کی گاڑی کو، خراب ہو گئی ہے؟''

اس عورت نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ عذرا کے دل کی دھڑکن قدرے معمول پر آ گئی۔ اس نے پہلی بار اُسے غور سے دیکھا۔

اس عورت نے سر کو ساری کے آنچل سے ڈھانپ رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی کلائیاں سونی تھیں۔ کان، ناک، گلا، سب کسی قسم کی آرائش سے خالی تھے۔ آنکھیں پیاسی پیاسی سی تھیں۔ البتہ ہاتھوں کی انگلیاں۔ ''اُف'' عذرا نے اس حالت میں بھی انہیں دیکھ لیا اور جل گئی۔

جیب کاٹتی ہو گی تبھی تو اتنی نرم و نازک اور خوبصورت ہیں۔

اس نے سوچا۔ پھر بولی

''گاڑی کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ میرا یہ بیگ کار تک کوئی پہونچا دیتا تو میں۔ تو میں اسے پچاس روپئے دے دیتی''۔

''اس چھوٹے سے بیگ کو اٹھانے کے لئے آپ پچاس روپئے خرچ کر سکتی ہیں۔!'' اس عورت نے حیرت سے پوچھا

عذرا الجھ گئی

''تو کیا میں اٹھاؤں، پچاس گیا سو روپئے دے دوں گی۔ عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ مگر کوئی ملتا ہی نہیں۔ کمبخت لگتا ہے کسی کو روپئے کی ضرورت نہیں''

''ضرورت تو آپ کو نہیں ہے میڈم۔ ورنہ ایک ذرا سی زحمت سے بچنے کے لئے آپ سو روپئے پھینکنے کے لئے تیار ہیں۔ خیر چلئے میں پہونچا دوں''۔

وہ عورت مسکرائی اور بیگ اٹھالیا

کہاں ہے آپ کی کار، اس نے بیگ سر پر رکھتے ہوئے پوچھا

''چلو میرے ساتھ'' عذرا بولی

دونوں چلنے لگیں۔ عذرا کے دل میں خدشہ اب بھی تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ کہیں یہ لے کر بھاگ نہ۔ کہیں اس غنڈے کی ساتھی نہ ہو۔ یا کسی دوسرے ٹھگ سے ساز باز ہو اور وہ راستے میں جھپٹ پڑیں۔ خیر جہنم میں جائے بیگ اور اس میں رکھی ہوئی چار ہزار روپئے کی چیزیں۔ میں تو اب نہ رکوں گی۔ دونوں خاموشی سے چلتی رہیں۔ احتیاطاً وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ دائیں بائیں بھی نظر ڈالتی جاتی کہ کہیں اچانک حملہ نہ ہو جائے۔ جیسے جیسے وہ کار کے قریب ہوتی گئی اس کے چہرے پر بشاشت آتی گئی، دماغ کی نسیں ڈھیلی ہوتی گئیں اور آنکھوں میں چمک آتی گئی۔ وہ اب بالوں کو درست بھی کرنے لگی تھی، ساری کے پلّو کو بھی ٹھیک کرنے لگی تھی، چال میں بھی دولت مند عورتوں کی ادا پیدا ہو گئی تھی۔ وہی خشونت، وہی جلال، وہی دنیا کو اپنی جوتیوں پر رکھ کر اچھال دینے کی دبی دبی خواہش، اور ہر راہ گیر کی نظروں کو اپنے جسم پر پیوست کر لینے کی میٹھی میٹھی تمنا، اور جو کوئی نہ دیکھے

اسے گولی سے اڑا دینے کی آرزو۔

کار کے پاس آ کر وہ رک گئی، جلدی سے پچھلا دروازہ کھولا۔ اس عورت نے بیگ سیٹ پر رکھ دیا۔ اس نے کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور پٹ سے اگلا دروازہ کھولا تیزی سے اندر داخل ہوئی اور سیٹ پر ڈھیر ہو کر کراہی۔ ''او مائی گاڈ۔ آئی واز نیرلی ڈیڈ''۔ O, MY GOD I WAS. NEARLY DEAD. اس وقت تک ہواؤں کا زور کم ہو گیا تھا مگر بارش تیز ہونے لگی تھی، بجلی کی کڑک اور چمک البتہ فضا میں وحشت اب بھی پھیلا رہی تھی۔

وہ عورت باہر کھڑی بھیگ رہی تھی۔

عذرا نے جلدی سے پرس کھولا، پچاس پچاس کے دو نوٹ نکالے۔ اور راس عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''لو اپنی مزدوری''

عورت مسکرائی اور ہاتھ بڑھا کر روپے لے لئے۔ عذرا چند سکینڈ یوں ہی بیٹھی رہی۔ اس نے سوچا۔

اگر پچاس دیا ہوتا تب بھی ٹھیک تھا۔ یہ لے لیتی۔ پچاس ہی کافی تھا اس کے لئے سو تو بہت ہو گئے مگر اس نے انکار بھی نہ کیا۔ لالچی ہے۔ کوئی معقول عورت ہوتی تو اتنا نہیں لیتی۔ بس چند قدم ہی تو لانا تھا اور وہ بھی ایک چھوٹا سا بیگ۔

ہوں۔ چھوٹے لوگ جو ٹھہرے۔

اس نے دروازہ بند کیا اور کار اسٹارٹ کر دی چند گز جانے کے بعد اس نے عقبی آئینہ میں دیکھا۔ وہ عورت جھک کر کچھ اٹھا رہی تھی۔ اُس نے آئینہ ایڈجسٹ کیا۔ اس کا وزٹنگ کارڈ تھا شاید پرس کھولتے وقت گر گیا تھا

''اب یہ ایک روز گھر پہنچ جائے گی۔ کچھ مانگنے وانگنے''

وہ بڑبڑائی اور کار کی رفتار تیز کر دی۔

رات کے دس بج رہے تھے، ڈنر ہو چکا تھا۔

''آؤ تمہیں ایک کہانی سناؤں''

عزیز نے اپنے آٹھ سالہ بچے کو بلا کر اپنے پاس مسہری پر لٹالیا۔ اس کی بیوی صوفہ پر بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ وہ بھی متوجہ ہوگئی۔

''کئی سال پہلے کی بات ہے''۔ عزیز نے کہانی شروع کی۔ ''ایک لڑکا جو تم سے عمر میں تھوڑا ہی بڑا تھا، سوتیلی ماں کے ظلم سے تنگ آ کر بمبئی بھاگ آیا۔ پہلی رات ریلوے اسٹیشن پر گزاری، دوسری فٹ پاتھ پر اور اس کے بعد انگنت راتیں آئیں مگر فٹ پاتھ کی سخت زمین اس کی پیٹھ سے نہ چھوٹی۔ پہلے فاقے پر فاقے کئے، پھر بھیک مانگا، چند مہینوں بعد وہ گداگری سے آگے بڑھا، اور بوٹ پالش کے پیشہ تک پہونچا۔ چرچ گیٹ ریلوے اسٹیشن کے باہر وہ آنے جانے والے لوگوں کے جوتے چمکانے لگا۔۔۔۔ پھر وہ فٹ پاتھ سے اٹھا اور ورلی ناکے کے ایک جھونپڑے میں پہونچ گیا وہاں سے وہ کہیں اور گیا۔ پھر کہیں اور پھر کہیں اور۔۔۔''

''کہاں کہاں گیا پاپا''

لڑکے کو یہ شارٹ کٹ پسند نہ آیا۔ اس نے عزیز کی بات کاٹ لی۔ عزیز نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بولا۔

''بس وہ مختلف کام کرتا رہا، کبھی یہ کام کبھی وہ کام کچھ مہینوں اِس طرح کا دھندا کچھ مہینوں اُس طرح کا دھندا۔ کچھ سال اُس چیز کی تجارت کچھ سال اِس چیز کی تجارت۔ غرضیکہ۔۔۔۔''

''ہم یہ کہانی نہ سنیں گے۔'' لڑکا چڑھ گیا۔ ''آپ ٹھیک سے بتاتے نہیں۔ اِس کی اُس کی۔ کہیں اس طرح کہانی سنائی جاتی ہے۔''

''تم سنو تو''۔ عزیز نے بیٹے کو چمکارا۔ ''بڑی لمبی کہانی ہے۔ ۲۷ کتابیں اس شخص پر لکھی جا چکی ہیں۔ ۸ فلمیں بن چکی ہیں۔ اب بھلا اتنی لمبی کہانی تفصیل سے کس طرح سناؤں بس یہ سمجھ لو کہ چالیس سال تک وہ گرتا پڑتا رہا اور آخر کار''..... اتنا کہہ کر عزیز یکا یک چپ ہوگیا۔

''پھر؟ لڑکا اس کے سینے پر چڑھ گیا۔ ''جلدی بتایئے''

عزیز نے اسے اپنے سینے پر لٹالیا۔

رشید افروز

سید ظفر ہاشمی اور ان کی ادبی خانقاہ

سید ظفر ہاشمی گذشتہ ۴۵ برس سے افسانے لکھ رہے ہیں ۔۱۹۵۹ میں جب وہ گورکھپور یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے ان کا پہلا افسانہ ''نیلے گلابی لفافے'' شائع ہوا تھا۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''عجیب بات ہے'' ۱۹۹۰ء میں احمد آباد سے منظر عام پر آیا۔اس مجموعہ میں ان کے ۔۲۰۔ افسانے شامل تھے جو ۱۹۷۰ء کے بعد لکھے گئے تھے۔اس سے قبل کے تمام افسانے انہوں نے ضائع کردیئے ۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ۱۹۸۱ء میں ان کا ایک ناول ''منزل تک' شائع ہو چکا تھا۔ یہ ناول مسلم سماج کے تین خاندانوں کی داستان ہے۔نزدیک کی رشتہ داری میں شادی بیاہ کا رواج مسلم سماج میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ناول نگار نے خصوصی طور پر اسے موضوع بناتے ہوئے اس کے فوائد ونقصانات کے ساتھ ساتھ دوسری رسموں اور رواجوں کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اسلوب اور پیش کش دل نشیں ہے۔ یہ گھر گھر کی ایسی کہانی ہے جس سے ہم سب آشنا ہوتے ہوئے بھی نا آشنا ہیں۔اس ناول کی اہم خوبی یہ ہے کہ تمام کردار حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔کردار نگاری میں ہاشمی کی دسترس ابتداء ہی سے قائم ہے۔اس کا پتہ اس ناول سے ملتا ہے۔

ہاشمی کو طنز ومزاح سے بھی گہری دلچسپی ہے۔اپنے رسالہ 'گلبن' کے لئے انہوں نے قسط وار طنزیہ ومزاحیہ خاکے ''حاجی معلق'' عنوان سے لکھے جسے انہوں نے کتابی شکل میں اسی نام سے ۱۹۹۴ء

''جس دن اُس کی پچاسویں سالگرہ تھی وہ بارہ شپنگ کمپنی کا مالک تھا۔ ملک کی ہر بڑی کمپنی میں وہ شریک تھا، دنیا کے ہر بڑے شہر میں اس کی کوٹھیاں تھیں۔ تین ہوائی جہاز اس کے ذاتی ہوائی اڈے پر ہمیشہ کھڑے رہتے تھے، اور ملک کی سیاست اُس کی انگلیوں کے اشارے پر ناچتی تھی۔''

''گپ'' عزیز کی بیوی بولی۔

''ممی، آپ چپ رہئے۔ ہاں پاپا پھر؟'' لڑکا باپ کے سینے پر بیٹھ گیا۔

''پھر دو سال پہلے وہ مر گیا''

چہ، چہ، لڑکے کو افسوس ہوا۔ پھر؟

''اس کی موت کے بعد اس کی بیوی نے، وہ دلہن بن کر ورلی کے چھونپڑے میں آئی تھی کاروبار کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی۔''

''پھر؟''

''پھر دو سال کے اندر اس کے پاس ایک اور شپنگ کمپنی آ گئی یعنی کُل تیرہ ہو گئیں، ہوائی اڈے پر ایک اور ہوائی جہاز کھڑا ہو گیا۔ ملک کی سیاست اس کے ابروؤں کی جنبش سے لڑکھڑانے لگی۔''

''گپ'' عزیز کی بیوی پھر بولی۔

لڑکا خفا ہو گیا۔

''آپ بور مت کریئے ممی، آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو چُپ رہئے''۔ وہ عزیز کے سینے سے اتر کر بستر پر بیٹھ گیا۔ بولا ''پھر پاپا''

''جانتے ہو وہ کون تھے'' عزیز نے پوچھا۔

''بتایئے نا'' لڑکے نے جلدی سے کہا۔

''میری کمپنی کے مالک رشید کرمانی اور اُن کی بیوی سلمٰی کرمانی''۔

عزیز کی بیوی نے اپنی انگلی میں سوئی چبھو لی۔ وہاں خون کا ننھا قطرہ، نمودار ہو گیا اور وہ سی

سی کرنے لگی۔

''پھر؟'' لڑکے نے اپنے باپ کو جھنجھوڑا۔

''پھر یوں ہوا کہ کل سلمیٰ کرمانی اس مرتبے پر پہونچ گئی، جہاں فرشتوں کی رسائی ہوتی ہے''۔

''وہ کیسے پاپا'' لڑکا پلنگ پر کھڑا ہو گیا۔

''اس نے تمہاری ممی کا بیگ اپنے سر پر اٹھا کر اِن کی کار میں رکھا ہے۔ سمجھے؟ تمہاری ممی کا بیگ جس کا شوہر اس کی ایک کمپنی میں تیسرے درجے کا نوکر ہے۔ آج آفس میں وہ میرے پاس خود آئیں اور ہنس کر کہا۔ ''مسٹر عزیز ایک لطیفہ سنو۔''

عزیز نے جیب سے پچاس پچاس کی دو نوٹیں نکالیں اور انہیں اپنی بیوی کی طرف پھینکتے ہوئے حقارت سے بولا۔

''انہیں سنبھال کر رکھنا، ایک فرشتے نے چھو کر انھیں پاک کیا ہے''۔

(دسمبر ۱۹۷۹)

گاؤں کہاں گیا

علیم الدین اکبر پور ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے اترے تو ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کتنے برسوں بعد وہ یہاں آئے تھے۔ چالیس سال ہو گئے تھے وطن چھوڑے ہوئے اور اِس عرصے میں ایک بار بھی وہ اپنے گاؤں نہیں آئے تھے۔ نوعمری میں کسی بات پر خفا ہو کر گھر سے بھاگ نکلے تھے اور وطن سے بہت دور شہر پکڑ لیا تھا۔ وہاں ملازمت کی۔ اونچے عہدے پر پہنچے۔ گھر بسایا اور ریٹائر ہو گئے۔ جب تک ملازمت میں تھے شب و روز کس طرح پر لگا کر اڑتے تھے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ سبکدوشی کے بعد وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ بچے بڑے ہو کر اپنی اپنی زندگی جینے لگے تھے۔ بیوی بچوں کے بچوں میں الجھی رہتی تھیں۔ ان کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ جاتا تھا۔ وہ گھر میں فضول شئے بن کر رہ گئے تھے۔ بڑھاپے میں بے کاری اور تنہائی کی وجہ سے انسان اپنی زندگی کا حساب کرنے لگتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانوں کی یادوں سے وہ خوش اور آنے والے دنوں سے خوفزدہ رہنے لگتا ہے۔ اسی لئے ماضی میں ڈوبنے اور ابھرنے میں اسے بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ علیم الدّین بے کار ہوئے تنہا ہوئے، فضول شئے ہوئے تو انہیں اپنا وطن یاد آنے لگا اور یہ یاد انہیں مسلسل پریشان کرتی رہی۔ گزشتہ چالیس سالوں میں انہیں وطن اکثر یاد آیا تھا۔ لیکن یہ جذبہ اتنی شدت کبھی اختیار نہ کر سکا

تھا، جتنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کرنے لگا تھا۔ کئی دنوں تک وہ سوچتے رہے، پلاننگ کرتے رہے اور پھر ایک دن انہوں نے گھر میں اعلان کر دیا کہ وہ گاؤں جا رہے ہیں۔

گھر والوں کو حیرت ہوئی۔ گاؤں کا ذکر تو وہ اکثر کرتے تھے۔ لیکن جانے کا نام پہلی بار لیا تھا۔ انہیں سمجھایا گیا اکیلے نہ جائیں کسی کو ساتھ لے لیں۔ لیکن انہوں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ ''اپنے گھر جانے میں اکیلا دوکیلا کیسا میں راستہ بھولا تو نہیں ہوں۔ اکیلا آیا تھا، اکیلا ہی جاؤں گا۔'' انہوں نے سوٹ کیس خود تیار کیا اور نکل پڑے۔ شام کی فلائٹ پکڑی اور دلّی آ گئے۔ وہاں سے رات کی ٹرین لی اور دوسرے دن اکبر پور آ گئے۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر آ کر انہوں نے بس اسٹینڈ کے لئے رکشہ کیا وہاں انہیں پہلا دھکا لگا۔ انہیں یاد آیا کہ پہلے یہاں اتنا بڑا بس اسٹیشن نہیں تھا۔ معمولی سا شیڈ تھا جس میں ایک دو بسیں اور بے شمار کبوتر رہائش پذیر ہوا کرتی تھیں۔ اتنے سارے مسافر بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ بس کے لئے تو کوئی رکتا بھی نہیں تھا۔ یکہ پکڑا اور نکل گئے۔ یا پھر اللہ سلامت رکھے ان کے پیروں میں بڑی طاقت ہوا کرتی تھی۔ ٹرین سے اترے اور پیدل چل دیے۔ آٹھ دس کوس کی مسافت تو معمولی بات تھی اور اب شاید شہروں کی طرح یہاں بھی پیدل چلنے کا رواج اٹھ گیا ہے۔ ورنہ اتنی بھیڑ کیوں ہوتی، اُن دنوں اِن جیپوں اور ٹمپوؤں کا نام ونشان نہ تھا۔ جیپ صرف سرکاری ہوا کرتی تھی اور ٹمپو کا تو وجود بھی نہ تھا۔ یہ سب اب مسافروں کو ڈھوتے ہیں۔ بس کے انتظار میں اب بھی شاید لوگ کم ہی رکتے ہیں۔ جسے دیکھو جیپ یا ٹمپو کی طرف بھاگ رہا ہے۔ دس پانچ منٹ کا انتظار بہت ہو گیا پھر جیپ یا ٹمپو میں گھسے اور چل دیے۔

علیم الدّین کو بھی ایک شخص نے مشورہ دیا۔ ''بڑے میاں کب تک بس کا انتظار کرو گے۔ اور اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ بس آتی ہے اور چلی بھی جاتی ہے۔ نئے لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ البتہ جو تجربے کار ہوتے ہیں انہیں علم ہوتا ہے کہ کون سی بس کہاں لمحے بھر کیلئے کھڑی ہوگی اور چل دے گی۔ بس اسٹیشن پر کوئی کوئی ہی بس آتی ہے۔ باقی سب باہر ہی سے نکل جاتی ہیں۔ آپ بھی کوئی جیپ یا ٹمپو پکڑیے اور چلے جائیے اور بس کے چکر میں نہ پڑیئے''۔

علیم الدّین نے سوٹ کیس اٹھایا اور کبھی آگے اور کبھی پیچھے رینگتی ایک جیپ کی طرف لپکے

کنڈکٹر چیخا ٹانڈہ ٹانڈہ اور اس نے لپک کر علیم الدین سے سوٹ کیس لے لیا اور انہیں تقریباً دھکا مار کر جیپ کے اندر کر دیا۔ وہ گڈمڈ اکر بیٹھ گئے۔ جیپ چلی۔ علیم الدّین نے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن صاف صاف کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ جگہوں کو پہچاننے کی تگ ودو کرتے رہے۔ لیکن کوئی جگہ ان کے ذہن میں واضح نہ ہوتی سب کچھ بدلا بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اریا بازار میں جیپ رکی تو انہوں نے بازار پر نظر ڈالی اور لمحے بھر کیلئے وہ کانپ گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی زبردست زلزلے نے پوری بازار کو زیروزبر کر دیا ہو۔ جو جگہ ڈھلوان پر تھی وہ بلندی پر آ گئی تھی۔ جو بلندی پر تھی وہ زمین کے اندر گھس گئی تھی۔ بازار کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ سمت بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ مغرب شمال دکھائی دینے لگا تھا۔ علیم الدین کو یاد آیا کہ یہ بازار بڑی پُر رونق اور کشادہ ہوا کرتی تھی۔ یہاں ایک بنیا تھا جس کے وہاں ہر سال ڈاکہ پڑا کرتا تھا۔ انہوں نے اس بنئے کی دوکان کو دیکھنا چاہا لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔ یہاں حلوائی کا ایک لڑکا ان کے ساتھ پڑھتا تھا۔ اور کشتی میں ان کا مقابل ہوا کرتا تھا۔ کبھی وہ انہیں پٹختا تھا اور کبھی وہ اسے دے مارتے تھے۔ آخر تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا تھا کہ کون زیادہ تگڑا ہے۔ اور وہ آٹھواں پاس کر کے اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ علیم الدین نے اس حلوائی کی دوکان کو بھی نگاہوں ہی نگاہوں میں ڈھونڈا۔ لیکن صحیح ٹھکانہ کا اندازہ نہ کر سکے۔ انہوں نے پاس بیٹھے ادھیڑ عمر کے ایک شخص سے پوچھا بھائی اس بازار کی شکل کیسے بدل گئی۔ اس نے بتایا یہاں سے ایک نہر گزری ہے اور اس پر ایک پل بنا ہے۔ نہر اور پل نے مل کر بازار کو روند ڈالا۔ سڑک کے دونوں طرف کی دوکانیں گڈھے میں اتر گئیں۔ علیم الدین نے ذرا گردن باہر نکال کر دیکھا تو انہیں وہ شراب کی دوکان نظر آئی جس پر اب بھی وہی چالیس سال پرانا بورڈ لگا تھا۔ ''دیسی شراب کی دوکان'' انہیں یاد آیا۔ اسی دوکان سے رحمت چچا روزانہ شراب پی کر گرتے پڑتے گھر آتے تھے اور دروازہ پر بیٹھ کر کس وناکس کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ کئی بار تو لوگوں نے انہیں سڑک کے کنارے کسی گڈھے میں گرا پایا اور اٹھا کر گھر لے گئے۔ دیسی شراب کی دوکان اسی طرح غنودگی کے عالم میں تھی جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ حسب معمول پارینہ دو تین کتے وہاں منڈلا رہے تھے اور دوکان کا مالک گدی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ یہ پرانے مالک کا بیٹا ہوگا۔ علیم الدین نے سوچا۔ پرانا مالک تو کب کا مرکھپ گیا ہوگا۔ ہمارے لڑکپن ہی میں وہ بوڑھا

ہو چلا تھا۔ جیپ چلی علیم الدین نے سوچا کتنا فرق آ گیا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف مکان بن چکے تھے۔ ہمارے لڑکپن میں ہمارے گاؤں سے اریا بازار تک سڑک کے کنارے ایک بھی مکان نظر نہ آتا تھا۔ اب مکانوں کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔ علیم الدین نے جھانک کر وہ کنواں دیکھا جسے چوکیا کا کنواں کہتے تھے۔ یہ کنواں سڑک کے کنارے باغ میں تھا۔ گھنے سایہ دار آم کے درختوں کی جھرمٹ میں یہ پختہ کنواں راہ گیروں کے لئے بڑا فرحت بخش ہوا کرتا تھا۔ اس کی جگت پر بیٹھ کر تھکن کافور ہو جایا کرتی تھی۔ وہیں ایک سادھو نے کٹیا بنالی تھی اور کنویں کی جگت میں ایک طاق کھود لیا تھا اور اس طاق میں بھگوان کی مورت بٹھا رکھی تھی۔ یہ چھوٹا سا مندر پاس کے گاؤں جمالا پور کے لوگوں کے لئے تیرتھ استھان بن گیا تھا۔ شام ہوتی تو لوگ چوکیا کنواں کی طرف نکل پڑتے بھگوان کو پرنام کرتے، اور کنویں پر بیٹھ کر اکا دکا آتی جاتی سواریوں کو دیکھتے رہتے آپس میں باتیں کرتے رہتے اور مسافروں کی رہنمائی بھی کرتے جاتے۔ پاس ہی ایک میدان تھا جہاں دسہرے کے دن شری رام راون کو مارتے تھے اور پورا ماحول خوشی اور امنگ سے لہک لہک اٹھتا تھا۔ زبردست میلہ لگتا تھا دور دور گاؤں کے لوگ امڈ پڑتے تھے۔ علیم الدین نے دیکھا کوئیں کی جگت بیٹھ چکی تھی اور اسکی اینٹیں لوگ اکھاڑ لے گئے تھے۔ وہ اب ایک گڈھا دکھائی دے رہا تھا۔ پجاری کے ساتھ بھگوان کی مورتی بھی غائب تھی۔ علیم الدین کو وہاں کوئی راہ گیر نظر نہ آیا۔ جب کنویں کی پختہ چکنی ٹھنڈی مینڈ ہی نہ تھی، بھگوان کی مورتی نہ تھی پجاری نہ تھا، کنویں میں پینے کے لائق پانی نہ تھا تو وہاں انسان کس کی جستجو میں آتا۔ ایک گندے گڈھے کے لئے۔ گڈھا تو ہر جگہ ہوتا ہے کیا شہر کیا گاؤں۔ علیم الدین نے اس میدان کو ڈھونڈنا چاہا جہاں دسہرہ کا میلہ لگتا تھا اور وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں آتے تھے۔ ان میں منصور اور عید و نائی، جان محمد دھنیا، باسدیو اور رام دیو بنیا، جھپسی اور کدار ناتھ لنیا وغیرہ لنگوٹیا یار تھے اور یہی بچپن کے ساتھی تھے۔ انہیں لوگوں کے ساتھ وہ کھیلتے تھے، گھومتے تھے، لڑتے تھے، جھگڑتے تھے، مار پیٹ کرتے تھے اور پھر مل جایا کرتے تھے۔ علیم الدین کو وہ میدان کہیں نظر نہ آیا۔ وہاں اب الیکٹرک کنٹرول کا کیبن بن گیا تھا اور وہ جگہ خاردار تاروں سے گھیر دی گئی تھی۔ اور وہاں خطرہ کا بڑا سا سائن بورڈ لٹک رہا تھا جس میں انسانی کھوپڑی بڑی بھیانک لگ رہی تھی۔ علیم الدین کو

چرکہ لگا۔ اب دسہرہ کا میلہ کہاں ہوتا ہوگا انہوں نے اپنے پاس بیٹھے ایک مولوی صاحب سے پوچھا۔

''بھائی صاحب آپ کو معلوم ہے پہلے یہاں دسہرا کا میلہ لگتا تھا۔ اب وہ میلہ کہاں لگتا ہے''؟

''ان صاحب نے چونک کر پوچھا۔ ''دسہرا''؟

''ہاں! دسہرا جس میں شری رام راون کو مارتے ہیں۔''

''اچھا، اچھا، وہ ہندوؤں والا دسہرا۔ لیکن اب یہاں میلہ ویلہ نہیں لگتا۔ یہاں الیکٹرک کنٹرول کیبن بن گیا ہے۔ اور اطراف کے گاؤں کی بجلی یہیں سے کنٹرول کی جاتی ہے''۔

جیپ آگے بڑھ گئی۔ علیم الدین نے پھر گردن باہر نکالی۔ سُوراپور اسٹیشن آرہا تھا۔ ان کے لڑکپن کے دنوں میں وہاں ٹرین نہیں چلتی تھی۔ اس سے بہت پہلے کبھی چلتی تھی۔ لیکن ان کے لڑکپن کے دنوں میں بند ہو چکی تھی۔ اسٹیشن اسوقت بھی تھا۔ اسٹاف کوارٹرس بھی موجود تھے۔ گو کہ دروازے اور کھڑکیوں سے بے نیاز تھے۔ اور اپنی بے حرمتی پر ماتم کناں، ماضی کے خاموش داستان گو تھے۔ اب وہاں دوبارہ ٹرین چلنے لگی تھی اور اسٹیشن اور کوارٹرس پھر سے زندہ ہو گئے تھے۔ علیم الدین نے وہاں بڑی چہل پہل دیکھی۔ ان کے بچپن میں سُوراپور کا اسٹیشن سنسان اور بے جان پڑا رہتا تھا۔ وہ وہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ قندیل کا پھول اور کوڑیلہ توڑنے جاتے تھے۔ وہیں جلیبی کا ایک بڑا سا پیڑ تھا۔ جس پر گھنٹوں پتھروں کی بارش کرنے پر ایک آدھ جلیبی کا پھل حاصل ہو جاتا تھا جسے پا کر انتہائی مسرت ہوتی تھی۔ وہیں گول مٹول پتھر بھی تلاش کرتے تھے۔ جنھیں گڑھ گڑھ کر کھیلنے کے لئے گولیاں بناتے تھے۔ قندیل کے پھول اب بھی دکھائی دیے۔ اُن میں کوڑیلہ بھی ہوگا لیکن جلیبی کا درخت نظر نہ آیا۔ اب وہ جگہ ایک اچھی خاصی بازار ہو گئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کچی پکی دوکانیں بن گئیں تھیں اور متعدد لکڑی کے کیبن لگ گئے تھے۔ وہاں وہ سب کچھ تھا جو ایک چھوٹی بازار میں ہوتا ہے۔ بساطی، بزاز، کیمسٹ، پان، سگریٹ، حلوائی، نائی، دھوبی، درزی، موچی، بنیا، بقال، چائے خانے، سبزی، مچھلی، گوشت کی دوکانیں، اور اینڈتے ہوئے دیہاتی بانکے، جن میں کسی کسی کے پاس موٹر سائیکلیں بھی ہوتیں ورنہ عام طور پر سائیکل ہی ان کی سواری تھی، پان کھاتے چائے پیتے، سگریٹ پھونکتے اور آپس میں ٹھٹھول کرتے دکھائی دیتے تھے۔

جیپ اسی بازار میں رک گئی۔ علیم الدین کو یہیں اترنا تھا۔ ان کا گاؤں بازار سے دو فرلانگ کی دوری پر تھا اور وہاں سے دکھائی دیتا تھا۔ وہ جیپ سے اترے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑے حیرت واستعجاب سے اپنے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہاں تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ کچھ بھی اپنا نہیں لگتا۔ یہ جگہ تو اجنبی ہوگئی ہے۔ وہ ابھی چلنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ اتنے میں سترہ اٹھارہ سال کا ایک لڑکا ان کے پاس آیا اور سلام کر کے پوچھا۔ انہیں کہاں جانا ہے۔ علیم الدین نے اس لڑکے کو غور سے دیکھا۔ رحیم الدین کے لڑکپن کی شکل ان کے ذہن میں ابھری۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ پوچھا تم رحیم الدین کے بیٹے سلیم ہو؟ لڑکے نے جواب دیا، ہاں، انہوں نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا بیٹا میں تمہارا بڑا باپ ہوں، علیم الدین، لڑکے کی آنکھوں میں خوشی رقص کرنے لگی۔ اس نے کہا میں اپنی سائیکل لے لوں۔ سوٹ کیس اس پر رکھ لوں گا۔ اتنا کہہ کر وہ بھاگا ہوا گیا اور چند منٹوں میں سائیکل لے کر آ گیا۔ اس نے کیریر پر سوٹ کیس رکھا۔ اور علیم الدین سے کہا چلئے۔

علیم الدین چل پڑے۔ وہیں وہ اسکول بھی تھا جس میں انہوں نے پرائمری اور مڈل کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس زمانے میں پرائمری اسکول کھپریل کا تھا، اب پختہ بن گیا تھا۔ مڈل اسکول کے تمام کمرے کچی دیواروں کھپریل اور پھوس کے بنے تھے۔ ایک کمرہ تو ان کے کلاس کے لڑکوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اس کی شکل بھی بدل گئی تھی۔ پرائمری اسکول کے سامنے آم کے کئی درخت تھے۔ سب کے سب کٹ گئے تھے۔ درختوں کے نیچے مٹی کے ہاتھی گھوڑے والی کئی مورتیاں تھیں۔ جو اب وہاں نہیں تھیں۔ ان کی جگہ ایک چھوٹا سا مندر تعمیر ہو گیا تھا۔

جب وہ اپنے بچپن کے راستے پر مڑنے لگے تو سلیم نے روکا بڑے ابا یہ راستہ بند ہو گیا ہے۔ اب ایک چیک روڈ بن گئی ہے جو سڑک سے ہمارے گاؤں کو جوڑتی ہے۔ اِدھر سے آیئے پنچائت گھر کی طرف سے۔ وہیں علیم الدین کو سڑک کے کنارے ایک بڑا کمپاؤنڈ نظر آیا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رکے اور سلیم سے پوچھا ''یہ کیا ہے''؟

سلیم نے بتایا ''رائس مل''

''رائس مل؟''، علیم الدین نے حیرت سے کہا۔ یہاں ہمارے گاؤں میں۔''

''ہاں''۔ یہاں آس پاس کئی ملیں بن گئی ہیں جو رات دن چلتی رہتی ہیں۔ ہمارا گاؤں اب شہر ہو گیا ہے بڑے ابا۔''

''اچھا''، علیم الدین کی آواز میں درد تھا۔ انہوں نے سلیم کو بتایا اس جگہ جہاں یہ مل بنی ہے ایک میدان ہوا کرتا تھا۔ جہاں ہم لوگ اور ہمارے بزرگوار ہاکی کھیلتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے بڑوں میں ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے، اور سبھوں کو کھیلنے کا شوق تھا۔ ابا، چچا، اسحاق ابا، جمن چچا، الطاف چچا، ولّا بھیا، مختار ابا، حمایت ابا، شفیق بھیا، لئیق بھیا، سادھو چچا، وغیرہ کے علاوہ دہیا ور اور رسولپور کے لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ یہ زمیندار لوگ تھے۔ میدان میں اترتے تھے تو آٹھ گاؤں کے لوگ انہیں دیکھنے کے لئے اُمڈ پڑتے تھے۔ کیا رونق ہوتی تھی۔ بڑے بڑے میچ ہوا کرتے تھے۔ ہاکی کے علاوہ والی بال، فٹبال، رسّہ کشی، اور دوسرے کھیلوں کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ جس میں گاؤں کے لوگ بڑے ذوق وشوق سے حصہ لیا کرتے تھے۔ جمالا پور کا ایک لوہار تھا۔ بڑا تگڑا۔ اس کی کمر میں رسّہ باندھ دیا جاتا تھا اور وہ زمین پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر مقابل ٹکڑی لاکھ کوشش کرتی کہ اسے ہلا دے پٹھا ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ لانگ جمپ، ہائی جمپ، کبڈّی، گلّی ڈنڈا، سب کھیلوں کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ اب یہ سب کھیل کہاں کھیلے جاتے ہیں یہاں تو مل بن گئی۔

سلیم نے حیرت سے اپنے بڑے ابا کو دیکھا۔ ''کھیل؟ کھیل تو شہروں میں ہوتا ہے۔ یہاں لوگ کام کی دُھن میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ کھیلنے کا وقت کس کے پاس ہے بڑے ابا۔ بچے بھی اب نہیں کھیلتے''۔

''لیکن یہ خصوصیت تو شہروں کی ہے۔ کھیل تو گاؤں میں ہوا کرتے تھے۔''

علیم الدین نے حیرت سے کہا۔

''یہ اگلے وقتوں کی باتیں ہونگی بڑے ابا۔ اب یہاں کھیلنے کی فرصت کسی کو نہیں ہے۔ جن کھیلوں کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ گاؤں کی نئی نسل ان میں سے بیشتر کو جانتی بھی نہیں۔''

''لکھنی، بھوں دھب دھب، کھٹیل، سُر، وغیرہ کھیل تو تم لوگوں نے کھیلا ہوگا۔ یہ تو

خالص دیہاتی کھیل ہیں''۔

''ہم نہیں جانتے یہاں کوئی نہیں کھیلتا''

''اور گولی؟''

''کس کی؟ بندوق کی؟''

علیم الدین چُپ ہو گئے۔ اس نسل کا رشتہ اپنے ماضی سے ٹوٹ چکا ہے۔ گاؤں کی یہ نسل شہروں سے جُڑ گئی ہے۔ ہمارے گاؤں کہاں گئے۔

چلتے چلتے وہ راستے میں ایک جگہ رک گئے۔ بڑی حسرت سے اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر سلیم سے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے اس جگہ آٹھ دس آم کے بڑے گھنے درخت ہوا کرتے تھے۔ ہم لوگ اسکول آتے جاتے یہاں تھوڑی دیر دم لیا کرتے تھے۔ اور فصل کے زمانے میں آم توڑ کر کھایا کرتے تھے۔''

''باغ کا مالک روکتا نہیں تھا؟'' سلیم نے پوچھا۔

''نہیں۔ آموں کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ کوئی کہیں سے بھی توڑ کر کھا سکتا تھا۔ اُن دنوں لوگوں کے دل بڑے ہوا کرتے تھے مل بانٹ کر کھاتے تھے۔''

سلیم نے کہا ''اب تو تمام پرانے باغ ختم ہو گئے ہیں۔ نئے قلمی باغات لگائے گئے ہیں۔ جو فصل آنے سے پہلے ہی فروخت ہو جاتے ہیں۔ اور خریدار ہاتھ میں بندوق لے کر ان کی رکھوالی کرتا ہے۔ تخمی آموں کے بڑے بڑے درخت اب بہت کم نظر آتے ہیں۔ جو ہیں بھی وہ پھلتے نہیں''

علیم الدین نے ایک گڈھے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ جو تم سامنے گڈھا دیکھ رہے ہو نہ، یہ اس طرح نہیں تھا۔ اچھا خاصا تالاب تھا۔ پانی صاف شفاف تھا۔ ہم لڑکے اس تالاب میں اکثر نہاتے تھے۔ اور کنویاں توڑنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جان توڑ کوشش کرتے تھے۔ یہی ہمارا دھان کا کھلیان تھا۔ فصل کے زمانے میں جب دھان کی پٹائی ہوتی تھی تو ابا مرحوم عصر اور مغرب کی نمازیں اسی کھلیان میں پڑھتے تھے اور اسی تالاب کے پانی سے وضو کرتے تھے۔ اتنا صاف ہوتا تھا پانی۔ وہ بڑا گہرا، صاف شفاف تالاب اب گندہ گڈھا ہو گیا ہے اور ساری زمین کھیت

میں شائع کیا۔ قارئین اور اہم قلمکاروں نے ہاشمی کے طنز ومزاح کو بے حد سراہا۔ موضوع ہمارا معاشرہ بالخصوص مسلم معاشرہ ہے۔ معاشرے کے انگنت مسائل پر ہاشمی نے بڑی خوبصورتی سے لکھا ہے۔ مرکزی کردار حاجی عبدالسمیع کھراجت والا ہیں۔ بظاہر دیندار نام ونمود اور شہرت سے بے نیاز، قوم کے ہمدرد اور سچے بہی خواہ، بباطن اول درجہ کے دنیادار، جاہل، نام ونمود اور شہرت کے خواہاں، عیار، قوم کے دشمن۔ اپنے مفاد کے حصول کے لئے ہر قسم کی رذیل حرکت پہ آمادہ ان کے ہمنوا امیر صاحب اور شیخو۔ گھاگ آدمی ہیں۔ حاجی صاحب کو بیوقوف بنانے اور اپنا اُلو سیدھا کرنے کے معاملہ میں بے حد ہوشیار اور چوکس۔ ابن الامیر کے روپ میں خاکہ نگار بھی موجود ہے جس کی حیثیت راوی کی ہے اور اس کی گفتگو بے حد مزے دار اور دلچسپ۔

''حاجی معلق'' کو ہم طنز ومزاح کی عمدہ کتاب قرار دے سکتے ہیں۔ کردار نگاری میں تو اس کا جواب نہیں۔ ہاشمی نے اردو ادب کو ایک اور زندہ وجاوید کردار 'حاجی معلق' دیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں بھی احمد آباد سے شائع ہوئیں۔

ہاشمی نے دسمبر ۱۹۷۷ء میں احمد آباد سے 'گلبن' جاری کیا۔ یہ علمی، ادبی رسالہ ۲۵ سال تک نہایت پابندی کے ساتھ احمد آباد سے شائع ہوتا رہا اور اب گزشتہ دو سالوں سے ہاشمی کے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد اس کی اشاعت کا سلسلہ لکھنؤ سے جاری ہے۔

صحافت سے ۲۷ سال کا رشتہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہاشمی نے اردو صحافت کو اردو کی بقاء، ترویج واشاعت اور ترقی کے مقاصد سے اس طرح اپنایا کہ اردو تحریک ان کی زندگی کا اعلیٰ ترین مشن بن گئی۔

گلبن کے لئے ہاشمی نے جو اداریے لکھے وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور صحافت کا اعلیٰ معیار قائم کرتے ہیں۔ مختلف موضوعات کی دلنشیں پیش کش، ادبی چاشنی اور طنز ومزاح کا لطیف عنصر۔ موضوع بحث مسئلہ پر ہاشمی کی گرفت اور معاملہ کی تہہ تک پہنچ جانے کی خداداد صلاحیت ان کے اداریوں کے اوصاف ہیں۔ ان میں جامعیت بھی ہے اور اختصار بھی۔ وہ اداریے جو مخصوص اشخاص سے متعلق ہیں ان اشخاص کو مکمل طور پر قاری کی عدالت میں کھڑا کر دیتے ہیں اور ہم ان اشخاص کا باطن بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کردار نگاری کا حسن یہاں بھی موجود ہے۔ صاف گوئی، بیباکی اور جرأت

بن گئی ہے باغ کی بھی اور کھلیان کی بھی۔''

اتنا کہہ کر علیم الدین نے ایک طرف اشارہ کیا۔''اُدھر وہاں بھی ایک باغ تھا آم کا بھدیاں وہ بھی شاید کٹ گیا۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

''ہاں، کٹ گیا''۔ سلیم نے بتایا۔''اور اس زمین پر اب کھیتی ہوتی ہے''

''وہاں بھی ایک تالاب تھا۔''

''اب بھی ہے،''

''ہم اس میں بھی نہاتے تھے۔''

اب کوئی اندر گھس نہیں سکتا۔''

''کیوں؟''

''اس میں مچھلیاں پالی جاتی ہیں۔ پنچائت نے تمام تالابوں کو نیلام کر دیا ہے۔ ٹھیکیداران ان میں مچھلیاں پالتے ہیں اور شہروں میں لے جا کر بیچتے ہیں۔''

''پھر بھینسیں کہاں نہاتی ہیں؟''

علیم الدین نے پوچھا تو سلیم ہنس پڑا۔

''بڑے ابا گاؤں میں اب بھینسیں ہیں کہاں۔ جب سے چراگاہوں میں فصلیں اگائی جانے لگیں لوگوں نے بھینسیں پالنا چھوڑ دیا۔ اب لوگوں کے پاس کوئی چیز بھی پالتو نہیں ہے۔ بچے بھی آزاد ہیں۔''

''تب دودھ کہاں سے ملتا ہے؟''

''ڈبّے سے''

''کیا مطلب؟''

''امُول ڈیری کے دودھ کے ڈبّے یہاں بھی ملتے ہیں، ہم وہی استعمال کرتے ہیں۔''

''اور مچھلیاں پکڑنے کہاں جاتے ہو؟''

اب مچھلی پکڑنے کا رواج نہیں۔ مچھلیوں کی تمام جگہوں پر ٹھیکیداروں نے قبضہ کر رکھا ہے۔

ہم مچھلیاں خرید کر کھاتے ہیں۔''

''اپنے گاؤں کے تالابوں کی مچھلیاں بھی خریدتے ہو؟''

''ہاں تالابوں کی بھی ندیوں کی بھی۔ آپ لوگ مچھلیاں خود پکڑنے جاتے تھے بڑے ابا؟''

''ہاں''، علیم الدین ماضی میں غوطہ کھا گئے۔ ہمارے پاس درجنوں ہک لگی ہوئی بنسیاں ہوا کرتی تھیں اور ہم تھروا نالے میں مچھلی پکڑنے جاتے تھے۔ آگے آگے بھیا اور پیچھے پیچھے بنسیاں لئے میں۔ ریلوے لائن پار کرنے پر ڈھاک کا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں پہنچ کر بھیا کوئی غزل چھیڑتے پھر بانسری بجانے لگتے۔ اگست کی دھوپ چھاؤں، خنک ہواؤں کا سرور، کالی اور اودی بدلیوں کا چڑھتا اترتا نشہ پکے ہوئے دھان کی مہک، اور لہلہاتی ہوئی دھرتی کا نغمہ، ڈھاک کے سرخ پھول اور ان پھولوں کے درمیان بہتا ہوا تھروا نالا، ہماری عمر تو خیر ان حالات میں اچھل کود کر رہ جانے کی تھی لیکن بھیا ہواؤں کا رقص دیکھنے لگے تھے۔ اس لئے شعر و ساز کی دنیا میں چلے جاتے۔

''بڑے ابا کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں بیٹے۔ کیا زمانہ تھا۔ ہم خود مختلف تالابوں اور تھروا نالا میں مچھلیاں پکڑتے اور کھاتے تھے''۔

اتنا کہہ کر انہوں نے سلیم سے پوچھا۔

''ہمارے گھر کے پچھواڑے جو تالاب تھا۔ کیا نام تھا اس کا۔ ہری ہروا۔ اُس کا کیا بنا۔''

''ہاں، ہری ہروا۔ وہ بھی ٹھیکیدار کی ملکیت ہے۔ اس میں بھی مچھلیاں پلی ہیں. اور وہ اتنی بڑی بڑی ہیں کہ رات میں جب وہ اچھلتی ہیں تو ہماری نیندیں ٹوٹ جاتی ہیں۔''

اب وہ گاؤں میں داخل ہو چکے تھے گاؤں کی کچی مسجد پختہ بن گئی تھی اور گھروں کے کچھ حصے بھی پختہ نظر آنے لگے تھے۔ الیکٹرک پول بھی تھا جس پر ایک بلب جل رہا تھا۔ گھروں میں لگے بلب بھی روشن تھے۔ مکانوں کے نقشے بدلے ہوئے تھے۔ علیم الدین کے لئے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا کہ کون سا مکان کس کا ہے۔ سلیم بتاتا جا رہا تھا، علیم الدین نے پوچھا'' یہ دوپہر کے وقت جب کہ سورج پورے آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے یہ بلب کیوں جل رہے ہیں؟''

سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بڑے ابا یہاں سوئچ آف کبھی نہیں کی جاتی بجلی کے چارجیز طے شدہ ہیں۔ ایک مخصوص رقم دینی پڑتی ہے۔ آپ چاہے بجلی کا استعمال کریں۔ یا نہ کریں بجلی آتی جاتی رہتی ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں کہ کب آئے اور کب جائے۔ اس لئے لوگ سوئچ کو آن ہی کئے رکھتے ہیں کہ اندازہ ہوتا رہے کہ بجلی ہے کہ نہیں ہے۔''

اب وہ اپنے گھر کے پاس آ گئے تھے۔ علیم الدین نے حسرت سے اس مکان کو دیکھا۔ جس کی دیواروں سے ان کا لڑکپن چپکا ہوا تھا۔ انہیں ایسا لگا جیسے گھر بھی بوڑھا ہو گیا ہو۔ کچی دیواروں پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں۔ پختہ دالان کا پلاسٹر اکھڑ چکا تھا اور اینٹوں میں پھپھوند لگ گئی تھی۔ دروازہ پر نیم کا درخت تناور ہو گیا تھا۔ بلکہ وہ بھی بوڑھا ہو گیا تھا۔ گھر کے اندر جانے سے پہلے وہ پچھواڑے چلے گئے وہاں انہوں نے گھبرا کر سلیم سے پوچھا۔ ''دونوں آم کے درخت کیا ہوئے؟''

''سوکھ گئے تھے، کٹوا دیا گیا''

علیم الدین کو ایسا لگا جیسے ان کا دل بیٹھ جائے گا۔ گھر کے پچھواڑے مالدہ آم کے دو بڑے بڑے درخت تھے۔ ان کی ڈالیوں کو باہوں میں بھر کر وہ کتنا مسرور ہوا کرتے تھے۔ آج بھی ان ڈالیوں کا لمس اور ہری بھری کونپلوں کی مہک ان کے مساموں میں کہیں دبی ہوئی تھی۔ انہیں درختوں کی موٹی موٹی ڈالیوں میں جھولے ڈالے جاتے تھے۔ ساون بھادوں کی مترنم رِم جھم میں پینگیں اس طرح مارتے تھے کہ جھولے پر بیٹھی بہنیں اور ان کی سہیلیاں چیخ چیخ پڑتی تھیں۔ جنوری کے مہینے میں ان پیڑوں پر بور آ جاتا تھا اور پورا گاؤں مہکنے لگتا تھا۔ فروری اور مارچ میں ٹکورے لگ جاتے تھے تو ان کی خوشبو فضا میں ہر وقت پھیلی رہتی تھی۔ مئی کے آخر میں آم پکنے لگتے تھے۔ آدھ آدھ سیر کے آم بے حد شیریں اور لذیذ ہوتے تھے۔ پورا گاؤں سیر ہو کر کھاتا تھا۔ یہ دو پیڑ پورے باغ پر بھاری تھے۔ ہائے دونوں پیڑ سوکھ گئے، پورا باغ اجڑ گیا۔

سلیم نے علیم الدین کا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''بڑے ابا گھر کے اندر چلئے''۔

وہ بھاری بھاری قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ رحیم الدین نے انہیں پہچان لیا۔ دوڑ کر آئے اور علیم الدین سے لپٹتے ہوئے بولے ''بھیا آپ نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔ یوں

یکا یک آ گئے''۔

''ہاں،'' رحیم الدین بولے''۔ ''بڑا دل ہوا کہ اب گھر چلوں۔ سب کچھ بھول بھال کر اٹھا اور چلا آیا''۔

دونوں بھائی دیر تک لپٹ کر روتے رہے۔ پھر رحیم الدین سہارا دیکر علیم الدین کو دالان تک لائے وہاں قالین لگے تخت پر انہیں بٹھایا، سب کی خیریت پوچھی اور اپنے یہاں کی بتائی۔ دیر تک دونوں بھائی ماضی سے حال تک کا سفر آہوں، کراہوں اور مسکراہٹوں کے جلو میں طے کرتے رہے۔

شام ہوئی تو علیم الدین نے سلیم سے کہا، ''چلو بیٹے باہر چلتے ہیں۔ ذرا گھوم آئیں''۔ سلیم انہیں لے کر گاؤں سے باہر آیا۔ علیم الدین کو یاد آیا مسجد کے پاس بہت سارے پیپل اور پکڑ کے درخت تھے وہاں کی زمین صاف ستھری تھی اور کھلیان کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ انہیں درختوں پر وہ دن بھر غلیل سے چڑیوں کا شکار کرتے تھے۔ اور گھر آ کر ابا کی مار کھاتے تھے۔ اب وہاں کوئی درخت نہ تھا۔ آگے چل کر ڈیہوا تھا۔ کئی سو سال پہلے یہ راجہ بھوج کا قلعہ تھا اسکے چاروں طرف پانی کی باولی تھی اب صرف نشان باقی رہ گیا تھا۔ وہیں کسی کا خستہ مزار تھا جو شہید بابا کے مزار کے نام سے مشہور تھا۔ یہ جگہ بانس اور جھاڑ و جھنکاڑ سے بھری تھی۔ ان دنوں وہاں دن میں جاتے ہوئے بھی لوگ ڈرتے تھے سنسناتی گرمیوں کی دوپہر میں تو کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ شہید بابا کے مزار کے پاس بھٹک بھی سکے لیکن ہم لڑکے گاؤں کے کتوں کو لیکر گیدڑ، لومڑی اور خرگوش کا شکار کرنے یہاں آتے تھے۔ ان کے ماندوں میں بڑے بڑے بانس گھسیڑتے تھے اور پانی ڈالتے تھے۔ جب جانور باہر نکل کر بھاگتا تھا تو ہم اس کے پیچھے کتے چھوڑ دیتے تھے۔ آگے آگے جانور اس کے پیچھے کتے ان کے پیچھے ہم لوگ۔ کیا منظر ہوتا۔ کوئی شکار ہاتھ آجاتا تو اسے کتوں سے نچوا نچوا کر اور پتھر مار مار کر ختم کر دیتے تھے۔ اور گھر چلے آتے تھے اور وہاں ابا کی مار کھاتے تھے۔

انہوں نے سلیم سے پوچھا۔ ''تم لوگوں نے کبھی گیدڑ مارا ہے؟''

سلیم نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہوتا ہے''؟ اور ہم اسے کیوں ماریں گے یعنی خوامخواہ''

علیم الدین نے کہا۔ یہ ایک جنگلی جانور ہوتا ہے۔ پہلے گاؤں میں بھی پایا جاتا تھا اور ہم لوگ اس کی جان تفریحاً لیا کرتے تھے۔''

سلیم ہنس پڑا۔ ''میں نے اسے دیکھا تک نہیں۔''

''اور لومڑی؟'' علیم الدین نے پوچھا۔

''کتاب میں اس کی شکل دیکھی ہے۔ وہی کہانی والی جس میں سارس ساری مچھلی کھا جاتا ہے۔''

''خرگوش؟''

''شہر کے عجائب گھر میں دیکھا ہے۔ بڑا اچھا لگتا ہے۔ ملائم ملائم روئی جیسا''

''ہم لوگوں نے خرگوش دیکھا ہے، اسے پکڑا ہے، مارا ہے، چھپسی لنیا نے تو کھایا بھی ہے اب یہاں یہ جانور نہیں ہوتے؟''

سلیم نے جواب دیا۔

''پتہ نہیں ہم نے تو کبھی نہ دیکھا نہ سنا۔ اس ٹیلے کے خاردار درختوں پر صرف کوے اور گدھ دکھائی دیتے ہیں اور جھاڑیوں میں سانپ اور گرگٹ۔ میں تو کبھی اندر گیا بھی نہیں۔ ان جانوروں کو خاموشی، تنہائی اور اندھیرا چاہئے۔ یہاں چاروں طرف ٹیوب ویل لگ گئے ہیں۔ ان پر ہر وقت چہل پہل ہنگامہ اور بجلی کی روشنی رہتی ہے۔ تہذیب کی آمد نے جنگلی جانوروں کو ڈرا دیا ہوگا اور وہ بھاگ گئے ہونگے۔''

علیم الدین آگے بڑھے۔ پہلے وہاں ایک بہت بڑا آم جامن اور مہوے کا باغ ہوا کرتا تھا جو اب نہیں تھا۔ اس جگہ ایک اسکول کی عمارت کھڑی تھی۔ کچھ درخت اب بھی باقی تھے۔ لیکن وہ بھی ڈرے سہمے سوکھے اور مرجھائے ہوئے۔ شاید انہیں بھی اپنی موت کی بشارت ہوگئی تھی۔ علیم الدین نے دور دور تک نظر ڈالی کھیتوں میں جگہ جگہ ٹیوب ویل لگے ہوئے تھے اور بجلی کے بلب روشن تھے۔ جگہ جگہ بجلی کے کھمبے گڑے ہوئے تھے اور اوپر تاروں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ سلیم نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

''بڑے ابا اس ٹیلے پر گنے کی مل بننے والی ہے۔ پھر یہاں سے یہ بنسواڑی جھاڑ جھنکاڑ صاف ہو جائیں گے یہاں تک کہ شہید بابا کا مزار بھی نہ رہے گا۔ گیدڑ، لومڑی، خرگوش تو پہلے ہی سے بھاگ نکلے ہیں، اطراف کے کھیت بھی بک جائیں گے اور وہاں مل کا کیمپس بنے گا۔ دوکانیں بنیں گی اور بازار لگے گا۔ بڑے ابا ہمارا گاؤں بالکل شہر ہو جائے گا۔''

علیم الدین نے دور چکر پان ٹیلہ پر نظر ڈالی اور سلیم سے کہا ''وہاں ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا جس کی متعدد جٹائیں زمین میں سما کر الگ الگ درخت بن گئی تھیں۔ سینکڑوں جٹائیں زمین کی طرف لپک رہی تھیں۔ انہیں جٹاؤں کو پکڑ کر ہم جھولا جھولتے تھے۔ وہ درخت کیا ہوا؟ کٹ گیا؟''

''ہاں''

''افسوس۔ اس درخت کے پاس ایک تالاب تھا۔ وہیں ہمارے آٹھ گاؤں کے تعزیئے دفن کئے جاتے تھے۔ دسویں محرم کو زبردست میلہ لگتا تھا۔ دور دور سے دوکانیں آتی تھیں، تعزیوں کا جلوس کئی گاؤں سے گھومتا گھامتا وہاں پہنچتا تھا۔ میلہ اب بھی لگتا ہے؟''

انہوں نے سلیم سے پوچھا۔ تو اس نے بتایا اب نہ میلہ لگتا ہے اور نہ تعزئے اٹھائے جاتے ہیں۔ فقیروں کے تعزئے نکلتے ہیں اور یہ لوگ دفن کرنے کیلئے کہاں لے جاتے ہیں، اسے نہیں معلوم رات میں کھانا کھاتے وقت انہوں نے پانی پیا تو اس میں عجیب سی مہک آئی۔ گلاس منہ سے ہٹالیا۔ پوچھا پانی کہاں کا ہے۔

''اپنے ہینڈ پمپ کا'' سلیم نے بتایا

''کیوں؟ اپنے کنویں سے کیوں نہیں منگوایا؟''

سلیم ہنس پڑا۔ ''بڑے ابا شاید آپ کی نظر اس کنویں پر نہیں پڑی۔ اس کا پانی اب قابل استعمال نہیں۔ آدھا تو پُر ہو گیا ہے۔ گاؤں کے تمام کنوؤں کا یہی حال ہے۔ سب ختم ہو چکے ہیں''

''کیوں؟'' علیم الدین نے پوچھا۔

''سب کے گھروں میں ہینڈ پمپ لگ گئے ہیں''۔

علیم الدین کے ذہن میں ماضی ابھرا، کیسا شاندار کنواں تھا۔ ہمارے دروازے کی زینت تھا۔ دن بھر پانی بھرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ شام کا منظر کچھ اور ہی دلنواز ہوتا۔ دروازہ پر چھڑکاؤ کر دیا جاتا، پلنگ بچھا دئے جاتے، کرسیاں لگا دی جاتیں، ابا سفید دودھ جیسے کھادی کے کپڑے پہنے بیٹھے ہوتے۔ کنویں کی جگت پر گاؤں کے درجنوں لوگ جمع ہو جاتے اور اِدھر اُدھر کی باتوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا جو عشاء کی نماز تک جاری رہتا۔ سردیوں میں فصل کی سینچائی کے لئے اس میں چرخیاں لگائی جاتیں اور آدھی رات سے ہی ان کی چرخ چوں شروع ہو جاتی۔ ایسا ساز پھر زندگی میں سننے کو نہیں ملا، سب ختم ہو گیا۔

''بڑے ابا''

سلیم کی آواز پر وہ چونکے ''ہاں بیٹے''

''اس وقت پی لیں۔ پھر مسجد کے ہینڈ پمپ سے لادوں گا۔ اس پانی میں ہیک نہیں ہوتی۔ دِن میں آپ نے وہی پیا تھا۔''

کھانا کھانے کے بعد انھوں نے روٹی کا ایک ٹکڑا لیا۔ اسے ڈنڈے میں پھنسا کر سلیم سے کہا۔ ''باہر کتا بلاؤ۔ ذرا کھیل ہو جائے''۔

''کیسا کھیل؟'' سلیم کے لہجہ میں حیرت تھی۔

''تم کتا تو بلاؤ''

''کتا؟''

''اماں بلاؤ''

سلیم نے چُوچُو کر کے ایک کتا بلایا۔ علیم الدین ڈنڈے میں روٹی پھنسائے اس کی طرف بڑھے جسے دیکھتے ہی کتا بے تحاشہ بھاگا۔

''ارے یہ تو بھاگ گیا'' ان کے منہ سے نکلا

اتنے میں رحیم الدین بھی وہاں آ گئے اور کہا۔ ''بھیا اپنے دور کے کتوں کی بات نہ کریں۔ وہ اچھل اچھل کر روٹی پکڑنے کی کوشش کرتے تھے، وہ جتنا اونچا اچھلتے روٹی اتنی ہی اونچی ہوتی جاتی

اب یہ کھیل نہیں ہوسکتا۔''

''کیوں؟''

''آج کے کتے ڈرپوک ہیں۔ یہ ڈنڈا دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ انہیں روٹی بھی دیجیے تو اسے بھی منہ نہ لگائیں گے۔ جب تک آپ کنارے نہ کھسک جائیں۔''

''بکرے تو ہتھیلیوں سے ٹکر لیتے ہوں گے۔'' علیم الدین نے پوچھا۔ اس پر رحیم الدین نے بتایا'' بکرے اب کہاں ہیں۔ ذرا سا بڑے ہوئے شہری قصاب لے گئے۔ اب ان پٹھوں کی بات کہاں جو آپ کی ہتھیلی پہ کھٹا کھٹ اپنی پیشانی مارتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں اس عمر تک اب بکرے نہیں پہنچتے۔''

سونے کے لئے باہر صحن میں بستر لگائے گئے۔ علیم الدین لیٹے تو ان کی سماعت سے ٹیپ ریکارڈ سے نکلتے ہوئے فلمی گانے اور ریڈیو سے نشر کی جانے والی خبریں ٹکرانے لگیں۔ اسی وقت ٹی وی پر ڈرامہ بھی آنے لگا اور کہیں دور سے آتی لاؤڈ سپیکر کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ رائس مل کا بھونپو بجا اور ہری ہروا تالاب کے اُس پار کسی موٹر سائیکل کی زبردست پھٹپھٹاہٹ سنائی دی۔ انہوں نے ان تمام آوازوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی اور اپنے کان کھڑے کر کے کتے کے بھونکنے کی آواز، گیدڑ کی آواز، لومڑی کی چیخ و پکار جھینگر کی سیٹیاں، گدھے کی رینک، مینڈک کی ٹرٹر، کوئل کی کوک، پپیہے کی پی کہاں، بن مرغی کی ٹی ٹاں مہوکھے کی کڑکڑاہٹ، الو کی ہو ہو سننے کی لاکھ کوشش کی۔ لیکن کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ انہوں نے خلا میں گھور گھور کر دیکھا۔ کوئی چمگادڑ، کوئی جگنو نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر انہوں نے رحیم الدین سے پوچھا بھائی رحیم الدین یہ سب جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے، کہاں چلے گئے۔ ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ بہت جی چاہتا ہے سننے کو اسی لئے تو یہاں آیا ہوں۔''

رحیم الدین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بڑی مشکل سے ضبط کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''بھیا ہمارے گاؤں میں شہر گھس آیا ہے۔ دن رات بجلی کی روشنی، ریڈیو اور لاؤڈ سپیکر کی

چیخ و پکار، ملوں کا شور، موٹر سائیکلوں کی پھٹپھٹاہٹ، جیپوں اور ٹریکٹروں کی کھڑکھڑاہٹ اونچے لمبے گھنے درختوں، تالابوں، میدانوں اور چراگاہوں کا صفایا الکٹرک تاروں کا پھیلا جال ان سب نے مل کر قدرت کی بوالعجبیوں کو ختم کر ڈالا ہے۔ بجلی کی روشنی میں جگنو کا کیا مقام، کوئل باغوں میں کوکتی ہے اور پپیہا اپنے پی کو گھنے درختوں میں چھپ کر ہی یاد کرتی ہے۔ لیکن اب باغ ہیں نہ گھنے درخت، گیدڑوں اور لومڑیوں کو جھاڑیوں کا اندھیرا اور پُرسکون ماحول چاہئے۔ اب وہ میسّر نہیں۔ چڑیاں صبح کاذب کے وقت چہچہاتی ہیں۔ لیکن چاروں طرف بکھری روشنی میں اب انہیں غالباً اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ صبح کب ہوئی اور چہچہانے کے لئے وہ کنج بھی تو نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں کو حسین جاذب مترنم، نغمہ بار اور پرکشش بنانے والے قدرتی عوامل گاؤں سے جنگل کی طرف ہجرت کر گئے۔''

''اور گاؤں کہاں گیا؟'' علیم الدین کے منہ سے نکلا لیکن رحیم الدین نے کوئی جواب نہ دیا علیم الدین نے کوئی سوال تھوڑی پوچھا تھا اور نہ ہی وہ کسی جواب کی توقع کرتے تھے۔ وہ تو ایک درد تھا جو اُن کے سینے سے پھوٹ کر آواز کی شکل میں باہر نکل آیا تھا۔ اس درد کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ رحیم الدین کو پتہ تھا اس لئے وہ خاموش رہے۔ لیکن سلیم کو کیا معلوم کہ اس ایک جملے سے علیم الدین نے اپنے چالیس سال پرانے زخم پر نشتر لگایا ہے۔ اس نے تو یہی سمجھا کہ اس کے بڑے ابا نے ایک احمقانہ سوال پوچھا ہے، اس لئے ٹھٹھول کرتے ہوئے بولا۔

''بڑے ابا آپ کا گاؤں بھی وہیں کہیں جنگل میں ہوگا اور بڑے ابا نیند نہ آرہی ہو تو چلئے ویڈیو پہ فلم دیکھ آئیں۔ گاؤں کے دُھنیوں اور فقیروں نے انتظام کیا ہے۔ ہر ہفتہ کرتے ہیں''۔

(ستمبر ۱۹۹۱)

ادّیا پرشاد

یہ کہانی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ہمارا داخلہ گاؤں کے پرائمری اسکول میں درجہ سوم میں ہوا تھا۔ اس اسکول کی دیواریں تو اینٹ کی تھیں لیکن چھت کھپریل کی تھی۔ کمرے کشادہ اور ہوادار تھے۔ ہال نما کمروں میں فرش پر ٹاٹ کی صفیں بچھی رہتی تھیں اسی پر ہم لوگ بیٹھتے تھے۔ چونکہ ابتدائی تعلیم میں مدرسہ جان العلوم رسول پور میں، جہاں میرے والد محترم ہیڈ مدرس تھے حاصل کر چکا تھا اس لئے سرکاری اسکول میں میرا داخلہ درجہ سوم میں ہو گیا تھا۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی تقی تھے بوڑھے آدمی تھے دھوتی اور قمیض پہنتے تھے کندھے پر انگوچھا رکھتے تھے گورے چٹے تھے خشخشی داڑھی تھی اُن کے چشمے کی ایک کمانی دھات کی اور دوسری دھاگے کی ہوتی تھی۔ پتہ نہیں مولوی تقی کی یہ اسٹائل تھی یا واقعی ان کے چشمے کی ایک کمانی ہمیشہ ٹوٹی رہتی تھی جسے دھاگے سے وہ مڑھ لیا کرتے تھے۔ وہ لکڑی کی کرسی پر اکڑوں بیٹھتے تھے۔ اور ہمیشہ چشمے کے اوپر سے دیکھتے تھے۔ پھر وہ چشمہ کیوں لگاتے تھے؟ یہ بات بھی ہماری سمجھ میں کبھی نہ آتی لیکن ایک بات ضرور تھی۔ مولوی تقی جس کسی کو بھی چشمہ کے اوپر سے تیز نگاہوں سے دیکھ لیتے تھے اگر وہ میاں ہوتا تو اس کا پائجامہ اور ہندو ہوتا تو اس کی دھوتی گیلی ہو جانے کا ہمیشہ امکان رہتا تھا۔ کیا آنکھیں تھیں اللہ اللہ۔ چڑھا کر دیکھ لیتے تو ملک الموت بھی روح قبض کرنا بھول جاتے۔ مولوی تقی کے نام سے پورا اسکول تھرتھراتا تھا۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

موٹا سا ڈنڈا لے کر چلتے تھے گاندھی جی کی طرح۔ جدھر سے گزرتے تھے لڑکوں میں بھگدڑ مچ جاتی تھی ان کے مارنے کی اسٹائل بھی نرالی تھی۔ چھوٹا سا رولر میز پر رکھا رہتا تھا، جس لڑکے کی شامت آتی اسے بلاتے کہتے ہاتھ پھیلاؤ لڈ ودیں۔ لڑکا جانتا ہوتا کہ مولوی صاحب کس قسم کا لڈو دیں گے۔ لیکن مجبور ہوتا۔ ہاتھ پھیلا دیتا۔ مولوی صاحب پوری طاقت سے اس کی ہتھیلی پر دو لڈو جڑ دیتے پھر کہتے دوسرا ہاتھ لاؤ بالوشاہی دیں اور اسطرح لڈو اور بالوشاہی لے کر وہ غریب ہتھیلیوں کو منھ سے پھونکتا ہوا اپنی جگہ آ کر بیٹھ جاتا۔ مولوی تقی کی ایک بار کی مار سے کئی دنوں تک ہتھیلی میں جلن ہوتی رہتی۔ میں اس زعم میں تھا کہ میرے ابا وہاں کے زمیندار ہیں اور مولوی صاحب انکی بڑی عزت کرتے ہیں اس لئے مجھے کچھ نہ کہیں گے لیکن داخلہ کے دوسرے ہی دن کسی بات پر خفا ہو کر انہوں نے چشمہ کے اوپر سے مجھے گھورتے ہوئے کہا ''یہ نہ سمجھنا کہ تم فلاں صاحب کے لڑکے ہو۔ ٹانگ پکڑ کر پھینکوں گا تو اپنے گھر کے دروازے پر ہی گرو گے''۔ مجھے یقین تھا کہ مولوی صاحب یہ کر گزریں گے۔ اس کے بعد ان کی ایسی ہیبت مجھ پر طاری ہوئی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ لیکن مولوی تقی جیسا ایماندار محنتی شریف سچا اور کھرا استاد بھی میں نے پھر نہیں دیکھا۔ میرا تعلیمی دور طویل رہا۔ طرح طرح کے ماسٹر ٹیچر لکچرر ریڈر اور پروفیسر سے سابقہ پڑا۔ لیکن ان میں مولوی تقی کوئی نہ تھا۔ مولوی تقی جب ہتھیلی پر سڑاک سڑاک مارتے تھے تو ہتھیلی بھلے ہی پھٹ جاتی رہی ہو لیکن ذہن کے کئی گوشے روشن ہو جایا کرتے تھے۔ اُس وقت تو پتہ نہ تھا لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ اگر مولوی تقی اپنے چشمہ کے اوپر سے ہمیں ہر وقت نہ گھورتے اور ہماری تعلیمی کوتاہیوں اور شرارتوں پر ہماری پٹائی نہ کرتے اور ہمیں محبت سے نہ پڑھاتے تو شاید ہم وہ نہ بن پاتے جو آج ہیں۔

ہمارے درجہ میں یوں تو بہت سارے لڑکے تھے۔ میاں لوگوں کے بھی برہمنوں، ٹھاکروں، کرمیوں اور چماروں کے بھی۔ چوں کہ زمینداری کسی حد تک اس وقت بھی قائم تھی اور مسلمان زمینداروں کا اس علاقہ میں کافی اثر تھا اس لئے ہم میاں لوگ اپنے کو ذرا اونچا سمجھتے تھے۔ لیکن مولوی تقی صرف اس لڑکے کو اپر کلاس کا مانتے تھے جو پڑھنے میں ہوشیار ہوتا۔ پڑھنے میں ہم بس یوں ہی سے تھے۔ اس لئے مولوی تقی کی نظر کرم ہمیشہ اڈیا پرشاد پر رہتی تھی۔ اڈیا پرشاد برہمن تھا۔ وہ برہمن لگتا بھی تھا۔ اُنگی دھوتی اور آدھی آستین کا شلوکا پہنتا تھا۔ سر گھٹائے رہتا تھا۔ جس کے بیچوں بیچ

لمبی سی چوٹی جمی رہتی تھی۔ لال انگوچھا کندھے پر ڈالے رہتا تھا اور انتہائی صاف ستھرا رہتا تھا۔ گندگی سے اسے سخت نفرت تھی۔ وہ فرش پر ہمیشہ اکڑوں بیٹھتا تھا۔ وہ اکڑوں اس لئے بیٹھتا تھا کہ اس کے خیال میں فرش گندا ہوتا تھا اور اس پر چمار اور میاں کے لڑکے بھی بیٹھتے تھے۔ اڈیا پرشاد میاں اور چمار دونوں کو اچھوت سمجھتا تھا اور دونوں سے چار قدم دور ہٹ کر رہتا تھا لیکن مولوی تقی کا وہ نور نظر تھا کیوں کہ پڑھنے میں وہ بلا کا تیز تھا۔ اس کی گرد بھی ہم زمیندار زادے نہیں پا سکتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مولوی تقی جب زبانی سوال پوچھتے تھے تو اڈیا پرشاد کی حرکت قابل دید ہوتی تھی۔ اکڑوں تو وہ بیٹھا ہی رہتا تھا سوال پوچھنے کا وقت آتا تو وہ اور اکڑوں ہو جاتا یعنی تن جاتا۔ ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ لیتا انگوچھا کندھے پر ٹھیک کر لیتا اور مولوی صاحب پر نظریں گاڑ لیتا گویا کہہ رہا ہو۔ ''بولو مولوی صاحب کیا بولتے ہو۔'' پھر جب مولوی صاحب سوال پوچھنا شروع کرتے تو ایسا لگتا جیسے اڈیا پرشاد پر الہام ہو رہا ہو۔ وہ سوال سنتا جاتا اور داہنا ہاتھ دھیرے دھیرے اوپر کرتا جاتا اور جیسے ہی مولوی صاحب اپنا سوال مکمل کرتے اس کا ہاتھ پورا اٹھ جاتا۔ ہم میں سے بہتوں کو سوال ہی سمجھ میں نہ آتا اور ادھر اڈیا پرشاد بُد بدا کا جواب ڈھونڈ لیتا اور سوال ختم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ بھی اوپر اٹھ جاتا۔ مجال تھی کہ کسی سوال پر اڈیا پرشاد کا ہاتھ اوپر نہ اٹھا ہو یا کبھی اس کا جواب غلط رہا ہو اکثر یوں بھی ہوتا کہ پورا سوال سننے سے پہلے ہی وہ جواب بتا دیتا۔ اس پر ہڑبڑاہٹ کے جرم میں اسے سزا بھی ملتی لیکن اڈیا پرشاد ہمیشہ وقت سے آگے رہا۔

درجہ پنجم کے بعد مڈل اسکول میں ہمارا قافلہ گیا۔ مڈل اسکول بھی پرائمری اسکول کے بغل میں تھا۔ وہاں کا ماحول بھی پرائمری اسکول سے ملتا جلتا ہی تھا۔ وہاں کے ہیڈ ماسٹر مولوی امین تھے۔ مولوی تقی کی طرح تو وہ نہ تھے لیکن بڑی خوبیوں کے مالک وہ بھی تھے۔ اڈیا پرشاد یہاں بھی اپنا پرچم لہرائے ہوئے تھا۔ مولوی امین جغرافیہ پڑھاتے تھے وہ بھی کرسی پر اکڑوں بیٹھتے تھے۔ موٹے آدمی تھے اس لئے لکڑی کی کرسی میں پھنس جاتے تھے۔ اور ہلنے ڈولنے سے معذور ہو جاتے تھے۔ ان حالات میں اڈیا پرشاد ان کی مدد کرتا تھا۔ وہ دنیا کا نقشہ لاتا اسے مولوی صاحب کی بغل میں دیوار سے لٹکا دیتا۔ مولوی امین ایک لمبی چھڑی کے سہارے ہمیں نقشہ پڑھاتے تھے۔ جب کسی مقام کو نقشہ میں دکھانا مقصود ہوتا تو وہ کرسی سے اٹھے بغیر ذرا سا مڑتے اور نقشہ پر اپنی چھڑی گھمانے لگتے پھر

اسے ایک جگہ روک کر کہتے دیکھو دریائے نیل یہیں ہوگا۔ ہم دیکھتے ان کی چھڑی کا سرا واقعی نیل کے پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا نہ ایک بال اِدھر نہ ایک بال اُدھر۔ پھر چھڑی گھماتے گھماتے ایک دوسری جگہ روک دیتے اور کہتے دیکھو تو کیو یہیں ہوگا۔ اور ہم دیکھتے کہ ان کی چھڑی ٹوکیو کے اوپر دھری ہے۔ یہ تھے ماسٹر امین۔ ان کے لئے نقشہ اور چھڑی کا انتظام اڈیا پرشاد کرتا۔ کبھی کبھی مولوی صاحب سے چُوک ہو جاتی تو اڈیا پرشاد اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کہتا مولوی صاحب ذرا اوپر کرئے چھڑی۔ بس بس۔ اور وہ جگہ وہی ہوتی جسے مولوی صاحب دکھانا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب سیر تھے۔ اڈیا پرشاد سوا سیر۔ حساب اور جغرافیہ ہی میں نہیں دوسرے مضامین میں بھی اڈیا پرشاد کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ ہر امتحان میں اور ہر کلاس میں اول آتا تھا اور اول بھی اس طرح کہ دوسرے نمبر پر آنے والا لڑکا کئی چھلانگ لگاتا تب بھی وہاں نہ پہنچ پاتا۔

اڈیا پرشاد سب سے آگے بیٹھتا تھا۔ وہ جگہ منتخب کرنے میں بڑی احتیاط برتتا تھا۔ پہلے دیکھ لیتا تھا کہ اغل بغل کوئی میاں یا چمار تو نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ تو تھی ہی کہ وہ دونوں کو اچھوت سمجھتا تھا لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ اڈیا پرشاد اپنے انگوچھے میں بہت عمدہ قسم کی لائی باندھ کر لاتا تھا جس میں ہم لوگوں کی نیت اٹکی ہوتی تھی۔ میرے ساتھ میرے پھوپھی زاد بھائی محمد ایوب عرف نجن بھی تھے۔ اوّل درجے کے کائیاں۔ اڈیا ان سے بہت گھبراتا تھا۔ وہ اڈیا کی لائی پر آنکھ لگائے اور دانت گاڑے رہتے تھے۔ جب اڈیا پرشاد سفید موٹی لائی بھکر بھکر کھاتا تو نجن کی حالت غیر ہو جاتی۔ وہ کسی بہانے اس کے پاس جاتے وہ کھسکتا یہ بڑھتے وہ بھاگتا یہ لپکتے وہ رفو چکر ہو جاتا یہ بڑبڑا کر واپس آجاتے۔ دراصل ہم لوگ اس چکر میں رہتے تھے کہ اڈیا کی پوٹلی چھوڈیں بس۔ اڈیا کی پوٹلی کوئی چمار یا میاں چھوڈیتا تھا تو پھر وہ لائی نہیں کھاتا تھا۔ دوسروں کو دے دیتا تھا۔ اور چوں کہ عموماً شکار ہم ہی کرتے تھے اس لئے مال غنیمت زیادہ تر ہمارے ہاتھ لگتا تھا۔ اڈیا یہ جانتا تھا اس لئے وہ اپنی پوٹلی ہم سے بچاتا تھا۔ ہمارے ساتھ رام کبیر نام کا ایک دوسرا لڑکا بھی تھا۔ وہ چمار تھا۔ پڑھنے میں ہوشیار گول مٹول سا۔ وہ بھی ہماری ٹولی میں تھا۔ اور ہمارے ساتھ مل کر اڈیا کی پوٹلی چھونے کی تاک میں لگا رہتا تھا۔ یوں تو میاں اور چمار دونوں ہی اڈیا کے لئے اچھوت تھے۔ لیکن چمار زیادہ اچھوت تھا۔ ہمارا چھوا تو کبھی کبھی جب بھوک زیادہ ہوتی اور اڈیا کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ ہوتا تو وہ کھا بھی لیتا تھا

لیکن رام کبیر کا چھوا تو کسی حال میں کھانے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ اس لئے نجن نے رام کبیر کو پھانس رکھا تھا۔ خود بھڑنے سے زیادہ اس کو بھڑاتے تھے اور وہ اڈیا کی پوٹلی چھو دینے میں اکثر کامیاب ہو جاتا تھا۔ اس پر اڈیا پوٹلی پھینک دیتا اور ہم لوگ مل بانٹ کر لائی کھاتے اور اڈیا ہمیں پورے وقت گالی دیتا رہتا۔ کبھی کبھی جب ایسے موقع پر اڈیا کا غصہ عروج پر ہوتا تو وہ چھوئی ہوئی لائی کسی جانور کو کھلا دیتا یا اسکول کے پیچھے گڑھے میں ڈال دیتا لیکن ہمیں نہ دیتا اور اکثر یوں بھی ہوتا کہ جب وہ دیکھتا کہ ہماری لالچ بہت بڑھی ہوئی ہے اور ہم اپنی بدمعاشی میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں تو وہ خود ہی پوٹلی کھول کر ہمیں بھی لائی دیتا۔ اس وقت اڈیا ہمیں بڑا اچھا لگتا۔

مڈل اسکول ہم نے پاس کر لیا۔ میں نے سکنڈ کلاس اور اڈیا نے ٹاپ کیا۔ پھر ہم لوگ الگ الگ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ اڈیا کہاں گیا مجھے نہیں معلوم۔ وہ ہمارے گاؤں سے تقریباً چار میل دور کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ان دنوں ہمارے گاؤں کا اسکول اس علاقے کا تنہا اسکول تھا۔ اور دور دور کے گاؤں کے لڑکے وہاں پڑھنے آتے تھے۔ اس لئے اسکول چھوڑنے کے بعد کسی کو دوسرے کی خبر نہ ہوئی کہ کون کہاں گیا۔ میں شہر چلا گیا اور وہاں تعلیم جاری رکھی۔ اڈیا کا خیال اکثر آتا رہا کہ وہ جہاں بھی ہوگا سوال پوچھے جانے پر ہاتھ اسی مستعدی سے اٹھاتا ہوگا۔ پھر جب ہاتھ اٹھانے کا زمانہ چلا گیا تو سوچتا کہ وہ اپنی قابلیت کا مظاہرہ دوسرے ڈھنگ سے کر رہا ہوگا۔ اپنے کلاس میں حسب معمول ٹاپ کر رہا ہوگا۔ ڈاکٹری پڑھ رہا ہوگا، انجینئر بن رہا ہوگا، سائنس داں ہو رہا ہوگا، آئی۔ اے۔ ایس۔ کی تیاری کر رہا ہوگا۔ البتہ یہ خیال بھی آتا کہ وہ اب کس طرح رہتا ہوگا۔ کیا اب بھی اس کا سر صفا چٹ ہوگا۔ اور چوٹی بیچو بیچ جھولتی ہوگی، کیا اب بھی وہ آدھی آستین کا شلوکا اور انگی دھوتی پہنتا ہوگا۔ کیا اب بھی وہ اکڑوں ہی بیٹھتا ہوگا۔ اور انگوچھے میں لائی باندھ کر لاتا ہوگا، اور میاں اور چمار سے دور بھاگتا ہوگا۔ یا پھر وقت کے دھارے میں تیزی سے بہہ رہا ہوگا۔

وقت تیزی سے بہتا ہے۔ اسے کس نے باندھا ہے۔ تعلیم ختم کی۔ ملازمت شروع کی۔ دربدری کا دور آیا۔ گھر، گھر کی بو باس سب چھوٹی۔ نئی زندگی نے پرانی زندگی کو لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا۔ لیکن جب بھی وطن جانا ہوتا اور اسکول پر نظر پڑتی تو ایک لمحے کے لئے ماضی کے دریچوں سے گزرا وقت جھانکتا ضرور اور اُس ایک لمحے میں بھی مولوی تقی مولوی امین اور اڈیا پرشاد کی شبیہیں صاف نظر

آجاتیں۔ کہاں ہوں گے یہ لوگ مولوی تقی اور مولوی امین تو مر چکے ہوں گے اور ادیا؟ وہ ضرور کسی بڑے پروجکٹ کی تعمیر میں لگا ہوگا اور اپنی ایر کنڈیشنڈ لیبوریٹری میں کسی مسئلہ کا حل تلاش کر رہا ہوگا۔ یا پھر آئی۔اے۔ایس۔ ہو گیا ہوگا۔ اور کسی ضلع کا ڈپٹی کمشنر ہوگا۔ ہوسکتا ہے بہت بڑا سرجن بن گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے نام کی کوئی تھیوری چل گئی ہو اور وہ کسی ایٹمک رسرچ لیبوریٹری میں بیٹھا خلا میں کمندیں ڈال رہا ہو۔ ادیا ایسے جینئس کو دوسری اور کیا چیز زیب دے سکتی تھی۔

پھر کچھ سال اور گزرے میں سرکاری بڑا صاحب بن گیا تھا۔ ایک بار وطن جانا ہوا تو کسی کام سے اپنی تحصیل کے اس اسکول کے پرنسپل سے ملنے گیا جہاں سے میں نے ہائی اسکول کیا تھا۔ یہ اسکول مسلمانوں کا تھا اس کے تمام اساتذہ اور طلباء مسلمان تھے۔ ماحول سو فیصد میاں تھا۔ میں پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوا وہ بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے آنے کی غرض وغایت بتائی۔ ابھی ہماری بات چیت چل ہی رہی تھی کہ پرنسپل صاحب نے باہر آواز دی..... ''پنڈت پانی پلاؤ''

چند منٹوں بعد ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جس کا سر گھٹا ہوا تھا درمیان سے چوٹی نکل کر پشت کی طرف مڑ گئی تھی، انگی دھوتی اور آدھی آستین کا شلوکا پہنے ہوئے تھا اور کندھے پر لال رنگ کا انگوچھا ڈالے ہوئے تھا، جھکا جھکا، پٹا پٹا، ٹوٹا ٹوٹا، کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی ٹرے تھی۔ اس نے پانی سے بھرے دو گلاس ہمارے سامنے رکھ دئے۔ میں نے اس آدمی کو دیکھا تو بھک سے اڑ گیا۔ وہ ادیا پرشاد تھا۔

ادیا تم؟ میں نے بوکھلا کر پوچھا

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ لیا اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا

''ہاں۔ بابو''

''تم۔ تم۔ یہاں اور اس طرح'' میرا منھ کھل گیا تھا

''ہاں بابو اسی اسکول میں چپراسی ہوں اور بھیا لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں''

اس نے پرنسپل سید عنایت اللہ صاحب کی طرف اشارہ کیا اور پھر اسی طرح ہاتھ باندھے چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔

(جولائی ۱۹۹۹)

اصحاب فیل

شام اتری تو ابوالخیر ہائی اسکول کا آخری گھنٹہ بجا اور متعدد لڑکے جن کی عمریں پندرہ سولہ سال کی تھیں، اپنا بستہ پیٹھ پر باندھ کر نکل گئے۔ لیکن ان کا رخ ان کے گھروں کی طرف نہیں تھا بلکہ کرنی پوسٹ کی طرف تھا۔ کرنی پوسٹ غازہ اسٹرپ میں بیت الحنون مقام کا ایک حصہ تھا جس پر اسرائیلیوں نے زبردستی قبضہ کرلیا تھا۔ وہاں کا فوجی کمانڈر سمیر یا خوف کٹر یہودی تھا اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ وہ فلسطینیوں کے دلوں میں خوف وہراس پیدا کرنے کے لئے ان کی آبادی پر رہ رہ کر راکیٹ داغتا رہتا تھا جس سے لوگ زخمی ہوتے تھے۔ کچھ لوگ تو شہید بھی ہو چکے تھے۔ لیکن فلسطینیوں کے دلوں میں جذبہ آزادی کسی طرح کم نہ ہوتا تھا اور وہ اپنے دشمن کو زک دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ان کی اولادوں میں بھی جذبہ جہاد ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ جب سے اسرائیلیوں نے ان کے علاقہ پر قبضہ کیا تھا ابوالخیر ہائی اسکول کے لڑکوں نے شام میں کھیلنا بند کر دیا تھا۔ اسکول کا آخری گھنٹہ بجتا تو ان کا غول اپنے بستوں کو اپنی پیٹھوں پر باندھ کر کرنی پوسٹ کی طرف نکل جاتا۔ وہاں وہ دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں بٹ جاتے اور اِدھر اُدھر سے اسرائیلی فوجیوں پر پتھر برساتے۔ اس پر اسرائیلی فوجی انہیں کھدیڑتے ہوئے ان کی آبادی تک

چھوڑ آتے۔ کبھی کبھی وہ فائر بھی کر دیتے جس سے کوئی لڑکا زخمی بھی ہو جاتا لیکن اس سے مجاہدین کے حوصلے پست نہ ہوتے۔ دوسرے دن بھی وہ اسکول کے آخری گھنٹہ کا انتظار کرتے اور جب چھٹی کا اعلان ہوتا تو وہ اپنے اپنے بستوں کو اپنی پیٹھوں پر کس کر بیت الحنون کی اس پوسٹ کی طرف نکل جاتے جس پر یہودیوں نے زبردستی قبضہ کر رکھا تھا۔ وہاں وہ حسب معمول فوجیوں پر پتھراؤ کرتے اور جب اسرائیلی فوجی انہیں دوڑاتے تو وہ بھاگ کر اپنی بستی میں چلے آتے۔

یہ آنکھ مچولی چھ مہینوں سے چل رہی تھی۔ اس عرصے میں ابوالخیر ہائی اسکول کے تقریباً تمام طالب علموں کے جسموں پر گولیاں لگ چکی تھیں اور وہ اپنے زخموں کے نشان بڑے فخر سے دکھلاتے تھے۔ بیت الحنون پر اسرائیلیوں کا قبضہ ہونے سے قبل ابوالخیر ہائی اسکول کے لڑکے کرنی پوسٹ پر گیم کھیلنے جایا کرتے تھے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ شام کو اسکول بند ہوتا تو وہ وہاں جاتے اور اپنے اپنے پسندیدہ کھیل کھیلتے۔ احمد اور اس کے ساتھیوں کا پسندیدہ کھیل فٹ بال تھا۔ جس دن اسرائیلیوں نے اس مقام پر قبضہ کیا تھا احمد اور اس کے ساتھی وہاں فٹ بال کھیل رہے تھے۔ احمد نے فٹ بال پر ایک شاندار کک لگائی تھی اور گیند پوسٹ کمانڈر سمیر یا خوف کے سر سے ٹکرائی تھی۔ اس نے فٹ بال کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا اور لڑکوں کو اپنی رائفل دکھاتے ہوئے بولا تھا کہ کل سے تم لوگ اِدھر مت آنا ورنہ گولی مار دوں گا۔ اب یہاں ہمارا قبضہ ہے۔ اُس دن لڑکے ڈرے سہمے واپس آ گئے تھے لیکن دوسرے دن جب اسکول کا آخری گھنٹہ بجا تو ان کے قدم خود بخود پلے گراؤنڈ کی طرف اٹھ گئے اس فرق کے ساتھ کہ اس دن اُن کے ہاتھوں میں فٹبال نہ تھا، پتھر تھے اور انہوں نے اسرائیلی فوجیوں پر پتھراؤ شروع کر دیا تھا۔ سمیر یا خوف کی آنکھیں لڑکوں کی اس جرأت سے سرخ ہو گئی تھیں اس نے رائفل اٹھا کر ان پر فائر کر دیا تھا اور اس طرح پہلی بار ٹیم کے کپتان احمد کے پیٹ میں گولی لگی تھی اور وہ کئی دنوں تک اسپتال میں پڑا رہا تھا۔

پھر ان لڑکوں کا معمول بن گیا۔ دن بھر کی پڑھائی کے بعد جب آخری گھنٹہ بجتا تو وہ اپنے بستوں کو اپنی پیٹھوں پر باندھ کر اور ہاتھوں میں پتھر لے کر کرنی پوسٹ کی طرف دوڑ پڑتے اور اسرائیلی فوجیوں پر پتھراؤ کرنے لگتے اور جب ان پر فائرنگ ہوتی یا فوجی انہیں کھدیڑتے تو وہ بھاگ

کر اپنی بستی میں چلے آتے۔

پتھراؤ کرتے کرتے چھ مہینے گزر گئے تھے۔اس عرصے میں احمد کے جسم میں مختلف زخموں پر ۳۰ ٹانکے لگ چکے تھے۔اس کے تمام ساتھیوں کے جسموں پر گولیوں کے نشان پڑ چکے تھے۔تین ساتھی شہید ہو گئے تھے دو پیروں سے مجبور ہو گئے تھے۔ایک کا ہاتھ کٹ گیا تھا اور ایک آنکھیں کھو بیٹھا تھا۔لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے تھے۔انھوں نے قسمیں کھا رکھی تھیں کہ جب تک وہ اپنی زمین سے اسرائیلیوں کو بھگا نہیں دیتے وہ جہاد کرتے رہیں گے۔چاہے ان سب کی جانیں ہی کیوں نہ چلی جائیں.....اسرائیلی کمانڈر سمیریا خوف سخت پریشان تھا۔غازہ اسٹرپ میں شام اترنے لگتی اور لڑکوں کے آنے کا وقت ہوتا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان بے خوف اور سرفروش لڑکوں کو اپنی حرکتوں سے کس طرح باز رکھا جائے۔اس کے پاس فوجی تھے رائفلیں تھیں، راکٹ تھے، بم تھے اور ان لڑکوں کے پاس صرف ڈھیلے تھے پھر بھی وہ پریشان تھا۔ان کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ نروس ہو جاتا۔اس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے توپ سے کھیلا تھا آگ میں کودا تھا، طوفان سے ٹکرایا تھا، لیکن اتنا نروس اور پست ہمت کبھی نہ ہوا تھا جتنا چھ مہینے کے اندر ان لڑکوں نے اپنے ڈھیلوں سے اسے کر ڈالا تھا۔اس نے جھنجھلا جھنجھلا کر کئی بار ان لڑکوں سے پوچھا تھا کہ گولیوں کا مقابلہ پتھروں سے کرنے وہ کیوں آتے ہیں وہ کیا چاہتے ہیں۔اس پر ان لڑکوں نے ہر بار یہی کہا تھا کہ وہ اپنی زمین اس کے ناپاک قدموں سے پاک کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ انہیں شہید ہونے کا شوق ہے۔

اس دن بھی وہ سخت نروس تھا۔لڑکوں کو آتے دیکھا تو چلا کر انہیں گالی دی۔

''یو اسکاونڈرلس۔سن آف دی بچ۔پھر آ گئے۔آخر تم چاہتے کیا ہو''؟

لڑکوں نے چلا کر جواب دیا۔''تم نے ہماری زمین ناپاک کر ڈالی ہے ہم اسے پاک کرنا چاہتے ہیں''۔

سمیریا خوف بڑی دہشت ناک ہنسی ہنسا۔''پتھروں سے''؟

''ہاں''

''تمہیں یقین ہے کہ تم پتھروں سے ہمیں بھگا دو گے''

''ہاں۔ہمیں یقین ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ ابرہہ کی فوج کو ابابیلوں کی کنکریوں نے کس طرح بھوسا کر ڈالا تھا''۔لڑکوں نے ایک ساتھ کہا۔

سمیر یا خوف غصے سے دانت کٹکٹانے لگا۔اس نے رائفل تان لی لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا زناٹے دار ایک پتھر اس کے ہاتھ پر پڑا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔لڑکوں کو گالیاں دیتا ہوا وہ خیمے میں چلا گیا۔

پھر ایک دن جب اس کا ایک فوجی اپنی ٹانگیں گھسیٹتا ہوا اس کے خیمہ میں آیا تو اس نے اس سے اس طرح بلبلانے کی وجہ پوچھی اس پر اس فوجی نے بتایا کہ لڑکوں نے آج اس کا گھٹنا توڑ دیا۔سمیر یا خوف ہنس پڑا۔

''پتھر لگنے سے تمہارا گھٹنا ٹوٹ گیا۔موم کا بنا تھا؟''

فوجی کو غصہ آ گیا۔بڑی تلخی سے بولا۔''ان کے پتھروں میں اتنی کاٹ ہے کہ اگر یوروشلم کی پارلیمنٹ پر گریں تو وہ بھی ٹوٹ جائے''

سمیر یا خوف کو فوجی کی یہ جرأت پسند نہ آئی اس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر گھونسہ مار دیا۔ ''تم ان ذلیل چھوکروں سے ڈر گئے۔میں تمہارا کورٹ مارشل کر دوں گا''

وہ پھنکارتا ہوا رائفل لئے خیمہ سے باہر آیا اور لڑکوں کی ٹولی پر فائر کر دیا۔گولی احمد کے سینے پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔لیکن سمیر یا خوف کو اپنی اس حرکت پر کوئی خوشی نہ ہوئی اور جب لڑکے اپنے کپتان کے مردہ جسم کو لے کر اپنی بستی کی طرف جانے لگے تو اس نے فوجیوں کو خیمہ میں واپس جانے کا حکم دیا اور خود مغربی گھاٹ میں سورج کو غروب ہوتے دیکھتا رہا یہاں تک کہ اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا۔

اگلے دن خیمہ سے باہر وہ چہل قدمی کر رہا تھا۔وہ مطمئن تھا کہ لڑکے اب نہیں آئیں گے۔کل کے حادثہ سے ڈر گئے ہونگے۔ان کے والدین نے بھی ان پر پہرہ لگا دیا ہوگا۔یہ سوچ کر وہ کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔اپنی خوشی اور اطمینان کا اظہار کرنے کے لئے اس نے منہ سے سیٹی بجائی۔

ایک بار دو بار لیکن تیسری بار جب اس نے سیٹی بجانے کے لئے ہونٹ سکوڑے تو ہوا باہر نہ نکلی اندر ہی اندر پھس ہو کر رہ گئی۔ دور سے اسے لڑکوں کا جھنڈ آتا ہوا دکھادے گیا تھا۔ وہ غصہ سے کانپنے لگا اور کھنکھار کھنکھار کر لڑکوں کے نام پر زمین پر تھوکنے لگا اور گالی بکنے لگا۔ وہ تھوکتا جاتا تھا اور گالی بکتا جاتا تھا پھر جب لڑکے قریب آ گئے تو اس نے بڑی شدّت سے کھنکھارا اور جب زمین پر تھوکا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کا تھوک خون آلود تھا ''کتوں کی یہ اولاد مجھے مار ڈالے گی۔''

وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ دوڑتا ہوا خیمہ کے اندر گیا۔ رائفل لی اور باہر آ کر لڑکوں پر فائر کر دیا۔ اس بار گولی وائس کپتان ایاز کے پیر پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ سمیر یا خوف نے اپنا سر پکڑ لیا اور ہائے کہہ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن حسب معمول جب لڑکے اپنے مشن پر آئے تو انہوں نے وہاں سناٹا پایا۔ دو چار فوجی اِدھر اُدھر پٹرولنگ کرتے دکھائی دیئے لیکن سمیر یا خوف کا کہیں پتہ نہ تھا۔ یہ دیکھ کر لڑکوں کے چہرے اتر گئے۔ اب وہ کس پر پتھر پھینکیں گے۔ دشمن تو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھرڈ اِن کمانڈر محمود نے آواز دے کر ایک فوجی سے پوچھا۔

''ہمارا دشمن سمیر یا خوف کہاں ہے''؟

فوجی نے ایک نظر لڑکوں پر ڈالی پھر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ لڑکوں نے اپنے قدم زمین پر جما لئے اور پتھروں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر لی اور شہباز کی طرح پر تولنے لگے لیکن فوجی نے ہاتھ اوپر کر لیا اور بدستور ان کی طرف قدم بڑھاتا رہا۔ اس کے پاس رائفل بھی نہیں تھی۔ اس پر لڑکوں کو زیادہ حیرت ہوئی ''شاید بم ہو۔ ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے''..... انہوں نے آپس میں کھسر پھسر کی۔ فوجی ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''سمیر یا خوف کہاں ہے آج وہ ہمیں گالی دینے اور ہم پر فائر کرنے کے لئے موجود کیوں نہیں ہے''..... محمود نے پوچھا۔

''وہ سخت بیمار ہے۔ کیمپ میں پڑا خون تھوک رہا ہے پتہ نہیں یکا یک اسے کیا ہو گیا''..... فوجی نے بڑے دھیمے لہجے میں بتایا۔

ہاشمی کی شخصیت سے کچھ اس طرح جڑ گئے ہیں کہ اب یہی ان کا شناختی کارڈ ہیں۔

جنوری ۲۰۰۰ء میں ''ورق ورق اضطراب لکھوں'' کے نام سے راقم الحروف نے ہاشمی کے اداریوں کا انتخاب کتابی شکل میں مرتب کیا۔ اس کتاب میں ہاشمی کے ۶۲۔ اداریے شامل ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے دو مضامین بھی کتاب میں شامل کئے۔ پہلا مضمون سید ظفر ہاشمی کی ''اردو خدمات۔ گجرات کے حوالے سے'' اور دوسرا مضمون ''یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے'' اداریوں کے محرکات نتائج اور تاثرات کا اجمالی جائزہ ہے۔ ہاشمی کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب مفید قرار دی گئی۔ ہاشمی کے لئے مزید کچھ لکھتے ہوئے مجھے خود کو دہرانے کے ناپسندیدہ عمل سے گزرنا قبول نہ تھا مگر چند باتوں کو صرف اس غرض سے دہرانا پڑا کہ ان کی مدد سے ہاشمی کے افسانوں کے مطالعہ میں بھی آسانی ہو سکتی ہے۔ آپ ان باتوں کو تمہید سے منسوب کر سکتے ہیں۔

ہاشمی کی ادبی اور صحافتی تمام نگارشات کے مابین جو شئے قدر مشترک ہے اسے میں ''عصری آگہی'' کا نام دوں گا۔ ہاشمی نے جہاں صحافت کو ادبی معیار عطا کیا، وہیں ادب کو صحافت بننے سے بھی بچالیا۔ اس دو دھاری تلوار کا سفر انہوں نے بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ اس بات کی صداقت کے لئے مجھے ان کا ایک افسانہ ''رُکا ہوا فیصلہ'' مل گیا۔ جسے پڑھتے ہوئے ان کا اِک اداریہ ''ٹھنڈے پانی کا چشمہ اور پیاسا'' یاد آگیا میں نے یہ اداریہ اپنی مرتبہ کتاب میں شامل کیا تھا اور اپنے جائزہ میں اس پر گفتگو بھی کی تھی۔ ایک ہی حقیقت، بیان کرنے والا ایک ہی شخص۔ البتہ اداریہ اور افسانہ لکھتے وقت دو مختلف انداز۔ صحافت اور ادب کو ایک دوسرے سے کس طرح خلط ملط ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس کا بہترین نمونہ پیش کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

گلبن (شمارہ ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۰ء) کے ذریعہ ہاشمی نے ایک مسلم ٹرسٹ کا واقعہ بیان کیا تھا۔ ٹرسٹ کے پاس زیر کفالت سو (۱۰۰) سے کم یتیم بچوں کی پرورش کے لئے کروڑوں کی جائیداد ہے۔ ہر سال اس پر لاکھوں روپے کی آمدنی کا سلسلہ جاری ہے۔ جائداد کو چھوڑیئے صرف اس پر ہونے والی سالانہ آمدنی کا 10% حصہ ہی تمام اخراجات کے لئے ضرورت سے زیادہ ہے۔ ٹرسٹ کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ افراط زر کا ہے۔ بقیہ رقم اتنی ہے کہ کب کیا فتنہ کھڑا ہو جائے کوئی نہیں جانتا۔ حکومت کی دخل اندازی، انکم ٹیکس، بینک سود، انتظامیہ کے آپسی معاملات، اور دین

یہ سن کر لڑکوں کی کسی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ ان کے ہاتھوں سے پتھر سرک کر زمین پر آرہے..... ''سچ''؟

''ہاں سچ''

لڑکے افسردہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ان میں سے ایک نے پوچھا ''کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں''

فوجی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر سبھوں کو دیکھا، سبھوں نے تائید میں گردن ہلائی۔ جواب میں فوجی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ بولا۔ ''چلو'' آگے آگے وہ پیچھے پیچھے ابوالخیر ہائی اسکول کے مجاہدین۔ ان کے چہروں پر خوف و ہراس کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھے۔ ان کی پیٹھوں پر اسکول کے بستے ہنوز بندھے تھے۔ اسرائیلی فوجی سب کو لے کر سمیر یا خوف کے خیمہ میں داخل ہو گیا۔

سمیر یا خوف بستر پر پڑا تھا۔ اپنے دشمنوں کو اپنے خیمے میں دیکھ کر وہ سخت حیران ہوا۔

''یہ لوگ آپ سے ملنا چاہتے تھے'' اسرائیلی فوجی نے اسے بتایا

''کیوں''؟ سمیر یا خوف نے بڑی نحیف آواز میں پوچھا۔ اس پر ایک لڑکا آگے بڑھا اور اس کے قریب جا کر بولا۔

''آپ سے روزانہ مڈبھیڑ ہوتی تھی۔ آپ روزانہ ہمیں گالیوں اور گولیوں سے نوازتے تھے۔ آج یہ سب کرنے کے لئے آپ باہر موجود نہ تھے تو ہمیں تشویش ہوئی۔ دریافت کرنے پر اس فوجی نے بتایا کہ آپ سخت بیمار ہیں۔ یہ جان کر ہمیں افسوس ہوا اور ہم آپ کی عیادت کو آگئے''

''لیکن میں تمہارا دشمن ہوں'' سمیر یا خوف کا چہرہ سپاٹ اور آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ لڑکے نے جواب دیا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے آقا حضور ﷺ نے یہی کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک بڑھیا ان کی دشمن تھی۔ حضور ﷺ جب اس راستے سے گزرتے تو وہ ان پر کوڑا پھینک دیتی تھی ایک دن اس نے کوڑا نہیں پھینکا تو حضور ﷺ کو تشویش ہوئی۔ انھوں نے اس بڑھیا کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ اس بڑھیا کی خیریت دریافت کرنے اس کے گھر چلے گئے..... یہ درست ہے کہ آپ کی قوم غاصب ہے۔ اس نے ہماری زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہمیں

گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔ آپ کی قوم ہماری ہی نہیں پورے عالم اسلام کی دشمن ہے۔ یہ حقیقت ہے ۔لیکن آپ سخت بیمار تھے اور بیمار کی عیادت کرنا اس کا حوصلہ بڑھانا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ دیکھئے ہم نہتے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں پتھر نہیں ہیں ہم صرف آپ کی خیریت پوچھنے آئے ہیں''

سمیر یا خوف کچھ نہ بولا۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا اور چادر کھینچ لی۔ تھوڑی دیر لڑکے خاموش کھڑے رہے پھر فوجی کے اشارے پر دبے دبے قدموں واپس خیمہ سے باہر نکل گئے۔

اگلے دن ابوالخیر ہائی اسکول کی آخری گھنٹی بجی تو مجاہدین لڑکوں کا غول حسب معمول محاذ کی طرف دوڑا لیکن وہاں سناٹا کل سے زیادہ تھا۔ نہ کوئی فوجی تھا اور نہ ہی کوئی خیمہ۔ لڑکوں کو سخت حیرانی ہوئی کہ ایک رات میں چپ چاپ یہ علاقہ کیسے خالی ہو گیا۔ اسرائیلی فوجی کہاں گئے اور ان کے خیمے کس نے اکھاڑے۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ اتنے میں انہیں ایک چرواہا آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ دور ہی سے ہاتھ ہلا کر ان کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے ایک کاغذ لڑکوں کی طرف بڑھایا جسے ان میں سے ایک نے پکڑ لیا۔ وہ ایک خط تھا جسے سمیر یا خوف نے ان لڑکوں کو لکھا تھا۔

''پیارے بچو''

''ہم یہ علاقہ تمہارے لئے خالی کر کے جا رہے ہیں۔ ابوالخیر ہائی اسکول کے آخری گھنٹہ کا تم لوگ کل بھی انتظار کرنا اور جب وہ بجے تو حسب معمول بستوں کو اپنی پیٹھوں پر باندھے تم اس طرف دوڑتے ہوئے چلے آنا۔ یہاں تمہارا انتظار رائفل کی گولی نہیں کرے گی بلکہ.....؟

اس نے خط ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

لڑکوں کے چہروں پر سوالیہ نشان ابھرا تو چرواہے نے اپنا ہاتھ اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا وہاں زمین پر وہی فٹ بال رکھا تھا جسے پہلے دن سمیر یا خوف نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔

لڑکے خوشی کا نعرہ لگاتے ہوئے فٹ بال کی طرف دوڑے اور ان میں سے ایک نے لپک کر اسے زبردست کک لگائی۔ فٹ بال اچھلا اور ٹھیک اس جگہ جا کر گرا جہاں کل تک سمیر یا خوف کا خیمہ تھا۔

(نومبر ۲۰۰۱)

ستی

راج گڑھ اب صوبہ راجستھان ہی میں نہیں پورے ملک میں مشہور و معروف ہے۔ پہلے یہ ایک بہت معمولی گاؤں تھا۔ اراولی پہاڑیوں کے دامن میں چھپا ہوا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور بھیڑ بکریاں پالنے اور ان کا کاروبار کرنے والے گڑریوں سے آباد، سویا سویا سا گاؤں تھا۔ شہر کی رنگینیوں ہنگاموں اور تہذیبوں سے پرے اپنی بے خبری اور لاعلمی میں مست خود کو نظام قدرت کے حوالے کئے ہوئے تھا۔ نہ بجلی تھی نہ پانی کا نل، نہ سڑکیں تھیں، نہ ٹیلیفون کے کھمبے نہ ٹی وی تھا نہ انٹرنیٹ نہ بازار تھا نہ ہوٹل، نہ شور تھا نہ غل۔ پتھریلی اور نیم بنجر زمین کانٹے دار خودرو پودے تھے۔ دور دور تک پھیلے میدان اور ان میں چرتی ہوئی بھیڑیں اور بکریاں تھیں اور کچے مکانوں نیز جھونپڑوں کا بے ترتیبی سے پھیلا ہوا ایک سلسلہ تھا۔ اوپر کھلا آسمان تھا جس پر اپنے اپنے وقت سے سورج چاند تارے اگا کرتے اور بادل تیرا کرتے۔

راج گڑھ کے باسیوں کو بس اتنا ہی مقدر سے ملا تھا۔

لیکن کسی کا وقت ایک جیسا نہیں رہتا نہ اچھا نہ برا۔ ایسا بزرگوں نے کہا ہے پتہ نہیں غلط

ہے یا صحیح لیکن بزرگوں نے کہا ہے تو ہم بھی مان لیتے ہیں اور راج گڑھ کے حوالے سے تو ہم سب کو ماننا ہی ہوگا کہ اس گاؤں کا وقت بدلا اور اتنے دھماکے سے بدلا کہ آج کل ہر کوئی راج گڑھ سے واقف ہے۔ اس کا نام جب بھی کوئی لیتا ہے تو عقیدت مند مون دھارن کر کے اپنا سر بڑی شردھا سے جھکا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ اس گاؤں کے اوپر سے گزرتا ہوا ہوائی جہاز بھی سرنگوں ہو جاتا ہے۔

بات زیادہ پرانی نہیں ہے بس تین چار برسوں کی کہانی ہے۔ لیکن اس بات کو کہانی کہنا بھی غلط ہے کہ کہانی بُنی جاتی ہے بُن کر کہی یا لکھی جاتی ہے اور یہاں تو بس ایک چتا جلی تھی اور دیکھتے دیکھتے سب کچھ روشن ہو گیا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ رام دین مر گیا تھا۔

لیکن رام دین مر گیا تھا تو کون سی نئی بات ہو گئی تھی۔ ہمارے ملک میں لاکھوں رام دین چپ چاپ چلے جاتے ہیں کھانستے ہوئے، خون تھوکتے ہوئے، اپنے زخموں کے پیپ بہاتے ہوئے، سوکھتے گلتے مر جاتے ہیں۔ گاؤں والے کریا کرم کر دیتے ہیں۔ گھر والے رو پیٹ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ راج گڑھ میں بھی یہی ہوا تھا کہ کھیتوں میں کام کرنے والا ایک مزدور ٹھرا پیتے پیتے اپنا جگر خراب کر بیٹھا تھا۔ بیڑی پیتے پیتے اپنا پھیپھڑا گنوا بیٹھا تھا۔ اور فاقے کرتے کرتے اپنی آنتوں کو زخمی کر ڈالا تھا۔ اور پھر ایک دن کمبخت اپنی کٹیا میں پڑا پڑا مر گیا اور پیچھے دو چھوٹے چھوٹے بچے اور ایک جوان عورت چھوڑ گیا۔ پھر یہ کوئی نئی بات تو ہوئی نہیں۔

نئی بات تو یہ ہوئی کہ

تلسی اپنے دونوں بچوں کو لپٹا کر پہلے تو چیخ مار مار کر خوب روئی۔ سینہ کوبی کی پھر ایک دم خاموش ہو گئی جیسے آواز گلے میں اٹک گئی ہو، آنسو ختم ہو چکے ہوں، ہاتھوں میں دم نہ رہا ہو اور ہوش گم ہو گئے ہوں۔ اس نے بڑی بے رحمی سے بچوں کو اپنے سے الگ کیا اور شوہر کی لاش کے پاس بت بن کر بیٹھ گئی۔

لیکن رام دین کی جب ارتھی اٹھی تو وہ بھی ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی اور ارتھی کے پیچھے

پیچھے جانے لگی۔ لوگوں نے سمجھایا کہ مرگھٹ پر اسے نہیں جانا چاہئے لیکن وہ نہ مانی اور کچھ فاصلے سے وہ ارتھی کا پیچھا کرتی رہی۔ شمشان گھاٹ پر ارتھی کو چتا پر لٹا دیا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ وہ چند گز کی دوری سے ارتھی کو شعلوں میں گھرتا دیکھتی رہی۔ لوگ سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کسی کا دھیان اس کی طرف نہ تھا۔

دفعتاً وہ تیزی سے دوڑی اور چتا کی بھڑکتی آگ میں کود پڑی۔

بس اُسی ایک آوارہ اور جنونی لمحے نے راج گڑھ کی تقدیر بدل ڈالی

تلسی ستی ہوگئی۔ یہ بات گاؤں سے نکل کر جیسے ہی شہر پہنچی اخباروں کے نمائندے، ٹی وی، چینل کے کیمرے، پولیس کے عملے، سرکاری افسروں کے ٹولے ایک دوسرے پر سبقت لیتے ہوئے وہاں دوڑے۔ اخباروں اور ٹی وی کے کیمروں نے ہر زاوئے سے اس جگہ کا فوٹو لیا جہاں رام دین کی ارتھی جلائی گئی تھی اور تلسی خود جل مری تھی۔ پولیس والوں نے اس جگہ کو گھیر لیا اور ڈنڈا بجانے لگے علاقہ کا پولیس انسپکٹر بولسٹر میں پستول کھونسے وہاں جوق در جوق آنے والوں کو ہدایت دینے لگا۔

''ستی استھل کے نزدیک مت جاؤ! درشن دور سے کرو''

راج گڑھ کی تقدیر بدلنے میں جنتا کا ہاتھ تو تھا ہی کہ اس نے ستی استھل پر سرخ اور سفید ماربل کا ایک عالیشان مندر بناڈالا اور ملک کے کونے کونے سے ستی تلسی ماں کا درشن کرنے آنے لگی۔ لیکن جنتا سے بڑا کارنامہ تو سرکار نے انجام دیا تھا کہ اس نے راج گڑھ کو فٹافٹ بجلی فراہم کردی تھی، پتھروں کی صاف ستھری سڑکیں بنواڈالیں تھیں جن پر بسیں، کاریں اور دوسری سواریاں دوڑنے لگی تھیں۔ ٹیلی گراف کے دفتر کھول دئے تھے۔ ٹیلیفون ایکسچینج بناڈالے تھے، ریڈیو اور ٹی وی کے ٹاور کھڑے کردئے تھے، اسپتال اور اسکول قائم کردئے تھے اور پانی کی ریل پیل کردی تھی غرضکہ آرام دہ زندگی کی ساری سہولتیں فراہم کردی تھیں۔ سرکار کا جوش وولولہ دیکھ کر بینکوں اور بیمہ کمپنیوں نے اپنی اپنی شاخیں وہاں قائم کردی تھیں۔ پرائیویٹ بلڈرس بھی میدان میں کودے تھے۔ اور انجر پنجر زمین خرید کر وہاں بنگلے اور اپارٹ منٹس بناڈالے تھے۔ سنیما ہال، کمیونٹی سینٹر یہاں تک کہ چکلے بھی کھل گئے تھے اور دیکھتے دیکھتے اراولی پہاڑیوں کے دامن میں سویا سویا، کھویا کھویا مفلوک الحال راج گڑھ

ہمکتا دمکتا ایک شہر بن گیا تھا اور وہاں کے اصل رہنے والے نئی تہذیب کا ایک حصہ بن کر پھولنے پھلنے اور پھیلنے لگے تھے۔

ضلع باندہ کے گھمریا گاؤں میں بھی اس کی شہرت پہنچی۔ وہاں سے کچھ لوگ ستی ماتا کے درشن کو آئے۔ ان لوگوں نے راج گڑھ کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن لوگوں سے اس کی خستہ حالی کی داستان سنی تھی اور وہ داستان تقریباً ویسی ہی تھی جیسی ان کے اپنے گاؤں گھمریا کی تھی۔ لیکن ستی ماتا کی کرپا سے راج گڑھ میں ہُن برسنے لگا تھا زندگی کی تمام سہولتیں وہاں میسر ہوگئی تھیں۔ یہاں تک کہ کچھ سہولتیں ایسی بھی سرکار نے وہاں مہیا کردی تھیں جو بڑے بڑے شہروں میں بھی نہ تھیں۔ وہاں ایک ہیلی پیڈ بھی بن گیا تھا اور نیتاؤں کو سیدھے دلّی سے اُڑ کر وہاں پہنچنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ گھمریا گاؤں کے لوگ راج گڑھ کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ جھونپڑے میں رہنے والی ایک غریب، جاہل اور گنوار عورت نے کس طرح اس گاؤں کا نصیب بدلا تھا۔ اس بات کا ذکر ہر ایک زبان پر تھا۔

پھر یوں ہوا کہ گھمریا گاؤں میں جگیسر نام کا ایک شخص جس کی ابھی ابھی شادی ہوئی تھی اپنی موت مر گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے آپس میں باتیں کیں کہ کتنے الیکشن آئے کتنی درخواستیں دی گئیں خوشامدیں کی گئیں صاحب لوگوں کے ہاتھ بھی کئی بار گرم کئے گئے لیکن گاؤں میں پانی کا ایک نل تک نہ لگ سکا۔ پکی سڑک اور بجلی کا تصور تو کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ شہر سے کافی دور یہ گاؤں تھا۔ اس کے اطراف میں اوسر بنجر زمینیں تھیں تھوڑی بہت کھیتی ہو جاتی تھی۔ مویشی پالنے اور محنت مزدوری کرنے کے علاوہ وہاں کے مکینوں کے پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہ تھا۔ نزدیک ترین بازار بھی دس کلومیٹر دور تھا۔ وہیں پولیس چوکی بھی تھی۔ اس گاؤں کو شہر کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ یوں کہئے کہ گھمریا اور پرانے راج گڑھ میں کوئی فرق نہ تھا

لیکن راج گڑھ ....

جو لوگ راج گڑھ میں ستی ماتا کا درشن کر آئے تھے اور صورت حال سے بخوبی واقف تھے، انہوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ہر آنکھ میں راج گڑھ پوری آب و تاب کے ساتھ ہلکورے لے رہا تھا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کیا سب کی آنکھوں

میں ایک جیسا جواب تھا۔ انہوں نے جگیسر کے بڑے بھائی کو بلوایا اور اس کے شعور میں راج گڑھ پوری شدت سے داخل کر دیا۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں سے بھی مشورہ کیا گیا اور پھر سبھوں نے مل کر فیصلہ کر ڈالا کہ جگیسر کی بیوہ کو ارتھی کے ساتھ جلا دیا جائے۔

اور پھر وہی ہوا جو سب کا فیصلہ تھا۔

خبر ملتے ہی پولیس کا عملہ، اخباروں کے رپورٹر، ٹی وی چینل کے کیمرے، سرکاری افسران کے ٹولے ایک دوسرے پر سبقت لیتے ہوئے وہاں دوڑے۔ اخباروں اور ٹی وی کیمروں نے ہر زاوئے سے اس چتا کا فوٹو لیا جس میں جگیسر کی عورت اپنے آدمی کی لاش کے ساتھ گاؤں والوں کے بقول ستی ہوگئی تھی۔ پولیس والوں نے اس جگہ کو گھیر لیا اور ڈنڈا بجانے لگے پولیس انسپکٹر اپنے بولسٹر میں پستول کھونسے وہاں جوق در جوق آنے والوں کو ہدایت دینے لگا۔

''ستی استھل کے نزدیک مت جاؤ۔ درشن دور سے کرو۔''

اور پھر دیکھتے دیکھتے گھمریا گاؤں ملک کے گوشے گوشے میں گھومنے لگا اور انتظامیہ تمام تر قیاتی منصوبوں کو لے کر اس کے محور پر نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ بڑی تیزی سے گردش کرنے لگی۔

(مئی ۲۰۰۱ء)

جوٹھن

یہی شہر کا وہ خوبصورت علاقہ ہے جہاں میں رہتا ہوں اور یہ رہی لا بیلا بلڈنگ۔ اسی میں دوسری منزل پر میرا کمرہ ہے۔ آیئے۔ یہ رہا وہ کمرہ۔ وہ کھڑکی جو کھلی ہے نہ، ہمیشہ کھلی رہتی ہے، وہاں سے تین خاص چیزیں آپ آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ آیئے دکھلاؤں۔ وہ دیکھئے نیچے کتنی خوبصورت سڑک ہے۔ کالی، چکنی بل کھاتی ہوئی سڑک اور اس پر رینگتی ہوئی کاریں، لمبی لمبی کاریں جن کا اگلا اور پچھلا دونوں حصہ ایک جیسا لگتا ہے، نازک نازک کاریں جنھیں چھوتے ہوئے ڈر لگے کہ کہیں میلی نہ ہو جائیں۔ نیلی پیلی، گلابی کاریں جو پاس سے گزریں پھر بھی خبر نہ ہو، مگر خبر کیوں نہ ہو، ان کے گزرنے پر خوشبو کا جھونکا جو گزرتا ہے، وہ کسی کو بے خبر کیسے رہنے دے گا۔ اس کے علاوہ پچھلی سیٹ پر جو گول مٹول بلا بیٹھا رہتا ہے وہ پک کہہ کر آپ کو خبر دار کر ہی دے گا۔ اسی سڑک پر شام کو موٹے سیٹھوں کی نازک البیلی داشتائیں اور رشوت خود افسروں کی نوعمر بیویاں ہولے ہولے چہل قدمی کرتی ہیں۔ دوسری چیز جو آپ دیکھیں گے وہ سیٹھ جمنا داس کا بنگلہ ہے۔ وہ دیکھئے وہ۔ کیسا لگتا ہے؟ لگتا ہے نہ کہ جیسے کوئی ناؤ سفید بادبان کے سہارے اپ اسٹریم کی طرف پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو، اور تیسری چیز ہے وہ درخت، گل مہر کا وہ خوبصورت، درخت جو جمنا داس کے بنگلے کے سامنے سڑک

کے دوسری طرف ہے۔ اِس طرف اس لئے نہیں ہے کہ اِدھر تو سرو کے لمبے لمبے درخت ہیں اور ان تینوں چیزوں کے علاوہ ایک چیز اور آپ دیکھتے اگر میں اخبار کا رپورٹر نہ ہوتا۔

اِسی گُل مہر کے درخت کے نیچے کوڑے کا ایک ڈھیر تھا۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ اتنی خوبصورت جگہ پر کوڑے کا ڈھیر کیوں تھا۔ تو صاحب اسے تو ہونا ہی چاہئیے تھا۔ ورنہ یہ جگہ خوبصورت کیوں کر ہوتی۔ بدصورتی ہی تو خوبصورتی کا پیمانہ ہے۔ خیر تو وہ ڈھیر تھا جہاں یوں تو دن بھر آزاد کتے، پالتو سؤر، اور چیتھڑوں میں لپٹے کالے کلوٹے فاقہ زدہ چھوکرے جن کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ پالتو تھے یا آزاد، اسے کریدتے رہتے اور آپس میں جھگڑتے رہتے۔ مگر صبح کے وقت جب سیٹھوں اور افسروں کے گھروں میں بریک فاسٹ ختم ہو جاتا اور ان کے ڈائننگ ٹیبل کے بچے کھچے ڈبل روٹی کے ٹکڑے، مکھن کے ریپر اور پھلوں کے چھلکے پھینکے جاتے تو وہاں کا منظر کچھ اور ہوتا۔

اس کھڑکی سے میں نے وہ منظر بارہا دیکھا ہے۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ

دوپہر کے اخبار کے لیے میرے پاس کوئی میٹیریل نہ تھا۔ کھڑکی کے پاس کھڑا کوئی مضمون تلاش کر رہا تھا کہ پوپوں کی آواز میری نظروں کو کوڑے کے ڈھیر پر لے گئی۔ وہاں دو کمسن لڑکے کھڑے تھے ان میں ایک جو قدرے بڑا تھا، ہاتھ میں ڈنڈا لیے تھا۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کتا اگلی ایک ٹانگ جھلاتا ہوا بے تحاشہ چیخ رہا تھا اور پاس ہی کھڑی ایک سؤر انہیں قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت سیٹھ جمنا داس کے بنگلے سے ایک نوکر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔ وہ ہاف پینٹ اور بوشرٹ پہنے ہوئے تھا اور بھچک بھچک کر چل رہا تھا۔ جیسے چل نہ رہا ہو پھدک رہا ہو۔ اسے دیکھتے ہی چھوکرے تالی بجانے لگے، سؤر دائرے میں گھومنے لگی، اور کتے نے چیخنا بند کر دیا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ جیوں کی تیوں لٹکی رہی۔

نوکر نے سڑک پار کیا اور ایک ٹانگ اٹھا کر بنڈل کو کوڑے کے ڈھیر پر اچھال دیا۔ بنڈل کا گرنا تھا کہ وہاں موجود انسان اور حیوان ایک ساتھ جھپٹے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس عجیب و غریب

جنگ میں اوّلاً سور فاتح رہی اور وہ پورا بنڈل منہ میں دبا کر بھاگنے ہی والی تھی کہ دونوں لڑکوں نے اسے دبوچ لیا اور بنڈل چھین کر رفو چکر ہو گئے۔ غم و غصّہ سے سوّر اپنا تھوتھن زمین پر رگڑنے لگی اور کتا اپنی ٹوٹی ٹانگ جھلاتے ہوئے پھر رونے لگا۔

مجھے مضمون مل گیا تھا۔ کیوں نہ ایک رپورٹ اس گندگی پر لکھ کر کارپوریشن کے منہ پر دے ماروں۔ میں نے سوچا اور پھر وہی کیا۔

اس روز رات میں جب کمرے پر واپس آیا تو نوکر نے اطلاع دی کہ شام کے وقت کارپوریشن کی کوڑا گاڑی آئی تھی اور ساری غلاظت اٹھا کر لے گئی۔ بڑی دیر تک لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوتا رہا کہ کوڑا گاڑی روز صبح و شام آیا کرے گی اور لوگ اس میں اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ ڈالیں گے اگر کسی کو اِدھر اُدھر گندگی پھیلاتے ہوئے دیکھا جائے گا تو امر جنسی قانون کے تحت سخت سزا دی جائے گی۔

میں اپنی کامیابی پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

گو یہ بات الگ ہے کہ میں اس کے بعد کبھی مسکرا بھی نہ سکا۔

دوسری صبح ٹیلیفون ایکسچینج کا ۹ بجے والا سائرن ابھی نہیں ہوا تھا میں نے چائے پی کر سگریٹ جلائی تھی اور کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر ہلکا ہلکا کش لے رہا تھا۔

اِسی جگہ جہاں ہم لوگ اِس وقت کھڑے ہیں۔

اتنے میں کوڑا گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی آئی اور اسی گل مہر درخت کے نیچے جہاں اب تک وہ غلیظ انبار تھا، کھڑی ہو گئی۔ آس پاس کے گھروں کے نوکر چاکر کوڑا کرکٹ لئے ہوئے نکلے اور گاڑی میں ڈالنے لگے۔ سیٹھ جمنا داس کا لنگڑا نوکر جب آیا تو وہی دونوں لڑکے درخت کی اوٹ سے تیر کی طرح برآمد ہوئے مگر جب نوکر نے جوٹھن زمین پر ڈالنے کے بجائے گاڑی میں اچھال دیا تو ان کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔

چند منٹوں بعد گاڑی چلی اُن لڑکوں نے چور نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب انہیں اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ کوئی خطرہ نہیں تو وہ گاڑی کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر